سفر در سفر

مفتی محمد تقی عثمانی

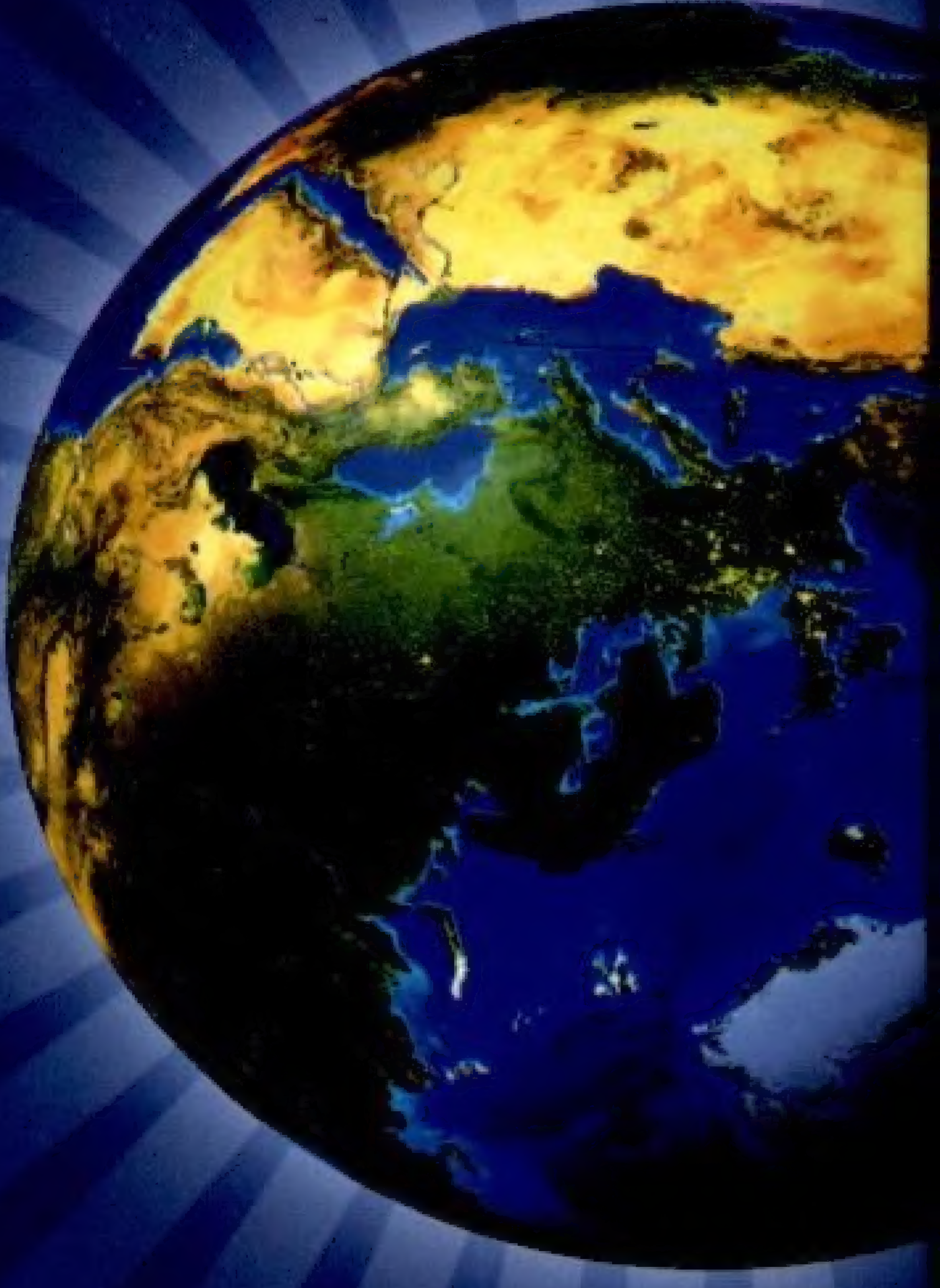

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴
(Quranic Studies Publishers)

سفر
در
سفر

سفر در سفر

مفتی محمد تقی عثمانی

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴
(Quranic Studies Publishers)

جملہ حقوقِ طباعت بحق مکتبہ معارف القرآن کراچی محفوظ ہیں

باہتمام : خضر اشفاق قاسمی
طبع جدید : محرم الحرام ۱۴۳۳ھ - دسمبر ۲۰۱۱ء
مطبع : خواجہ پرنٹرز، کراچی
ناشر : مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)
فون : 92-21-35031565, 35123130
ای میل : info@quranicpublishers.com
mm.q@live.com
ویب سائٹ : www.ONLINESHARIAH.com
آن لائن خریداری کے لئے تشریف لائیں۔

ملنے کے پتے

- مکتبہ دار العلوم، کراچی
- ادارۃ المعارف، کراچی
- دار الاشاعت، کراچی
- بیت القرآن، کراچی
- بیت الکتب، کراچی
- مکتبۃ القرآن، کراچی
- ادارہ اسلامیات، کراچی/ لاہور
- بیت العلوم، لاہور
- مکتبہ رحمانیہ، لاہور
- مکتبہ سید احمد شہید، لاہور
- مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ
- کتب خانہ رشیدیہ، راولپنڈی
- مکتبہ اصلاح وتبلیغ، حیدر آباد
- ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان

مجھ کو کسی سے کام کیا؟ میرا کہیں قیام کیا؟
میرا سفر ہے در وطن، میرا وطن ہے در سفر

جگرؔ

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله رب العالمين، والصلوة والسلام على رسوله الكريم وعلى آله واصحابه اجمعين.

پیش لفظ

دنیا کی پوری زندگی ہی درحقیقت ایک سفر ہے، ایسا سفر جس کی انتہا کسی کو معلوم نہیں۔ پھر زندگی کے اس سفر میں جو چھوٹے چھوٹے سفر ہوتے ہیں، انہیں ”سفر در سفر“ ہی کہا جاسکتا ہے۔ اس لئے میں نے اپنے سفرناموں کے اس نئے مجموعے کا نام ”سفر در سفر“ رکھا ہے۔ اس سے پہلے میرے مختلف سفرناموں کے دو مجموعے ”جہانِ دیدہ“ اور ”دنیا مرے آگے“ کے ناموں سے شائع ہوچکے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے انہیں بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اسکے بعد بھی مجھے مختلف ملکوں کے سفرنامے لکھنے کی نوبت آئی جو ماہنامہ ”البلاغ“ میں شائع ہوتے رہے ہیں، اور اب ان کا یہ مجموعہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

مجھے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے چھ کے چھ براعظموں میں کسی نہ کسی کام کے سلسلے میں جانے کے مواقع عطا فرمائے۔ ان میں سے بہت سے ملک ایسے بھی ہیں جن کا سفرنامہ نہیں لکھا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ میں نے سفرنامہ لکھنے کے لئے ایسی جگہوں ہی کا انتخاب کیا جن کا سفرنامہ یا تو تاریخ اسلام کی عظیم شخصیتوں کے تذکرے کا ایک بہانہ بن جائے، یا اس کے ذریعے

قارئین کو کچھ مفید معلومات حاصل ہوسکیں۔ جہاں ان میں سے کوئی قابل ذکر بات ذہن میں نہ آئی، وہاں محض اپنے ذاتی واقعات بیان کرنے کے لئے کوئی سفرنامہ لکھنے کا داعیہ پیدا نہیں ہوا۔ البتہ بعض ملک ایسے بھی ہیں جن کا سفرنامہ میں لکھنا چاہتا تھا، لیکن اپنی مصروفیات کی بناء پر نہیں لکھ سکا، مثلاً ازبکستان کے سفر میں جن تاریخی مقامات پر حاضری ہوئی، ان کا تذکرہ لکھنے کا مجھے شوق تھا، لیکن اس کا موقع نہیں مل سکا۔ اور سب سے بڑی حسرت یہ ہے کہ حجاز مقدس کا سفرنامہ جو ہر دوسرے سفر پر مقدم ہونا چاہئے تھا، میں اُس سے بھی محروم رہا جس کی وجہ میں ''جہانِ دیدہ'' کے شروع میں لکھ چکا ہوں۔

بہر حال! یہ میرے سفرناموں کا تیسرا مجموعہ ہے جس میں شام، ایران، کرغیزستان، تاجکستان، البانیہ، روس، جاپان، نیوزی لینڈ، فیجی آئر لینڈ اور آخر میں ہندوستان کے سفرنامے شامل ہیں۔ امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ یہ مجموعہ بھی شائقین کے لئے دلچسپی اور افادیت سے خالی نہیں ہوگا۔

وما توفیقی الا باللہ العلیّ العظیم ۔

بندہ

محمد تقی عثمانی

جامعہ دارالعلوم کراچی
۶/ذوالحجہ ۱۴۳۱ھ

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر	نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱	**نکلتے سورج...... جزائر فیجی**	۱۵	۲۰	دارالحدیث الاشرفیہ	۹۱
۲	لمباسا میں	۲۰	۲۱	دارالحدیث النوریہ	۹۳
۳	انٹرنیشنل ڈیٹ لائن پر	۲۴	۲۲	مقام ابی الدرداء رضی اللہ عنہ	۹۵
۴	سووا میں	۲۷	۲۳	حافظ ابوالحجاج مزیؒ	۹۶
۵	نادی میں	۳۰	۲۴	علامہ ابن تیمیہؒ	۹۷
۶	مجموعی تاثرات	۳۱	۲۵	حافظ ابن کثیرؒ	۱۰۰
۷	**ایک ہفتہ ایران میں**	۳۵	۲۶	علامہ ابن القیمؒ	۱۰۱
۸	اصفہان کا سفر	۳۷	۲۷	علامہ شامی کے پڑپوتے سے ملاقات	۱۰۲
۹	قُم میں	۴۱	۲۸	علامہ جمال الدین قاسمیؒ کے پوتے سے ملاقات	۱۰۳
۱۰	چابہار میں	۴۳	۲۹	شیخ حسام الدین فرفورؒ	۱۰۴
۱۱	زاہدان میں	۴۵	۳۰	حلَب کا سفر	۱۰۵
۱۲	مشہد میں	۵۲	۳۱	حمص میں	۱۰۶
۱۳	نیشاپور میں	۵۶	۳۲	حُماۃ میں	۱۰۹
۱۴	واپس تہران اور رے میں	۶۵	۳۳	معرہ اور دیر سمعان	۱۱۰
۱۵	**نیوزی لینڈ کا ایک سفر**	۷۱	۳۴	حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے مزار پر	۱۱۱
۱۶	ویلنگٹن تک کا سفر	۷۹	۳۵	حلب میں	۱۱۴
۱۷	ویلنگٹن میں	۸۲	۳۶	موئے مبارک	۱۱۷
۱۸	**شام کا دوسرا سفر**	۸۹	۳۷	موئے مبارک کی زیارت کی شرعی حیثیت	۱۱۸
۱۹	جامع اُموی اور اس کے نواح میں	۹۰	۳۸	حلب کے قدیم محلے	۱۲۲

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۳۹	علامہ سبط ابن العجمیؒ کی مسجد روی	۱۲۴	۶۰	**دس روز جاپان میں**	۲۰۵
۴۰	مقام الخلیل	۱۲۸	۶۱	فیوجی کے کوہستان میں	۲۱۱
۴۱	علامہ علاؤ الدین کاسانیؒ	۱۲۸	۶۲	تویاما میں	۲۱۵
۴۲	**کرغیزستان کا سفر**	۱۳۳	۶۳	ہیروشیما میں	۲۱۷
۴۳	شہر اوش میں	۱۴۲	۶۴	کوبے کا سفر	۲۲۴
۴۴	**البانیہ میں چند دن**	۱۴۹	۶۵	یوکوہاما میں	۲۲۵
۴۵	ترانا	۱۵۴	۶۶	**لاطینی امریکہ کا ایک سفر**	۲۳۱
۴۶	شکودرا	۱۵۶	۶۷	برازیل کے شہر ساؤ پالو میں	۲۳۴
۴۷	دروس اور کوایا	۱۵۸	۶۸	ریوڈی جنیرو میں	۲۴۲
۴۸	بیلیش اور اس کا مدرسہ	۱۵۸	۶۹	پانامہ میں	۲۴۷
۴۹	البسان	۱۶۰	۷۰	پانامہ کینال	۲۵۲
۵۰	پوگرادیس اور کورچے	۱۶۰	۷۱	ٹرینیڈاڈ میں	۲۵۸
۵۱	**نو دن روس میں**	۱۶۵	۷۲	اسلام قبول کرنے والے	۲۵۹
۵۲	داغستان میں	۱۶۸	۷۳	دارالعلوم ٹرینیڈاڈ	۲۶۱
۵۳	دربند کا سفر	۱۷۳	۷۴	صدر ٹرینیڈاڈ سے ملاقات	۲۶۲
۵۴	سدِ ذوالقرنین	۱۷۴	۷۵	بار بے ڈوس میں	۲۶۷
۵۵	کوہِ قاف پر ایک رات	۱۷۷	۷۶	**تاجکستان کا سفر**	۲۷۱
۵۶	تاتارستان کا سفر	۱۸۴	۷۷	تاجکستان کا تعارف	۲۷۲
۵۷	قازان میں	۱۸۶	۷۸	دوشنبے تک کا سفر	۲۷۴
۵۸	دوبارہ ماسکو میں	۱۹۳	۷۹	امام اعظمؒ کانفرنس	۲۸۰
۵۹	مجموعی تاثرات	۱۹۸	۸۰	دوشنبے شہر	۲۸۲

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر	نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۸۱	دریائے ورزوب	۲۸۳	۹۴	اطراف کے علماء سے ملاقاتیں	۳۲۵
۸۲	شیخ یعقوب چرخیؒ کی مسجد میں	۲۸۵	۹۵	استقبالی جلسہ	۳۲۷
۸۳	بشلیک میں	۲۸۸	۹۶	دارالعلوم (وقف) میں	۳۳۰
۸۴	قاضی خانؒ کے شہر میں	۲۹۱	۹۷	دارالعلوم دیوبند (قدیم) میں	۳۳۳
۸۵	امام سرخسیؒ کے محلے میں	۲۹۳	۹۸	دیوبند سے دہلی تک	۳۳۸
۸۶	امام سرخسیؒ اور کنویں میں مبسوط کی تالیف	۲۹۴	۹۹	تامل ناڈو میں	۳۳۹
۸۷	**ہندوستان کا تازہ سفر**	۳۰۹	۱۰۰	کرناٹک میں	۳۴۶
۸۸	بمبئی میں	۳۱۱	۱۰۱	سلطان ٹیپو کے شہر میں	۳۴۶
۸۹	مدراس میں	۳۱۳	۱۰۲	بنگلور میں	۳۵۲
۹۰	دیوبند کا یادگار سفر	۳۱۵	۱۰۳	تاثرات	۳۵۷
۹۱	دیوبند میں	۳۱۹	۱۰۴	**اردن کا سفر**	۳۶۵
۹۲	آدینی مسجد میں	۳۲۱	۱۰۵	وہ درخت	۳۶۶
۹۳	اس گھر میں جو کبھی ہمارا تھا	۳۲۳	۱۰۶	دوسری دریافت: ہرقل کے نام مکتوب نبویﷺ	۳۷۳

* * *

نکلتے سورج کا ملک
جزائر فیجی کا ایک سفر

جنوری 2005ء

ذوالحجہ ۱۴۲۵ھ

نکلتے سورج کا ملک
جزائر فیجی کا ایک سفر

(جنوری 2005ء / ذوالحجہ ۱۴۲۵ھ)

حمد وستائش اس ذات کیلئے ہے جس نے اس کارخانۂ عالم کو وجود بخشا

اور

درود وسلام اس کے آخری پیغمبر ﷺ پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

دنیا کے نقشے پر نظر ڈالیں تو جنوبی بحرالکاہل کے انتہائی مشرقی خط پر نیوزی لینڈ سے قدرے شمال کی جانب ایک چھوٹا سا نقطہ فیجی نظر آتا ہے، یہ دنیا کا وہ واحد آباد علاقہ ہے جو انٹرنیشنل ڈیٹ لائن پر واقع ہے، اور جہاں ہر روز دنیا میں سب سے پہلے سورج طلوع ہوتا ہے، تین سو سے زائد چھوٹے بڑے جزیروں پر مشتمل اس خوبصورت ملک کی یہ خصوصیت میں انشاءاللہ آگے تفصیل سے ذکر کروں گا، تقریباً آٹھ لاکھ آبادی کے اس ملک میں تقریباً ساٹھ ہزار مسلمان بھی بستے ہیں۔ پچھلے سال جب میں دوسری بار آسٹریلیا گیا تو یہاں کے مسلمانوں نے مجھے فیجی آنے کی بھی دعوت دی، لیکن بوجوہ میں اُس وقت یہ سفر نہ کرسکا۔

تقریباً چھ ماہ قبل مجھے اس ملک کے شہر لمباسا سے مولانا غفران صاحب نے بڑا اثر انگیز خط لکھا جس میں انہوں نے اس دورافتادہ ملک کے حالات ذکر کرکے یہ بتایا کہ انہوں نے کن مشکل حالات میں یہاں ایک باقاعدہ دینی درسگاہ کی بنیاد ڈالی، جو بفضلہ تعالیٰ ترقی کے مراحل طے کرتی ہوئی اب ایسے مقام پر پہنچی ہے کہ وہاں شوال ۱۴۲۵ھ کے تعلیمی سال

سے دورۂ حدیث کی تعلیم کا آغاز کرنے کا ارادہ کرلیا گیا ہے اور یہاں کے اساتذہ طلبہ اور منتظمین کی متفقہ خواہش ہے کہ دورۂ حدیث کا آغاز آپ سے کرایا جائے۔ مجھے اس بات کا پورا احساس تھا کہ جنوبی بحرالکاہل کے ممالک میں ضرورت کے باوجود کہیں بھی کوئی باضابطہ دینی درسگاہ موجود نہیں ہے، اور اس علاقے میں صاحب استعداد علماء کی انتہائی قلت ہے، اور ان ممالک میں کسی بھی جگہ ایسی درسگاہ کا وجود میں آنا بڑی نعمت ہے، جس کا خیر مقدم کرنا چاہئے۔ چنانچہ میں نے ان کی دعوت قبول کرلی، اور اپنی مصروفیات کی وجہ سے سفر کی تاریخوں میں ردوبدل ہوتے ہوئے بالآخر میں ۶ اور ۷ جنوری ۲۰۰۵ء کی درمیانی رات میں ایک بجے اس طویل سفر کیلئے کیتھے پیسفک (Cathay Pacific) ایئر لائنز کے ذریعے روانہ ہوا۔ میں نے اب تک بڑے لمبے لمبے سفر کئے ہیں، لیکن اپنے تسلسل کے اعتبار سے یہ میرا طویل ترین فضائی سفر تھا۔ رات ایک بجے روانہ ہوکر صبح چھ بجے کے قریب جہاز بنکاک پہنچا اور وہاں سے روانہ ہوکر ساڑھے بارہ بجے ہانگ کانگ کے ایئرپورٹ پر اُترا، وہاں سے دو گھنٹے کے انتظار کے بعد اسی ایئر لائنز کے ایک دوسرے جہاز میں سوار ہوکر شام ساڑھے چھ بجے جنوبی کوریا کے دارالحکومت سیئول کے ہوائی اڈے پر اُترا۔ یہ ایک وسیع و عریض اور تمام جدید سہولیات سے آراستہ نہایت خوبصورت ایئرپورٹ تھا جہاں سردی نقطہ انجماد تک پہنچی ہوئی تھی، یہاں بھی دو گھنٹے انتظار کے دوران ہم نے پہلے مغرب اور پھر عشاء کی نمازیں ادا کیں، اور یہاں سے کورین ایئر لائنز کے طیارے میں سوار ہوئے۔ یہ دس گھنٹے پر مشتمل اس سفر کی طویل ترین پرواز تھی جس میں جہاز رات بھر بحرالکاہل پر پرواز کرتا رہا، اور صبح نو بجے فیجی کے بین الاقوامی ایئرپورٹ نادی پر اُترا۔ فیجی چونکہ خط استوا کے جنوب میں واقع ہے، اس لئے یہاں دسمبر اور جنوری سخت گرمی کے مہینے ہیں۔ سیئول تک سخت سردی تھی، اور یہاں اُترتے ہی شدید گرمی کا احساس ہوا۔

ہوائی اڈے پر مولانا غفران صاحب اور ان کے رفقاء استقبال کیلئے موجود تھے، ہمیں مسلسل سفر کرتے ہوئے پچیس گھنٹے سے زیادہ ہوچکے تھے۔ مگر ابھی سفر جاری تھا، کیونکہ

جزائر فیجی کا خوبصورت منظر

جزائرِ فیجی کا خوبصورت ساحلی منظر

ہماری منزل فیجی کا ایک دوسرا شہر لمباسا تھی۔ یہ جمعہ کا دن تھا، اور لمباسا کیلئے روانگی جمعہ کے بعد ہونی تھی۔ اس دوران ہمارے نہایت عزیز دوست آصف صاحب کے مکان پر قیام رہا۔ آصف صاحب پاکستانی ہیں اور تین سال سے فیجی میں کاروں کی تجارت سے وابستہ ہیں، اور اپنے دینی جذبے کی وجہ سے یہاں کے دینی حلقوں میں بڑے ہر دلعزیز ہیں، اس پورے سفر میں انہوں نے بڑی دقیقہ رسی سے ہماری راحت رسانی کا خیال رکھا، اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ جمعہ کے فوراً بعد ہم دوبارہ ایئر پورٹ پہنچے، اور سوا دو بجے فیجی ایئر کے ایک چھوٹے سے طیارے میں آدھے گھنٹے کی پرواز کے بعد فیجی کے دارالحکومت سووا کے ایئر پورٹ پر اُترے، یہاں ہمیں مزید دو گھنٹے لمباسا لے جانے والے طیارے کا انتظار کرنا تھا، دو راتوں کی بے خوابی اور طویل سفر کی بناء پر یہ دو گھنٹے کا انتظار تقریباً ناقابل برداشت معلوم ہو رہا تھا، آصف صاحب نے یہ انتظام کیا کہ اپنے سووا کے آفس سے ایک ایئر کنڈیشنڈ کار منگوا کر پارکنگ میں کھڑی کر دی، اور اس کی سیٹ پر مجھے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے سونے کا موقع مل گیا، اور جب جہاز میں سوار ہونے کا وقت آیا تو طبیعت نسبتاً تازہ ہو چکی تھی۔ اب آگے بڑھنے سے پہلے فیجی کا مختصر تعارف کرا دینا مناسب ہے:

یوں تو فیجی تین سو چھتیس چھوٹے بڑے جزیروں پر مشتمل ملک ہے، لیکن ان میں سے اکثر جزیرے، بہت چھوٹے اور غیر آباد ہیں، البتہ دو جزیرے زیادہ بڑے ہیں، اور ملک کے اکثر بڑے شہر انہی جزیروں میں واقع ہیں۔ سب سے بڑا جزیرہ ویتی (Viti) ہے۔ اسی میں ملک کا دارالحکومت سووا (Suva) واقع ہے اور اسی کا دوسرا بڑا شہر نادی ہے جو لکھا تو نادی (Nadi) جاتا ہے، مگر یہاں کے لوگ اس کا تلفظ ''نینڈی'' کرتے ہیں، نادی میں بڑا بین الاقوامی ایئر پورٹ ہے، اس لئے دنیا بھر سے آنے والے اکثر نادی میں آ کر اُترتے ہیں، جو دارالحکومت سووا سے 190 کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

دوسرا بڑا جزیرہ وینوا (Vanua) ہے۔ اس جزیرے کا سب سے بڑا شہر لمباسا ہے، اور اسی میں فیجی کا سیاحتی شہر سابوسابو واقع ہے۔ فیجی کے جزائر میں جو قوم نامعلوم تاریخ کے

وقت سے آباد ہے، وہ کاوِیتی کہلاتی ہے، مشہور یہ ہے کہ یہ لوگ افریقہ کے ملک ٹانگانیکا (موجودہ کینیا) سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے، بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ انڈونیشیا سے یہاں پہنچے تھے، اور واقعہ یہ ہے کہ ان کے خدوخال میں افریقہ اور جنوبی ایشیاء دونوں کی آمیزش معلوم ہوتی ہے۔ انگریزوں کا کہنا ہے کہ یہ وحشی اور آدم خور قبائل تھے، اٹھارہویں صدی میں انگریز یہاں پہنچے اور انہوں نے ان جزائر کو فتح کرکے انہیں اپنی کالونی بنالیا۔

کاوِیتی قوم کی بہت سے عادتیں ایسی ہیں جن کی بنا پر شبہ ہوتا ہے کہ شاید ان کے آباؤ اجداد کبھی مسلمان رہے ہوں، یہ لوگ زمین پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھاتے ہیں، ان کے لباس کی خصوصیت یہ ہے ان کا زیر جامہ آدھی پنڈلی تک ہوتا ہے، شروع میں یہ تہبند پہنتے تھے، اب مرد بھی اسکرٹ قسم کا ایک لباس پہنتے ہیں، مگر وہ آدھی پنڈلی تک ہوتا ہے، اس کے علاوہ یہ بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ کوئی شخص ان سے کچھ مانگ لے تو انکار کرنے کو عیب سمجھتے ہیں، غرض متعدد خصوصیات کی بناء پر یہاں کے مسلمانوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ یہ لوگ ابتداء میں مسلمان رہے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب.

اس ملک کی آبادی 1996ء کی مردم شماری کے مطابق 772655 تھی جواب یقیناً آٹھ لاکھ سے بڑھ گئی ہوگی، اِس وقت آبادی کا 47.6 فیصد حصہ ہندوستانی نژاد لوگوں کا ہے جن میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہے اور تقریباً ساٹھ ہزار افراد مسلمان ہیں۔ یہ ہندوستانی نژاد افراد ابتداء میں جس طرح یہاں لائے گئے، وہ انگریزی استعمار کی بربریت کی ایک گھناؤنی مثال ہے، جب انگریزی سامراج نے اس علاقے پر اپنی حکومت قائم کی تو اس نے محسوس کیا کہ یہ علاقہ ناریل اور گنے کی کاشت کیلئے بہت موزوں ہے، لیکن مقامی آبادی کو اس قسم کی کاشت کا تجربہ نہیں تھا، اس لئے اُس وقت کے انگریز گورنر کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ ہندوستان سے (جو اس وقت انگریز ہی کی کالونی تھی) تجربہ کار کاشتکار یہاں لائے جائیں، چنانچہ غریب ہندوستانیوں کو فیجی بھیجنے کی ایک مہم مدراس، کیرالہ، بنگال اور یوپی میں شروع ہوئی۔ ہندوستانی کاشتکاروں کو یہ دھوکہ دیا گیا کہ ان کو بہتر روزگار فراہم

کرنے کیلئے کلکتہ سے کچھ دور واقع ایک جزیرے میں لے جایا جائے گا جہاں ان سے ہلکا پھلکا کام لے کر انہیں اچھی اُجرت دی جائے گی، ان غریب ہندوستانی افراد نے اس دھوکے میں آ کر ان کے ساتھ جانا منظور کر لیا، یہ انہیں جہاز پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ان کو ہزاروں میل دور لے جایا جا رہا ہے، جہاز پر انہیں انتہائی ابتر حالت میں رکھا گیا، کھانا سمندر کے پانی سے تیار کیا جاتا، چاولوں میں کیڑے ہوتے اور رہائش کی جگہ بہت تنگ، بہت سے افراد سفر کے دوران ہلاک ہو گئے، اور بہت سے مختلف امراض میں مبتلا ہو کر فیجی پہنچے، فیجی میں انہیں جانوروں کے باڑے جیسے کیمپوں میں رکھا جاتا، 10x7 کے ایک کمرے میں جس میں ہوا کا گذر نہیں تھا، کئی کئی افراد کو ایک ساتھ رکھا جاتا، اور صبح 5 بجے سے رات گئے تک ان سے نہایت پُرمشقت کام لیا جاتا۔ اگر کام کے دوران کوئی ستانے کیلئے کچھ دیر ہاتھ روک لیتا تو اس پر انگریز اوورسیرز کوڑے برساتے۔ صرف ان عورتوں کے ساتھ کچھ رعایت برتی جاتی جو ان اوورسیز کی ہوس پوری کرنے کیلئے اپنی عزت و عصمت کی قربانی دینے کو تیار ہوتیں۔ بہت سے ہندوستانی جنہیں فیجی کا انگریز گورنر ''قلی'' کہا کرتا تھا۔ ان مظالم کی تاب نہ لا کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور بہت سوں نے خودکشی کر لی۔ آج فیجی کے جزیروں میں ناریل کے درختوں کے جو لاتعداد جھرمٹ قدم قدم پر نظر آتے ہیں اور جن پر فیجی کی معیشت کا بڑی حد تک دارومدار ہے، وہ انہی بے بس ہندوستانیوں کے خون پسینے سے سیراب ہوئے ہیں۔ جنہوں نے سالہا سال یہاں بدترین غلامی کا دور گزارا ہے۔ ہندوستانیوں کی یہاں آمد اور ان کے عہد غلامی کے یہ حالات تفصیل کے ساتھ فیجی کے ایک مؤرخ کم گریول (Kim Gravelle) نے اپنی کتاب ''فیجی کا ورثہ'' (Fiji's Heritage) میں بیان کئے ہیں۔ جو نادی میں شائع ہوئی ہے۔

بہرکیف! فیجی میں ہندوستانیوں کی آمد کی ابتداء اس طرح ہوئی، جب فیجی کی زمینیں ناریل کے باغات اور گنے کے کھیتوں سے لہلہا اُٹھیں تو یہ ہندوستانی افراد اسی زمین کے ہو رہے، ان کا عہد غلامی ختم ہوا، اور انہوں نے یہاں باعزت روزگار تلاش کر لیا۔ جب یہ

لوگ قدرے خوشحال ہوئے تو ہندوستان سے بہت سے لوگ تجارت اور ملازمت کیلئے بھی یہاں آ کر آباد ہوگئے، اور اس طرح یہاں کی آبادی کا چھیالیس فیصد سے زائد حصہ انہی ہندوستانیوں پر مشتمل ہے۔ ان میں مسلمانوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی جو اس علاقے میں اسلام کے متعارف ہونے کا ذریعہ بن گئی، ابتداء میں جو مسلمان یہاں آئے تھے، وہ نماز روزے اور دوسرے شعائر اسلام کے فی الجملہ پابند تھے انہوں نے یہاں مسجدیں بھی تعمیر کیں، لیکن چونکہ نئی نسلوں کی تعلیم وتربیت کا کوئی انتظام نہ تھا، اور ہندوؤں، عیسائیوں اور سکھوں کے ساتھ میل جول کثرت سے تھا، اس لئے رفتہ رفتہ دین پر عمل کے آثار ماند پڑتے چلے گئے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے تبلیغی جماعت کو یہاں دین کے احیاء کا ذریعہ بنایا۔ پہلی بار زمبیا سے ایک جماعت (غالباً 1967ء میں) یہاں آئی اور اس نے لوگوں میں دین کی طرف لوٹنے کا جذبہ پیدا کیا، اور لوگ اپنے دینی فرائض سے آگاہ ہوئے، مزید مسجدوں کی بنیاد رکھی گئی، مسجدوں میں بچوں کی ابتدائی تعلیم کیلئے مکتب قائم ہوئے، یہاں تک کہ اب بفضلہٖ تعالیٰ ملک کے طول وعرض میں دینی سرگرمیاں اہتمام کے ساتھ جاری ہیں۔

لمباسا میں

شام ساڑھے چار بجے فیجی ایئر کا چھوٹا سا طیارہ ہمیں سووا سے لمباسا لے جانے کیلئے روانہ ہوا۔ فیجی کے جزائر کو اللہ تعالیٰ نے قدرتی مناظر کے حسن سے مالا مال کیا ہے، اوپر سے زمین کو دیکھیں تو وہ سبزہ وگل کے تختوں سے معمور نظر آتی ہے، چند ہی لمحوں میں جہاز جزیرۂ ویتی کو عبور کر کے سمندر میں داخل ہوگیا، بحرالکاہل کا یہ علاقہ چھوٹے چھوٹے سرسبز جزیروں سے بھرا ہوا ہے اور اس کے حسن میں اُن زیر آب سمندری چٹانوں (Reefs) نے چار چاند لگا دیئے ہیں جو رنگ برنگ پتھروں پر مشتمل ہیں، یہ چٹانیں اگرچہ پانی کے اندر ہیں، لیکن سمندر کی عمومی گہرائی سے بہت بلند ہونے کی وجہ سے شفاف پانی کے نیچے نمایاں محسوس ہوتی ہیں، ان چٹانوں میں بہت سے قیمتی پتھر بھی پائے جاتے ہیں جو فیجی کی صنعت وتجارت

کا ایک اہم عنصر ہیں، اور ان کے مختلف رنگ پانی پر بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں، اور خاص طور پر ہوائی جہاز کی نیچی پرواز سے ان کا منظر بڑا حسین معلوم ہوتا ہے۔ تقریباً چالیس منٹ کا یہ فضائی سفر بڑا خوشگوار اور دلچسپ تھا۔ پانچ بجے کے بعد ہم لمباسا کے چھوٹے سے ایئرپورٹ پر اُترے۔ یہ فیجی کے دوسرے بڑے جزیرے وینوا (Vanua) کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اسے انگریزی میں Labasa لکھا جاتا ہے، مگر تلفظ لمباسا کیا جاتا ہے، اور ہندوستانی حضرات کہتے ہیں کہ یہ شہر واقعتاً لمبا سا ہے، یعنی اس کا طول عرض کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ سرسبز پہاڑیوں سے گھرا ہوا یہ شہر بنگلہ دیش کے سلہٹ اور چاٹگام سے ملتا جلتا ہے۔ اگرچہ آبادی وہاں کے مقابلے میں بہت کم ہونے کی بناء پر صاف ستھرا اور کشادہ ہے، اسی شہر میں وہ مدرسہ عربیہ اسلامیہ واقعہ ہے جس میں دورۂ حدیث کے افتتاح کیلئے مجھے دعوت دی گئی تھی، یہ مدرسہ شہر کی خوبصورت مرکزی مسجد کے احاطے میں واقع ہے، یہاں لمباسا مسلم لیگ کے زیر اہتمام مکتب تو پہلے سے چلا آتا تھا۔ چند سال پہلے بنگلہ دیش کے مولانا غفران صاحب کو دعوت دی گئی جو جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے فارغ التحصیل عالم ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان سے ایک باقاعدہ مدرسے کی بنیاد رکھنے کی خدمت انجام دلوائی، انہوں نے ہی بنگلہ دیش سے مولانا جعفر صاحب اور مولانا قمر الزماں صاحب کو بلوا کر یہاں اسلامی علوم کی معیاری تعلیم کا انتظام کیا۔ ماشاء اللہ یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ یہ تینوں علماء قوی الاستعداد اور صاحب لیاقت مدرسین ہیں۔ جنہوں نے نہایت مشکل حالات میں بچوں پر محنت کر کے انہیں معیاری دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کی قابل ستائش خدمت انجام دی ہے، میں نے طلبہ کا جائزہ لیا تو ان اساتذہ کی محنت کا اندازہ ہوا، ان حضرات کو شب و روز طلبہ کی تعلیم و تربیت میں اساتذہ کی کمی کی وجہ سے منہمک رہنا پڑتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی محنت کا یہ صلہ دیا کہ مدرسہ سے حفاظ کی ایک بڑی تعداد تیار ہو چکی ہے، اور عربی و اسلامی علوم کے طلبہ کی ایک جماعت دورۂ حدیث کیلئے تیار ہے۔

8 جنوری کو عصر کے بعد سے عشاء تک افتتاح دورۂ حدیث کے جلسے کا اعلان ہو چکا تھا۔

علاقے کے مسلمان جوق در جوق اس اجتماع میں شرکت کیلئے دور دور سے آئے۔ عصر سے مغرب تک مدرسے میں طلبا کی کارگذاریوں کا دلچسپ مظاہرہ حاضرین کے سامنے پیش کیا گیا، اور مغرب کے بعد دورۂ حدیث بلکہ ہر درجے کی ایک ایک کتاب کا افتتاح بندہ کے سامنے عبارتیں پڑھنے سے کیا گیا۔ تمام طلبہ نے عبارتیں درست پڑھیں، پھر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں نے اپنی گزارشات پیش کیں، جو حاضرین نے توجہ سے سنیں۔ بعد میں یہاں کے لوگوں نے بتایا کہ لمباسا میں شاید اتنا بڑا مسلمانوں کا اجتماع اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ حاضری میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد بھی شامل تھے، اور ان میں سے بعض نے اپنے اس تاثر کا اظہار کیا کہ ان کے ذہن میں عرصہ سے جو سوالات وشبہات گردش کرتے تھے آج کے بیان سے بفضلہ تعالیٰ ان میں سے بہت سوں کا جواب مل گیا۔

بحر الکاہل کے اس علاقے میں (آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سمیت) چونکہ دینی علوم کی کوئی مکمل درسگاہ موجود نہیں ہے، اس لئے اس مدرسے میں دورۂ حدیث کی تعلیم کا آغاز یقیناً ایک تاریخی واقعہ ہے جس سے علاقے کے مسلمانوں کو انشاء اللہ بہت فائدہ پہنچنے کی توقع ہے، اللہ تعالیٰ اس مدرسے کو مزید ترقی عطا فرمائیں اور یہاں سے دین کے سچے خادم پیدا فرمائیں جو علاقے کی دینی ضروریات پوری کرسکیں۔ آمین

اتوار 9 جنوری کا دن بھی لمباسا ہی میں گذرا جس میں خواتین کے ایک بڑے اجتماع سے بھی خطاب ہوا، اور مدرسہ کے اساتذہ وطلبہ کی ایک خصوصی نشست سے بھی، نیز مدرسہ کے نصاب ونظام کے بارے میں مشورہ ہوا۔

دوشنبہ (پیر) 10 جنوری کا پروگرام ہمارے میزبانوں نے اس طرح ترتیب دیا تھا کہ اس میں فیجی کے مختلف شہروں میں وعظ کی مجلسیں بھی ہوجائیں، اور ان کے قابل دید سیاحتی مقامات کی سیر بھی ہوسکے جن میں انٹرنیشنل ڈیٹ لائن بھی داخل تھی۔ چنانچہ ہم فجر کے متصل بعد سڑک کے راستے جزیرۂ وینوا کے ایک اور شہر سابوسابو (Savusavu) کیلئے روانہ ہوئے جو لمباسا سے جنوب مشرق میں تقریباً نوے کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، یہ پورا

راستہ انتہائی سرسبز و شاداب حسین پہاڑوں پر سے اُترتا چڑھتا گذرتا ہے، جہاں حدِ نظر تک سبزہ وگل سے لدے ہوئے جنگلات پھیلے ہوئے ہیں، یہاں آم کے درخت خودرو ہیں، جنوری کا مہینہ یہاں گرمی کا ہے، اس لئے یہ خودرو درخت آموں سے لدے ہوئے تھے، ناریل اور دیودار کے درختوں نے پہاڑوں پر زینہ سا بنایا ہوا تھا، اور پہاڑوں کی درمیانی وادیاں انواع واقسام کے پھلوں اور پھولوں سے لبریز تھیں۔ یہاں کا موسم بھی نسبتاً خنک تھا، اور ہلکی ہلکی بارش نے ماحول کے حسن میں مزید اضافہ کردیا تھا، اس طرح تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کے خوبصورت اور خوشگوار سفر کے بعد ہم جزیرے کے ساحلی شہر سابوسابو پہنچ گئے۔ یہ بحرالکاہل کے کنارے ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ جس کے دو طرف شاداب پہاڑ اور دو طرف سمندری خلیجیں واقع ہیں، اور چھوٹی سی بندرگاہ بھی ہے، مناظرِ قدرت کے حسن کی وجہ سے یہ فیجی میں سیاحوں کی دلچسپی کا خاص مرکز ہے۔ یہاں مسلمان بھی اچھی خاصی تعداد میں آباد ہیں، اور ایک مسجد بھی ہے جس میں آج عصر کے بعد میری تقریر کا اعلان تھا۔ لیکن صبح کے وقت ہمیں یہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعے ایک اور جزیرے تیوونی (Taveuni) جانا تھا جس میں انٹرنیشنل ڈیٹ لائن واقع ہے۔ جہاز کی روانگی میں کچھ دیر تھی، اس لئے لمبا سا لیگ کے صدر جناب عزیز صاحب جو گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے، اس وقفے میں ہمیں سابوسابو کے خوش منظر ساحلی مقامات کی سیر کراتے رہے۔

تقریباً پونے نو بجے ہم ایئرپورٹ پر پہنچے، یہ بہت چھوٹا سا ایئرپورٹ تھا جس میں لاؤنج کی جگہ بس اڈے کی طرح کی بنچیں پڑی ہوئی تھیں، مگر صاف ستھرا ماحول تھا۔ ایک چھوٹا سا طیارہ ہمیں یہاں سے لے کر روانہ ہوا، اور سمندر کی سیر کراتا ہوا صرف پندرہ منٹ میں جزیرۂ تیوونی پہنچ گیا۔ یہاں سے ہم کار کے ذریعے سمندر کے ساتھ ساتھ کافی دور تک چلتے رہے۔ یہاں تک کہ انٹرنیشنل ڈیٹ لائن پر پہنچ گئے۔

انٹرنیشنل ڈیٹ لائن پر

یہ ڈیٹ لائن ٹھیک 180 طول البلد پر واقع ہے اور یہاں دو بورڈ اس طرح لگے ہوئے ہیں کہ ان کے بیچ میں آدھے انچ کا خلا ہے، یہ خلا ہی ڈیٹ لائن ہے، اس ڈیٹ لائن کے بائیں طرف آج اتوار تھا، اور دائیں طرف سنیچر اور بورڈ پر لکھا ہوا تھا کہ آپ اگر اس طرح کھڑے ہوں گے کہ آپ کا دایاں پاؤں دائیں بورڈ کی طرف اور بایاں پاؤں بائیں بورڈ کی طرف ہو تو آپ بیک وقت دو دن میں کھڑے ہوں گے، دایاں پاؤں گذشتہ کل (سنیچر) میں ہوگا اور بایاں پاؤں آج (اتوار) میں۔

جو حضرات اس جغرافیائی حقیقت سے مانوس نہیں ہیں، اُن کو سمجھانے کیلئے عرض ہے کہ یوں تو دنیا کے گول ہونے کی وجہ سے ہر وقت سورج کسی جگہ طلوع اور کسی جگہ غروب ہو رہا ہوتا ہے، اس لئے دنیا کے تمام خطوں میں دن اور تاریخ کا آغاز ایک وقت پر نہیں ہو سکتا، بلکہ ہر خطے میں دن کے شروع ہونے کا وقت الگ ہے، لیکن دنیا میں دنوں، تاریخوں اور اوقات کے یکساں تعین کیلئے بین الاقوامی طور پر یہ انتظام کیا گیا ہے کہ کرۂ زمین کو 360 حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ان میں سے ہر حصہ ایک ڈگری یا درجہ کہلاتا ہے۔ مشرق اور مغرب کے درمیان ان درجوں کے تعین کیلئے پورے کرۂ زمین کے گرد ایک خط کھینچا گیا ہے جو طول البلد کا خط کہلاتا ہے، اس خط کی ابتداء برطانیہ کی رصدگاہ گرین وچ سے ہوتی ہے جو صفر طول البلد پر واقع ہے، یہاں سے مشرق میں 180 درجے تک دنیا کا نصف حصہ پورا ہوتا ہے اور دوسری طرف مغرب میں 180 درجے تک دوسرا نصف حصہ اور اس طرح زمین کے گول ہونے کی وجہ سے 180 طول البلد پر مشرق و مغرب دونوں کے خطوط مل جاتے ہیں۔

چونکہ سورج مشرق سے مغرب کی طرف سفر کرتا ہے، اس لئے دنیا بھر میں اوقات کا تعین اس طرح کیا جاتا ہے کہ گرین وچ (صفر طول البلد) پر جو وقت ہوتا ہے، مشرق میں طول البلد کے ہر پندرہ درجے پر وقت اُس سے ایک گھنٹہ کم ہو جاتا ہے اور مغرب میں ہر

پندرہ درجے پر ایک گھنٹہ بڑھ جاتا ہے، مثلاً گرین وچ پر اگر رات کے بارہ بجے ہوں تو مشرق میں 15 درجہ طول البلد پر گیارہ بجے ہوں گے اور مغرب میں 15 درجہ طول البلد پر ایک بجا ہوگا، اس طرح مشرق میں 180 درجے پر پہنچتے پہنچتے گرین وچ ٹائم سے بارہ گھنٹے کم ہو جائیں گے اور مغرب میں 180 درجے تک پہنچتے پہنچتے بارہ گھنٹے بڑھ جائیں گے اور چونکہ زمین گول ہے، اس لئے دونوں طرف سے 180 درجے ایک مقام پر جا کر مل جاتے ہیں اور مشرق کے آخری نقطے اور مغرب کے آخری نقطے پر وقت کا فرق پورے چوبیس گھنٹے کا ہو جاتا ہے، یعنی دن بدل جاتا ہے، ہم جس مقام پر کھڑے تھے وہ ٹھیک 180 درجے طول البلد کا خط تھا، جہاں مشرق اور مغرب دونوں طرف کے طول البلد کے خطوط آ کر مل رہے تھے، اور مشرق کے 180 درجے اور مغرب کے 180 درجے کے درمیان چوبیس گھنٹے کا فرق ہو چکا تھا، لہٰذا مشرق کی طرف ایک دن کم تھا اور مغرب کی طرف ایک دن زیادہ۔ یہ خط جو مشرق و مغرب کے خطوں کو الگ کرتا ہے، انٹرنیشنل ڈیٹ لائن کہلاتا ہے۔ یہ ڈیٹ لائن زیادہ تر سمندر پر گزرتی ہے یا پھر سائبیریا اور انٹارکٹیکا کے علاقوں سے جو عموماً غیر آباد ہیں۔ آباد علاقوں میں فیجی واحد ملک ہے جس کے تین جزیروں پر سے ڈیٹ لائن گزرتی ہے اور تیوونی نامی جزیرے کو یہ خصوصی امتیاز حاصل ہے کہ جس نقطے پر ہم کھڑے تھے وہ ٹھیک 180 طول البلد پر واقع ہے، جس کے ایک طرف سنیچر تھا اور دوسری طرف اتوار، اس لئے یہ کہنا درست ہے کہ دنیا میں ہر روز نئی تاریخ کی ابتداء اس جگہ سے ہوتی ہے، اور ہر دن کا نیا سورج سب سے پہلے یہاں طلوع ہوتا ہے، اس حیثیت سے یہ جگہ "مطلع الشمس" یا نکلتے سورج کی سرزمین ہے۔ میں گرین وچ میں صفر طول البلد کے نقطے پر پہلے جا چکا ہوں، آج 180 طول البلد پر پہنچ کر دنیا کے طول البلد کے دونوں سروں پر حاضری مکمل ہوگئی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین کے ان سروں کو بندے کے گناہوں کی پردہ پوشی فرما کر ایمان وطاعت اور توبہ واستغفار کے گواہ بنا دے۔ آمین

یہاں سے چند کلومیٹر مغرب میں جزیرے کے تقریباً آخری کنارے پر مسلمانوں نے

ایک مسجد بنائی ہوئی ہے جہاں اس وقت میری تقریر کا اعلان ہو چکا تھا، یہ مسجد ڈیٹ لائن کے مغرب میں واقع پہلی مسجد ہے اور اس کے منتظمین نے بجا طور پر یہ تبصرہ کیا کہ آپ ایک ایسی مسجد میں تقریر کرنے جا رہے ہیں جہاں ہر روز ساری دنیا میں سب سے پہلے فجر کی اذان بلند ہوتی ہے اور یہ بات واقعتاً درست تھی، اس مسجد کو حقیقتاً یہ فخر حاصل ہے۔

مسجد میں مردوں اور خواتین دونوں کا اچھا خاصا اجتماع تھا، البتہ خواتین کی تعداد زیادہ تھی، جن کیلئے پردے کے ساتھ بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہاں تقریباً ایک گھنٹہ میری تقریر ہوئی۔ ظہر کی نماز اسی مسجد میں ادا کرنے کے بعد ہم واپس ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہوئے اور ساڑھے تین بجے دوبارہ جہاز میں سوار ہو کر چار بجے کے قریب سابوسابو پہنچ گئے۔ یہاں کی ایک مسجد میں عصر سے مغرب تک میرا بیان ہوا، جس میں مردوں اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد شریک ہوئی۔ سابوسابو کی ایک قابل دید چیز یہاں اُبلتے ہوئے پانی کے قدرتی چشمے ہیں۔ گرم پانی کے چشمے تو بہت سے مقامات پر ہم دیکھتے آئے ہیں، عموماً یہ گندھک کے چشمے ہوتے ہیں، کراچی میں بھی منگھو پیر کے علاقے میں ایسا چشمہ موجود ہے، لیکن سابوسابو کے یہ چشمے ان سے مختلف ہیں۔ ان سے جو پانی نکل رہا ہے وہ نہایت شفاف ہے اور ایسا اُبلتا ہوا گرم پانی ہے کہ اس کو ہاتھ لگانا ممکن نہیں۔ یہ چشمے سمندر سے صرف چند گز کے فاصلے پر ایک پہاڑی کے دامن میں واقع ہیں اور اتنے سخت گرم ہیں کہ ان کے اوپر سے ہر وقت بھاپ اُڑتی ہوئی نظر آتی ہے، مقامی لوگ اس پانی میں انڈے، مچھلیاں اور گوشت اُبال لیتے ہیں۔ ہمارے رفقاء میں سے ایک صاحب ایک درجن انڈوں کی ایک تھیلی لے آئے اور وہ تھیلی انہوں نے جوں کی توں ایک چشمے کے اوپر رکھ دی، پانچ منٹ بعد انہوں نے وہ تھیلی نکالی تو تمام انڈے اُبل کر تیار ہو چکے تھے جو انہوں نے رفقاء میں تقسیم کیے۔

سمندر کے بالکل قریب اتنے تیز گرم پانی کا زمین سے نکلنا اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک عظیم مظہر ہے اور اس کی سائنسی توجیہ یہ کی جاتی ہے کہ درحقیقت قریبی پہاڑ ہلکے درجے کے لاوے پر مشتمل ہے جو پھوٹنے کی صلاحیت تو نہیں رکھتا، لیکن اُس نے اس پہاڑی کے

چشموں کو گرم کر رکھا ہے۔ واللہ سبحانہٗ اعلم وتبارک اللہ احسن الخالقین.

سابوسابو سے اُسی رات ہمیں واپس لمباسا پہنچنا تھا، یہاں کے ایک بااثر مسلمان نے عشائیہ کا اہتمام کیا ہوا تھا، ان کے گھر کھانا کھانے کے بعد ہم واپس روانہ ہوئے اور رات گئے واپس لمباسا پہنچ پائے۔

سوؔوا میں

اگلے روز ساڑھے نو بجے ہم لمباسا سے فیجی کے دارالحکومت سوؔوا روانہ ہوئے۔ نسورؔی اور سوؔوا دو خوبصورت جڑواں شہر ہیں۔ ہوائی اڈہ نسورؔی میں واقع ہے اور دارالحکومت سوؔوا ہے۔ سوؔوا میں ہمارا پروگرام فیجی مسلم لیگ نے ترتیب دیا تھا جو فیجی کے مسلمانوں کی سب سے بڑی تنظیم ہے۔ ہوائی اڈے سے وہ ہمیں سب سے پہلے نسورؔی کے ایک عالی شان مسلم اسکول کے معائنے کے لئے لے گئے، یہ مسلمان بچوں کی تعلیم کا بڑا منظّم ادارہ ہے جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار بچے زیرِ تعلیم ہیں، یہاں انٹرمیڈیٹ کی سطح تک مروّجہ سرکاری نصاب کے ساتھ ساتھ انہیں قرآنِ کریم اور بنیادی تعلیمات دینے کا انتظام ہے۔ آج کل اسکول کی چھٹیاں تھیں، لیکن اسکول کے پرنسپل، منتظمین اور اساتذہ نے لائبریری کے ہال میں ہمارا استقبال کیا اور اسکول کے بارے میں تفصیلات بتائیں، معلوم ہوا کہ اسی طرز کا ایک اسکول سوؔوا میں بھی قائم ہے اور ان تعلیمی اداروں کی بناء پر مسلمان بچوں کو غیر مسلموں کے تعلیمی اداروں میں بھیجنے کے مفاسد کا بڑی حد تک سدِ باب ہوا ہے۔

عصر کے بعد میزبانوں نے سوؔوا شہر کی سیر کا پروگرام بنایا ہوا تھا، یہ فیجی کا سب سے ترقی یافتہ اور خوبصورت شہر ہے۔ قدرتی مناظر کے حسن کے ساتھ عمارتی حسن کے لحاظ سے بھی اس کا رُوکار بڑا دلکش ہے اور اگر گرمی نہ ہوتی تو یہ سوئٹزر لینڈ کا کوئی شہر معلوم ہوتا۔ اندرونِ شہر سے گزرتے ہوئے بالآخر ہم ساحلِ سمندر پر پہنچ گئے۔ سامنے بحرالکاہل حدِ نظر تک پھیلا ہوا تھا، البتہ اس کے دائیں جانب سرسبز وشاداب جزیرے نظر آرہے تھے۔ فیجی مسلم لیگ کے نائب صدر عبدالقیوم صاحب نے جو اصلاً پاکستانی ہیں اور کئی سال سے فیجی میں مقیم

ہیں، ایک جزیرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس میں جو قبیلہ آباد ہے اُسے اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب خصوصیت سے نوازا ہے، اور وہ یہ کہ اس قبیلے کے افراد کے ہاتھ پاؤں کی جلد ایسی ہے جس پر آگ اثر نہیں کرتی، یہ لوگ بلا تکلف آگ سے تپتے ہوئے پتھروں پر چل لیتے ہیں اور سووا کے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں ہر جمعرات کو ان کے آگ پر چلنے کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ سیاحوں کیلئے فیجی کے تعارفی کتابچے شائع کئے گئے ہیں، ان میں بھی اس قبیلے کی اس خصوصیت کا ''خدائی عطیہ'' کے عنوان سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ آگ پر چلنے کا مظاہرہ اور بھی بعض علاقوں میں ہوتا ہے لیکن یا تو وہ نظر بندی ہوتی ہے یا جلد پر کوئی مانع آتش مادہ استعمال کرکے یہ مظاہرہ کیا جاتا ہے، یہاں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ فیجی کے اس قبیلے کا یہ مظاہرہ اس قسم کے مصنوعی انتظام سے خالی ہے، بلکہ ان کی جلد واقعتاً ایسی ہے جو آگ کا اثر قبول نہیں کرتی، بلکہ عبدالقیوم صاحب نے خود اپنا یہ واقعہ بیان کیا کہ ان کے سامنے ایک بچی گرم پانی سے جل گئی تھی، لوگ اُسے اُٹھا کر ہسپتال لے جانے کے بجائے اسی قبیلے کے ایک آدمی کے پاس لے گئے اور تھوڑی دیر میں وہ واپس آئی تو اس کے جسم کی سوزش دور ہو چکی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب.

مغرب کی نماز ہمیں شہر کی سب سے بڑی جامع مسجد میں پڑھنی تھی، جہاں مغرب کے بعد میری تقریر کا اعلان تھا۔ مسجد کو جاتے ہوئے راستے میں قادیانیوں کا ایک مرکز بھی نظر سے گذرا، مشہور ہے کہ انہوں نے فیجی میں اپنا مشن بڑے زور وشور سے قائم کیا ہوا ہے، تقریباً ہر بڑے شہر میں ان کے مراکز موجود ہیں، لیکن یہاں کے مسلمانوں نے بتایا کہ الحمدللہ مسلمانوں کی اکثریت ان کی تلبیس سے آگاہ ہو چکی ہے، اور ان کا دامِ فریب زیادہ کارگر نہیں ہے۔

ہم جامع مسجد پہنچے تو وہاں مغرب کی اذان سے قبل ہی پارکنگ کی پوری جگہ بھر چکی تھی، اور سڑک پر کاروں کی قطار لگی ہوئی تھی، مسجد دو منزلہ اور کافی وسیع ہے، مگر اس میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، ہمیں بمشکل محراب تک لے جایا گیا اور بہت سے لوگوں نے نماز سڑک

پرادا کی، واقعتاً فیجی کے لحاظ سے یہ غیر معمولی مجمع تھا، اور لوگوں کا کہنا تھا کہ اس ملک میں اس سے پہلے مسلمانوں کا کوئی اتنا بڑا اجتماع نہیں ہوا۔ یہاں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میری تقریر ہوئی جو بفضلہٖ تعالیٰ لوگوں نے دلچسپی اور توجہ سے سنی، میں جو پیغام اس ملک کے مسلمانوں کو دینا چاہتا تھا، الحمدللہ وہ وہاں پہنچا دیا گیا، جس میں ان کیلئے بہت سی عملی تجاویز تھیں، اور جو قابلِ اصلاح اُمور مجھے اپنے قیام کے دوران نظر آئے تھے ان کی نشاندہی بھی کی۔ نماز عشاء کے بعد عشائیہ پر یہاں کے مختلف طبقہ ہائے زندگی کے حضرات سے ملاقات اور یہاں کے مسائل پر گفتگو ہوئی اور بفضلہٖ تعالیٰ یہ اجتماع اس حیثیت سے کامیاب رہا۔

فیجی کے کچھ بااثر حضرات نے مسلمانوں کے معاشی مسائل کے حل کیلئے ایک کوآپریٹیو تنظیم قائم کی ہوئی ہے، میں نے اسی عشائیہ پر انہیں ترغیب دی کہ وہ مسلمانوں کو سود کی لعنت سے نجات دلانے کیلئے کچھ کام کریں۔ چنانچہ انہوں نے اگلے دن نو بجے اس موضوع پر تفصیلی مشورے کیلئے وقت لیا اور صبح نو بجے ان سے اس سلسلے میں مفصل گفتگو رہی جس میں طریقۂ کار کے بنیادی خدوخال متعین کئے گئے، اور باقی تفصیلات کو مقامی علماء کے مشورے سے طے کرنے کا مشورہ دیا گیا۔

اسی روز گیارہ بجے خواتین کے ایک اجتماع سے خطاب کا پروگرام تھا، اس اجتماع میں بھی خواتین کی شرکت غیر معمولی تھی۔ دس بجے سے اجتماع گاہ میں خواتین کی آمد شروع ہوئی تھی، اور منتظمین نے ان کیلئے جس جگہ کا انتظام کیا تھا، وہ تنگ پڑ گئی، منتظمین کا اندازہ تھا کہ آٹھ سو سے ایک ہزار تک خواتین اس اجتماع میں شریک ہوئیں جو اس ملک کے لحاظ سے غیر متوقع تھی۔ جس مسجد کے ملحقہ ہال میں یہ اجتماع تھا، وہاں پاکستان کے مدارس کے پڑھے ہوئے ایک مقامی عالم نے جن کی اہلیہ ایک پاکستانی عالمہ ہیں، پہلی بار طالبات کی دینی تعلیم کیلئے ایک مدرسہ شروع کیا ہے جو ماشاء اللہ تیز رفتاری سے ترقی کر رہا ہے، اجتماع میں جو خواتین حاضر ہوئیں ان میں سے بہت سی خواتین نے مدرسہ کی کارگزاری دیکھ کر اپنی بچیوں کو یہاں تعلیم دلانے کا شوق ظاہر کیا۔

ناڈی میں

ظہر کے بعد ہمیں یہاں سے سڑک کے راستے ناڈی جانا تھا، ناڈی میں ہمارے میزبان جناب آصف صاحب تھے (جن کا ذکر خیر ابتداء میں آچکا ہے) وہ ہمیں لے جانے کیلئے ایک دن پہلے ہی سووا پہنچ چکے تھے۔ اُن کی آرام دہ کار میں ہم سووا سے روانہ ہوئے، ناڈی تک کا سفر تقریباً تین گھنٹے کا ہے، اور یہ پورا راستہ حسین مناظر قدرت سے مالا مال ہے، جن میں سرسبز میدان، گھنے جنگلات، سبز پوش پہاڑ اور پانی کے چشمے نگاہوں کو سرور بخشتے ہیں۔ مغرب سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے ہم آصف صاحب کے مکان پر پہنچ پائے، لیکن مغرب کی نماز ہمیں ایک اور شہر لوٹوکا (Lautoka) میں پڑھنی تھی جو جزیرۂ ویٹی کا تیسرا بڑا شہر ہے اور ناڈی سے تقریباً پچاس کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے، اسی شہر کے مضافات میں جامعہ فاروقیہ کراچی کے بعض فارغ التحصیل علماء نے ایک دینی مدرسہ قائم کیا ہوا ہے۔ مغرب کی نماز ہم نے اسی مدرسہ کی مسجد میں ادا کی، اور مغرب کے بعد وہاں عشاء تک میری تقریر ہوئی جس میں لوٹوکا کے مسلمان باشندے خاصی تعداد میں شریک ہوئے۔ یہاں سے رات گئے ناڈی واپسی ہوئی۔

پچھلے تین روز بڑے مصروف گذرے تھے، اگلا دن جمعرات تھا، اور فیجی کے قیام میں میرا آخری دن۔ اس کے بعد واپسی کا طویل سفر سامنے تھا، اس لئے اس روز عصر تک کوئی متعین پروگرام نہیں رکھا گیا تھا۔ چنانچہ اس میں قدرے آرام مل گیا۔ البتہ عصر کے بعد ناڈی کے مسلم اسکول میں حاضری ہوئی جو نسوڑی کے مسلم اسکول کے طرز پر فیجی مسلم لیگ نے قائم کیا ہے، اگرچہ یہ مسلم اسکول ہے لیکن اس کے پرنسپل صاحب نے بتایا کہ حکومتی قواعد کے تحت ہم غیر مسلم بچوں کو داخلہ دینے سے منع نہیں کر سکتے، چنانچہ کل سترہ سو طلبہ میں تقریباً ڈھائی سو غیر مسلم بچے بھی یہاں زیر تعلیم ہیں، اگرچہ غیر مسلم بچوں کیلئے اسلامیات کی تعلیم لازمی نہیں ہے، لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ یہ غیر مسلم بچے خود اپنے شوق اور اختیار سے اسلامیات پڑھنا چاہتے ہیں، بلکہ جب بعض بچوں کو یہ کہا گیا کہ آپ کے ذمے اسلامیات

کی تعلیم لازمی نہیں ہے تو انہوں نے اپنے والدین سے شکایت کی اور والدین نے خود آ کر اسکول کے منتظمین سے درخواست کی کہ انہیں اسلامیات کے درس سے محروم نہ کیا جائے۔

مغرب کے نادی کی مرکزی جامع مسجد میں جو تبلیغی مرکز بھی ہے، شب جمعہ کا اجتماع تھا، اور اس میں میرے بیان کا اعلان ہو چکا تھا، چنانچہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے مجھے اس اجتماع سے بھی خطاب کا موقع ملا جو فیجی میں اس سفر کے دوران میرا آخری خطاب تھا جس کے بعد اگلے دن میں نادی سے واپس پاکستان کیلئے روانہ ہو گیا۔ اور بتیس گھنٹے کے طویل سفر کے بعد ہفتہ 15 جنوری کو بفضلہٖ تعالیٰ واپس کراچی پہنچا۔

مجموعی تاثرات

فیجی میں میرا قیام ایک ہفتہ رہا، اور اس دوران ملک کے بڑے بڑے شہروں میں حاضری، ملاقاتوں اور تقریروں کا موقع ملا۔ میں نے اس ملک کے مسلمانوں کو نہایت سادہ، مرنجان و مرنج اور مسکین طبع پایا۔ ان پر ایک زمانہ ایسا گذرا ہے جس میں یہ دینی رہنمائی نہ ملنے کی بناء پر عملی زندگی میں دین سے دور ہو گئے تھے اور اس کا سنگین ترین مظہر یہ ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان شادیاں ہو گئیں، مسلمان لڑکیوں نے عیسائیوں سے شادی رچالی، اس بدترین صورتحال کے آثار ابھی تک باقی ہیں، جو اس ملک کے مسلمانوں کا انتہائی تشویشناک مسئلہ ہے، جس کے حل کیلئے میں نے بااثر مسلمانوں کو متعدد اقدامات کا مشورہ دیا ہے، خدا کرے کہ وہ ان پر عمل کر کے اس سنگین صورتحال کا سدباب کر سکیں۔ آمین

تاہم جب سے ملک میں تبلیغی جماعت کا کام شروع ہوا ہے ماشاء اللہ صورتحال میں نمایاں تبدیلی آئی ہے، مسلمانوں کے دینی شعور میں اضافہ ہوا ہے، تبلیغی مراکز ہر جگہ قائم ہوئے ہیں، میرے قیامِ فیجی کے دوران بھی پاکستان سے تین جماعتیں کئی کئی ماہ کیلئے ملک میں آئی ہوئی تھیں، اور مختلف علاقوں میں اپنا فیض پھیلا رہی تھیں۔

اسی کے ساتھ پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش سے متعدد علماء فارغ التحصیل ہو کر یہاں پہنچے ہیں اور انہوں نے مسلمانوں کی دینی تعلیم و تربیت اور ذہن سازی کا قابل

تعریف کام کیا ہے، جس کے اثرات مشاہدہ میں آتے ہیں۔

فیجی کی حکومت دینی سرگرمیوں پر کوئی قدغن نہیں لگاتی، یہاں مسلموں اور غیر مسلموں کے مشترک محلوں میں بھی لاؤڈ اسپیکر پر اذانیں ہوتی ہیں اور تبلیغ و تعلیم پر کوئی ایسی پابندی نہیں ہے جو ان کاموں میں رکاوٹ ڈال سکے۔ مسلمانوں میں یہ شعور بھی پیدا ہو رہا ہے کہ وہ اپنے معاشی اور تجارتی سرگرمیوں کو شریعت کے مطابق بنائیں، ان میں یہ احساس بھی پایا جاتا ہے کہ وہ ایک انتہائی دور افتادہ ملک میں آباد ہیں جس کی طرف تعاون کی نگاہیں کم اُٹھتی ہیں۔ چنانچہ کسی غیر ملکی مسلمان کی آمد کی وہ بڑی قدر کرتے ہیں۔ میرے پاس ان مسلمانوں کو دینے کیلئے کچھ نہیں تھا، لیکن اُن کے ملک میں آمد پر انہوں نے جس طرح تشکر اور قدر دانی کے جذبات کا مظاہرہ کیا وہ ناقابل فراموش ہے۔

چونکہ یہاں کے مسلمان سادہ طبیعت کے مالک ہیں، لڑائی جھگڑے اور بحث و مباحثہ ان کے مزاج میں نہیں ہے، اور ان کی طبیعت میں قبول کا مادہ ہے، اس لئے ان تک دین کی باتیں پہنچانا اور عمل پر آمادہ کرنا شاید دوسری جگہوں کے مقابلے میں آسان ہے۔ فیجی میں دینی کتابوں کی جتنی ضرورت ہے ان کی اتنی ہی کمی ہے جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ سمندری ڈاک یہاں مہینوں میں پہنچتی ہے، حد یہ کہ DHL جیسی عالمی کوریئر سروس سے بھی کوئی چیز بھیجی جائے تو تقریباً ایک ہفتہ لگ جاتا ہے، ہوائی ڈاک کے اخراجات بھی بہت زیادہ ہیں۔ یہاں کے بیشتر مسلمان اردو بولتے اور سمجھتے ہیں، لیکن وہ ہندی کے ساتھ ملی جلی زبان ہے اور اس کا لب ولہجہ مقامی زبان سے بھی متاثر ہے جس کی بناء پر وہ ایک نئی سی زبان ہو کر رہ گئی ہے، لہٰذا یہاں ایسی کتابیں ہی مفید ہو سکتی ہیں جو بہت آسان اور سادہ زبان میں لکھی گئی ہوں۔ ان اُمور کو مدنظر رکھتے ہوئے فیجی جانے والی تبلیغی جماعتوں اور وہاں کام کرنے والے علماء کو وہاں کی دینی ضروریات پوری کرنے کیلئے ابھی بہت کچھ کرنا ہے، اللہ تعالیٰ انہیں اس کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین

ایک ہفتہ ایران میں

اگست/ستمبر 2005ء

رجب/شعبان ۱۴۲۶ھ

ایک ہفتہ ایران میں

اگست/ستمبر 2005ء / رجب/شعبان ۱۴۲۶ھ)

حمد وستائش اس ذات کیلئے ہے جس نے اس کارخانہ عالم کو وجود بخشا

اور

درود وسلام اس کے آخری پیغمبر ﷺ پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

عجیب اتفاق ہے کہ پچھلے پچیس سال کے دوران میں دنیا کے بیشتر اہم ملکوں کا سفر کر چکا ہوں، مشرق ومغرب اور شمال وجنوب کے انتہائی سروں تک پہنچ چکا ہوں، لیکن اپنے ہمسایہ ملک ایران کا کوئی سفر اب تک نہیں ہوا تھا۔ پچھلے دس بارہ سالوں میں بار بار ایران کے مختلف حلقوں سے دعوتیں بھی ملتی رہیں، اور دل میں خواہش بھی تھی کہ اس ملک میں حاضری ہو جسکا چپہ چپہ اسلام کی جگمگاتی ہوئی علمی، ادبی اور تمدنی تاریخ کی یادگار ہے، لیکن کوئی نہ کوئی ایسا عذر پیش آتا رہا کہ میں یہ سفر نہ کرسکا۔

ایرانی بلوچستان کے دار الحکومت زاہدان میں ایک دینی مدرسہ دار العلوم زاہدان کے نام سے قائم ہے، ہمارے دار العلوم کراچی کے متعدد فارغ التحصیل حضرات وہاں کے لائق و فائق اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں جن میں مولانا مفتی محمد قاسم صاحب اور مولانا مفتی عبدالقادر صاحب عارفی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ مدرسہ کے مہتمم مولانا عبدالحمید صاحب ایران کے سربرآوردہ اور فعال عالم ہیں، یہ حضرات کئی سال سے اپنے سالانہ جلسہ کے موقع پر مجھے دعوت دیتے رہے ہیں، پچھلے سال بھی اُن کی طرف سے دعوت موصول ہوئی تھی،

لیکن میں دوسری مصروفیات کی بنا پر نہ جاسکا تھا، البتہ برادر معظم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم صدر دارالعلوم کراچی تشریف لے گئے تھے، اور انہوں نے تقریباً ایک ہفتہ ایران کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا تھا اور میں نے اس سال (رجب 1426ھ) میں سفر کا وعدہ کرلیا تھا۔

22 رجب 1426ھ کو ہمارے دارالعلوم میں ختم بخاری کی تقریب تھی، اور اگلی صبح چھ بجے میں اپنے بھانجے اور دارالعلوم کے استاذ حدیث مولانا رشید اشرف صاحب سلمہ کے ہمراہ کراچی سے روانہ ہوا اور دبئی سے جہاز تبدیل کرکے صبح ساڑھے دس بجے تہران کے جدید ہوائی اڈے پر اُترا۔ یہ طویل وعریض ہوائی اڈہ جو اسی سال تعمیر ہوا ہے، شہر سے تقریباً چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر بنایا گیا ہے اور تمام جدید سہولتوں سے آراستہ ہے۔

ہوائی اڈے پر مولانا مفتی محمد قاسم صاحب اور مولانا عبدالقادر عارفی صاحب کے علاوہ دارالعلوم زاہدان کے استاذ حدیث مولانا عبدالرحمٰن مجبی، تہران کے مولانا عبدالہادی، مولانا عبیداللہ موسی زادہ وغیرہ استقبال کیلئے موجود تھے۔ دارالعلوم کراچی کے ایک اور فارغ التحصیل عالم مولانا محمد اسحٰق ایرانی تہران میں شعبۂ تقریب بین المذاہب کے صدر ہیں۔ اسی شعبے کے ناظم آیت اللہ محمد علی تسخیری ہیں جن سے مجمع الفقہ الاسلامی اور المجلس الشرعی وغیرہ کی معرفت میری بھی بے تکلفی ہے، مگر وہ ان دنوں سفر پر تھے، اس لئے ان سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ مولانا محمد اسحٰق ایرانی کو بھی دیر سے اطلاع ہوئی، اس لئے وہ ہوائی اڈہ پر نہ پہنچ سکے۔ لیکن جب ہم لالہ ہوٹل پہنچے جہاں ہمارے قیام کا انتظام تھا، تو انہیں منتظر پایا اور ان سے ملاقات ہوئی۔

لالہ ہوٹل کسی وقت انٹرکانٹی نینٹل ہوا کرتا تھا، غالباً انقلاب کے بعد اس نے مستقل حیثیت اختیار کرلی اور اس کا نام ”لالہ“ پھول کے نام پر رکھا گیا۔

مختصر آرام کے بعد عصر کی نماز پڑھ کر ہم ہوٹل سے نکلے، ایرانی پارلیمنٹ کے رکن مہندس پیمان فروزش صاحب نے (جو زاہدان کے علاقے سے رکن پارلیمنٹ منتخب ہوئے

ہیں) مجھ سے ملاقات کیلئے اپنے مکان پر معززین شہر کا ایک اجتماع رکھا ہوا تھا، ہمیں مغرب کی نماز وہاں پڑھنی تھی، تہران ایک خوبصورت شہر ہے، اور ترقی پذیر ممالک کے اچھے شہروں میں شمار ہوتا ہے، جدید تمدنی سہولیات سے آراستہ اور بارونق۔ اس کے مختلف علاقوں سے گذرتے ہوئے ہم پیمان فروزش صاحب کے مکان پر پہنچے اور وہاں نمازِ مغرب ادا کی۔

مغرب کے بعد وہاں تہران میں مقیم بااثر اہلسنّت حضرات کا ایک اچھا خاصا اجتماع ہوگیا جن میں کردستان، خراسان، بلوچستان اور خود تہران کے معززین جمع تھے۔ ڈاکٹر جلال جلالی زادہ کردستان کے ایک بااثر رہنما ہیں جو پارلیمنٹ کے رکن بھی رہ چکے ہیں، انہوں نے اپنی مختصر تقریر میں ہمارا خیر مقدم کیا، اور ساتھ ہی یہ شکایت بھی کی کہ بیرونِ ایران کے علماء اور رہنماؤں نے ایران کے مسلمانوں کو اس لحاظ سے نظرانداز کیا ہوا ہے کہ ان کے ساتھ بیرونِ ایران کے حضرات کا کوئی قابل ذکر رابطہ نہیں ہے۔ میں نے اپنی جوابی تقریر میں اپنی اس کوتاہی کا اعتراف کرتے ہوئے اُمت مسلمہ کی موجودہ صورتحال اور اس میں اپنی راہِ عمل کے موضوع پر کچھ گذارشات پیش کیں۔ میری تقریر عربی میں تھی مولانا محمد قاسم صاحب نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

مولانا عبدالہادی دارالعلوم زاہدان کے فارغ التحصیل اور مولانا محمد قاسم کے شاگرد ہیں، اور آج کل تہران یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کررہے ہیں، وہ پورے سفر میں بڑی مستعدی کے ساتھ ہمارے ساتھ رہے، اور اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے کہ انہوں نے ہماری راحت رسانی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آج رات کا کھانا ان کے گھر پر تھا جس میں اور بھی متعدد احباب سے ملاقات ہوئی، اور رات گئے وہاں سے واپسی ہوئی۔

اصفہاؔن کا سفر

اگلا دن ہم نے اصفہان اور قُم کے سفر کیلئے مخصوص کیا تھا، اصفہاؔن تہراؔن سے تقریباً چار سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ہم فجر پڑھتے ہی ناشتہ کئے بغیر سفر پر روانہ ہوگئے۔ تہران سے نکلنے کے بعد اصفہاؔن تک بڑی کشادہ اور شاندار موٹروے ہے جو شاہراہوں کی

تمام جدید سہولیات سے آراستہ ہے۔ تہرآن سے تقریباً سو کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد شہر قُم سے کچھ پہلے مہتاب ریسٹورنٹ کے نام سے ایک خوبصورت آرام گاہ بنی ہوئی ہے، یہاں ہم نے ناشتہ کیا، اور اس کے بعد اصفہان کی طرف اپنا سفر جاری رکھا۔ تقریباً نصف فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم شہر قاشآن سے بھی گذرے، غالباً یہ وہی شہر ہے جہاں بدائع الصنائع کے مؤلف علامہ علاؤالدین کاشانی رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے تھے۔ ان کا مزار حلب میں ہے اور اس کا تذکرہ میں اپنے شام کے دوسرے سفرنامے میں کر چکا ہوں۔

سڑک کا لمبا سفر مجھے ہمیشہ بہت تھکا دیتا ہے، اس لئے میں عموماً اس سے پرہیز کرتا ہوں، لیکن اصفہان دیکھنے کا شوق غالب تھا، سڑک بہت اچھی تھی، اور میزبانوں نے گاڑی کا انتظام بڑا آرام دہ کیا تھا۔ اس لئے الحمدللہ زیادہ تعب نہیں ہوا، اور ہم دوپہر بارہ بجے اصفہان پہنچ گئے۔ یہ تہران اور مشہد کے بعد ایران کا تیسرا بڑا شہر ہے، اسے دیکھنے کا شوق اس کے ظاہری حسن سے زیادہ اس کی تاریخی اہمیت کی وجہ سے تھا۔ یہاں سے ہر علم وفن کے بڑے بڑے شناور پیدا ہوئے جن میں محدثین میں حافظ ابن مندہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابونعیم اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ ۴۳۰ھ ہیں۔ جن کی کتاب حلیۃ الاولیاء بزرگان دین کے تذکرے کا بڑا ماخذ ہے۔ مفسرین میں سے امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ ۵۰۲ھ ہیں جن کی کتاب ''مفردات القرآن'' لغات القرآن پر اتھارٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ادباء میں سے ابوالفرج اصفہانی (متوفی ۳۶۸ھ) ہیں جن کی کتاب ''الأغانی'' عربی ادب کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ ظاہری فقہ کے بانی امام داؤد ظاہری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۲۷۰ھ) ہیں، جنہوں نے فقہ میں ایک مستقل مکتب فکر کی بنیاد رکھی، عقائد وکلام میں علامہ ابوبکر ابن فورک رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۴۰۶ھ) ہیں جن کی کتاب ''مشکل الحدیث'' مأخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

شہر اصفہان میں اتنی بڑی تعداد میں علم و ادب کی شخصیات پیدا ہوئیں ہیں کہ علامہ یاقوت حموی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ:

”وقد خرج من أصبهان من العلماء والأئمة فی کل فنّ مالم یخرج من مدینة من المدن، وعلی الخصوص علوالإسناد فإن أعمار أهلها تطول، ولهم مع ذلک عنایة وافرة بسماع الحدیث. “

(معجم البلدان ۔ ص:۲۰۹ ۔ ج:۱)

اصفہان اپنی نفیس آب وہوا کیلئے بھی بہت مشہور رہا ہے، اور علامہ حموی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہاں نہ صرف یہ کہ کیڑے مکوڑے نہیں ہوتے، بلکہ کھانا بھی جلدی نہیں سڑتا اور پھل جلدی خراب نہیں ہوتے، بلکہ انہوں نے یہ روایتیں بھی نقل کی ہیں کہ یہاں قبروں میں مردوں کا جسم بھی کافی مدت تک صحیح سالم رہتا ہے۔ واللہ سبحانہٗ اعلم۔

یہ شہر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہٗ کے عہد خلافت میں ۱۹ھ میں فتح ہوگیا تھا۔ اس وقت یہاں قاذوسقان نامی بادشاہ کی حکومت تھی۔ حضرت عبداللہ بن عتبان رضی اللہ عنہٗ نے اس کا محاصرہ کیا، اور جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو قاذوسقان نے حضرت عبداللہ بن عتبان رضی اللہ عنہٗ کو پیغام بھیجا کہ دونوں فوجوں کے لڑنے سے خونریزی کے سوا کچھ فائدہ نہیں ہے، لہٰذا آؤ ہم دونوں تنہا ایک دوسرے کا مقابلہ کریں، اگر میں نے تمہیں قتل کردیا تو تمہارا لشکر واپس چلا جائے، اور اگر تم نے مجھے قتل کردیا تو میرے ساتھی تمہارے ساتھ صلح کرلیں گے۔ حضرت عبداللہ بن عتبان رضی اللہ عنہٗ نے یہ تجویز منظور کرلی۔ دونوں کا مقابلہ ہوا۔ حضرت عبداللہ بن عتبان رضی اللہ عنہٗ نے قاذوسقان کو پیشکش کی کہ پہلے تم حملہ کرو، قاذوسقان نے حملہ کیا تو حضرت عبداللہ بن عتبان رضی اللہ عنہٗ کے گھوڑے کی زین وغیرہ کٹ گئی، لیکن وہ اپنی جگہ صحیح وسالم اور ثابت قدم کھڑے رہے، پھر حضرت عبداللہ بن عتبان رضی اللہ عنہٗ نے کہا کہ ”اب میں حملہ کروں گا، تم تیار رہو“ لیکن اس موقع پر قاذوسقان نے کہا کہ میں تمہاری ثابت قدمی دیکھ چکا ہوں، اب میں تم سے صلح کرکے شہر تمہارے حوالہ کرنے کو تیار ہوں، چنانچہ صلح نامہ لکھا گیا، تمام اہل شہر کو امان دی گئی، شہر پر مسلمانوں کی

حکومت قائم ہوگئی، اوراس کے بعد سے یہ شہر اہل علم وفضل کا مرکز بن گیا۔

اگر چہ اس شہر کے چپہ چپہ پر ان اہل علم وفضل کے مآثر موجود ہوں گے، لیکن جب صفویوں کی متعصب شیعہ حکومت یہاں قائم ہوئی تو انہوں نے اہلسنّت کے مآثر باقی نہیں چھوڑے، اب یہاں صرف صفوی دور کی یادگاریں باقی ہیں۔ صفوی حکمرانوں نے اصفہان کو ایک مدت تک ایران کا دارالحکومت بنایا تھا اس لئے یہاں ان کے بنائے ہوئے شاندار قلعے، محلات اور مساجد اب بھی موجود ہیں، پرانے شہر کے علاقے میں پہنچ کر ہمارے رہنما ہمیں اس چوک میں لے گئے جو ''میدانِ نقش جہاں'' کے نام سے موسوم ہے۔ یہ واقعتاً ایک قابل دید میدان ہے جس کی لمبائی ایک کلومیٹر سے زیادہ اور چوڑائی تقریباً نصف کلومیٹر ہوگی، اس کے ایک طرف ایک عالیشان مسجد ہے، اور تین طرف فصیل ہے، اور ایک جانب فصیل پر نہایت پُرشکوہ برج بنا ہوا ہے یہ میدان چوگان (پولو) کھیلنے کیلئے استعمال ہوتا تھا، اور بادشاہ اس برج سے کھیل کا نظارہ کرتے تھے۔ میدان کے ایک طرف جو عالیشان مسجد بنی ہوئی ہے وہ اگر چہ صفوی دور کی ہے، لیکن اس کے پہلو میں ایک اور شاندار مسجد ہے جو سلجوقی بادشاہوں کے دور کی بنی ہوئی ہے اور اس کی دیواروں پر خلفائے ثلاثہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے اسماء گرامی بڑی خوبصورتی سے لکھے گئے ہیں، اور دوسری طرف حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی علیحدہ لکھا ہوا ہے۔ خلفاء ثلاثہ اور حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کے اسماء گرامی میں اس تفریق کی وجہ سمجھ میں نہیں آسکی۔

بہرکیف! ہم نے ظہر کی نماز اسی مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کی، یہ اصفہان کا قدیم علاقہ تھا، اور تصور کی نگاہیں یہاں اہل علم وفضل کی محفلیں سجی ہوئی دیکھتی رہیں، لیکن چشم سَر ان کے مآثر کو یہاں کی فضاؤں میں تلاش ہی کرتی رہ گئیں۔

اصفہان کا شہر ایک خوبصورت دریا کے دوطرف آباد ہے، دریا کے دونوں سروں کو ملانے کیلئے جگہ جگہ خوبصورت پل بنے ہوئے ہیں، ان میں سے ایک پل ''سی وسہ پل'' کہلاتا

ہے۔ کیونکہ اس میں تینتیس در ہیں۔ ایک اور پُل ''خواجو'' کہلاتا ہے اور اس پر سے دریا اور اس کے دونوں طرف پھیلی ہوئی شہر کی عمارتیں اور سبزہ و گل کے تختے بڑا دلکش منظر پیش کرتے ہیں۔ ہمارے رہنماؤں نے ہمیں ان پلوں کی بھی سیر کرائی۔

شام چار بجے تک ہم اصفہان میں رہے، اور دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد یہاں سے واپس روانہ ہوئے۔

قُم میں

واپسی میں تقریباً ڈھائی گھنٹے سفر کرنے کے بعد ہم شہر قُم میں داخل ہوئے جسے اصفہان جاتے ہوئے ہم راستے میں چھوڑ آئے تھے۔ قُم کا علاقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ۲۳ھ میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فتح کیا تھا۔ اس وقت یہ کوئی بڑا شہر نہیں تھا، بلکہ چھوٹی چھوٹی سات بستیوں کا مجموعہ تھا جن میں سے ایک کا نام کُمندان تھا۔ ۸۳ھ میں جب عبدالرحمٰن بن الأشعث نے حجاج بن یوسف سے بغاوت کی تو اس کے لشکر کے کچھ افراد یہاں آ کر مقیم ہوئے، اور انہوں نے ان ساتوں بستیوں کو ملا کر ایک شہر آباد کر دیا اور یہ ساتوں بستیاں اس شہر کے محلے بن گئے، اس شہر کا نام کمندان سے مختصر اور معرب کر کے قُم بنا دیا گیا۔ جن لوگوں نے یہ شہر آباد کیا تھا، ان میں سب سے نمایاں شخص عبداللہ بن سعد تھا، اس کا ایک بیٹا کوفہ میں پیدا ہوا تھا، اور وہیں پر اہل تشیع کے ماحول میں اس کی تربیت ہوئی تھی، قُم کے آباد ہونے کے بعد وہ کوفہ سے قُم منتقل ہو گیا، اور اس نے یہاں شیعہ مذہب کو فروغ دیا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ یہ پورا شہر شیعہ ہو گیا، اور یہی وہ شہر ہے جس کے بارے میں لطیفہ مشہور ہے کہ صاحب بن عباد نے (جو وزیر بھی تھا، اور اعلیٰ درجے کا ادیب بھی) ایک مرتبہ یہاں کے قاضی کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''أیها القاضی بقم، قد عزلناک فقُم''

قُم کے معنی عربی زبان میں ہوتے ہیں ''کھڑے ہو جاؤ''۔ چنانچہ اس جملے کا مطلب یہ

ہوا کہ ''اے قم کے قاضی! ہم نے تمہیں معزول کر دیا ہے، لہٰذا کھڑے ہو جاؤ'' اس کے بعد جب کبھی اُن قاضی صاحب سے پوچھا جاتا کہ آپ کو کس لئے معزول کیا گیا؟ تو وہ جواب میں کہتے:

> أنا معزول السّجع من غير جرم ولا سبب
>
> ''یعنی مجھے کسی جرم یا کسی اور وجہ سے نہیں صرف قافیہ بندی کے شوق نے معزول کیا ہے۔''

(معجم البلدان۔ ص: ۳۹۷، ۳۹۸۔ ج: ۶)

بہر کیف! یہ شہر دوسری صدی کے آغاز ہی سے اہلِ تشیع کا مرکز بن گیا تھا، اور یہاں سے مشہور شیعہ علماء بڑی تعداد میں پیدا ہوئے اب بھی یہ شیعہ علماء کی متعدد اعلیٰ سطحی درسگاہوں کا شہر ہے۔ یہاں قُم کا مایۂ ناز کتب خانہ بھی ہے جو اپنی نادر کتابوں کے لحاظ سے عالم اسلام کے گِنے چُنے کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے۔ شیعہ امامیہ کے اُصولوں پر تعلیم کیلئے جو درسگاہیں یہاں قائم ہیں وہ اپنے اعلیٰ معیار کی بناء پر مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں ایک ایسے بین الاقوامی مرکز میں بھی جانے کا اتفاق ہوا جو خاص طور پر اہلسنّت کیلئے قائم کیا گیا ہے۔ اس میں دنیا کے مختلف حصوں سے اہلسنّت طلباء کو لایا جاتا ہے اور انہیں حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی فقہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس مرکز کے ایک ذمہ دار نے، جو ایک شیعہ عالم تھے، جب ہمیں یہ بتایا کہ اس مرکز میں تقریباً آٹھ ہزار طلبہ زیرِ تعلیم ہیں تو میں حیران رہ گیا، لیکن میرے رفیق مولانا محمد قاسم صاحب نے اس کی تصدیق کی اور بتایا کہ یہ تعداد اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اس مرکز کی شاخیں مشہد وغیرہ کے دوسرے شہروں میں بھی موجود ہیں۔ اب یہ اہلسنّت کیلئے ایک لمحۂ فکریہ ہے کہ دنیا بھر سے اہلسنّت کے طلبہ کی اتنی بڑی تعداد یہاں تعلیم پا رہی ہے۔!

ان تعلیمی مراکز کے علاوہ قم اس بنا پر بھی عوام کا مرکز بنا ہوا ہے کہ اس میں حضرت علی رضا رحمۃ اللہ علیہ کی بہن سیدہ معصومہ کا مزار واقع ہے جس پر بڑی عالیشان مسجد بھی بنی ہوئی

ہے اس مزار پر زائرین کا ہر وقت بے پناہ ہجوم رہتا ہے، اور بزرگوں کے مزارات پر عوام میں جو بدعات وخرافات رائج ہوگئی ہیں، وہ اپنی تمام فتنہ سامانیوں کے ساتھ یہاں بھی موجود ہیں۔

مغرب کے بعد ہم قُم سے واپس تہران کیلئے روانہ ہوئے، اور رات گئے تک اپنے ہوٹل پہنچ پائے۔

چابہار میں

اگلے دن فجر سے پہلے ہی ہم ہوٹل سے روانہ ہوئے۔ ہمیں بذریعہ ہوائی جہاز چابہار جانا تھا، پرواز کا وقت چھ بجے کا تھا۔ ہم نے تہران کے قدیم مہر آباد کے ہوائی اڈے پر نماز فجر ادا کی جو آج کل اندرونی پروازوں کیلئے استعمال ہو رہا ہے۔ جہاز ڈیڑھ گھنٹہ تاخیر سے روانہ ہوا، اور ایک گھنٹہ کی پرواز کے بعد بندر عباس کے ہوائی اڈے پر اُترا۔ یہ ایران کا صوبہ ہرمزگان کا معروف ساحلی شہر ہے اور اس میں اہل تشیع کے علاوہ شافعی مسلمانوں کی بھی بڑی تعداد آباد ہے۔ یہاں سے مزید پچاس منٹ کی پرواز کے بعد ہم چابہار کے ہوائی اڈے پر اترے۔ چابہار میں ایک بڑا دینی مدرسہ ہے جس کے بانی و مہتمم مولانا عبد الرحمٰن ملازئی صاحب کراچی کے قدیم دینی مدرسے مظہر العلوم کھڈہ کے فارغ التحصیل ہیں، اور انہوں نے ماشاءاللہ اس پورے علاقے میں علم دین کی خوشبو پھیلائی ہوئی ہے۔ آج اس مدرسہ کا سالانہ جلسہ اور تقسیم اسناد کی تقریب تھی جس میں ہمیں شرکت کرنی تھی۔ ہوائی اڈے پر مولانا عبد الرحمٰن صاحب اور ان کے رفقاء نیز علماء اہل تشیع میں سے علاقے کے امام جمعہ اور شہر کے کمشنر نے جہاز کی سیڑھیوں پر ہی ہمارا استقبال کیا، اور ایئرپورٹ سے باہر نکلے تو علماء، طلبہ اور عوام کا زبردست مجمع دورویہ قطاروں کی شکل میں منتظر تھا، ان میں بہت سے علماء وہ تھے جو سالہا سال پہلے ہمارے دارالعلوم میں تعلیم حاصل کر کے گئے تھے، اور میری آمد کی خبر سن کر سینکڑوں میل سے سفر کر کے یہاں پہنچے تھے۔ ان حضرات سے صرف مصافحہ کرنے ہی میں خاصہ وقت صرف ہوا، چونکہ جہاز ڈیڑھ گھنٹہ تاخیر سے پہنچا تھا، اس لئے ہم ہوائی اڈے سے

سیدھے مدرسہ کی جلسہ گاہ میں پہنچے۔ یہ ایک عظیم الشان مسجد تھی جس کا وسیع وعریض ہال حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مدرسہ کے بہت سے اساتذہ ہمارے دارالعلوم کراچی کے تعلیم یافتہ ہیں، ان کی طرف سے متعدد دلچسپ پروگرام پیش کئے گئے، علاقہ کے کمشنر اور ڈپٹی کمشنر نے بھی خطاب کیا، اور آخر میں میری تقریر ہوئی، اور اس کے بعد فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی عمل میں آئی۔

جلسہ، نماز اور کھانے کے بعد تقریباً تین بجے قیام گاہ جانے کی نوبت آئی، قیام کا انتظام سمندر کے کنارے ایک نہایت خوبصورت ریسٹ ہاؤس میں کیا گیا تھا۔ عصر تک یہاں آرام کیا عصر کے بعد تھوڑی سی چہل قدمی کیلئے باہر نکلے تو ساحل سمندر کا بڑا دلکش نظارا سامنے تھا۔ چابہار ایرانی بلوچستان کا ساحلی شہر ہے جو گوادر سے دوسو کلومیٹر شمال میں واقع ہے، اس کا زمینی منظر (Landscape) بھی گوادر ہی کی طرح کا ہے۔ البتہ اس وقت چابہار گوادر کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ ہے، اسے ایرانی حکومت نے فری پورٹ بنایا ہوا ہے، اور اس بنا پر ایک اچھی تجارتی منڈی بن گئی ہے، اسی لحاظ سے عمارتیں، سڑکیں اور دکانیں خاصی متمدن ہیں۔ فضا پر اَبر چھایا ہوا تھا، اور لطیف ہوا کے جھونکے دل ودماغ کو تر و تازہ کر رہے تھے، سمندر کے ساتھ ساتھ کچھ دیر کی اس چہل قدمی سے تھکے ہوئے جسم کو نیا نشاط حاصل ہو گیا۔

مغرب کے بعد مدرسہ میں علماء کا ایک بڑا اجتماع تھا۔ یہاں اطراف واکناف میں دینی مدارس ومکاتب کا خاصہ وسیع سلسلہ ہے جہاں سے اہل علم یہاں پہنچے ہوئے تھے، ان میں ہمارے دارالعلوم کراچی کے فضلاء کی ایک بڑی تعداد تھی۔ عشاء تک ان حضرات سے خطاب ہوا، مولانا محمد قاسم صاحب نے فارسی میں میری تقریر کا ترجمہ کیا۔ عشاء کے بعد ایک مقامی تاجر نے ایک بڑے عشائیہ کا اہتمام کیا تھا، جلسوں کی گہما گہمی میں ابھی تک اپنے پرانے احباب سے اطمینان کے ساتھ ملنے کا موقع نہیں ہو سکا تھا۔ اس عشائیہ میں ان سے پرلطف ملاقاتیں دیر تک جاری رہیں۔

اگلی صبح دس بجے کی پرواز سے ہمیں زاہدان جانا تھا، لیکن اس سے پہلے ایک مختصر پروگرام اور ہوگیا۔ چابہار ایئرپورٹ سے تقریباً دس کلومیٹر دور ایک اور ساحلی شہر کنارک ہے۔ یہاں ہمارے دارالعلوم کے ایک فاضل مولانا عبدالمالک صاحب نے ایک دینی مدرسہ قائم کیا ہوا ہے، اور ایک جامع مسجد کی تعمیر شروع کررہے ہیں، ان کی خواہش تھی کہ اس مسجد کا سنگ بنیاد مجھ سے رکھوائیں۔ چنانچہ ہم ایئرپورٹ جانے سے پہلے کنارک پہنچے، اور مسجد کی تعمیر کا آغاز کرنے کی سعادت حاصل کی، یہاں بھی احباب کا ایک بہت بڑا مجمع تھا۔ سب نے مل کر دعا کی اور اس کے بعد ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہوئے۔

زاہدان میں

چابہار سے تقریباً پچاس منٹ کی پرواز کے بعد ہم ایرانی بلوچستان کے دارالحکومت زاہدان کے ہوائی اڈے پر اُترے۔ یہاں دارالعلوم زاہدان کے مہتمم مولانا عبدالحمید صاحب اور ان کے ساتھ متعدد علماء اہلسنت واہل تشیع نے ہوائی اڈے کے اندر استقبال کیا، اور باہر نکلے تو ایک جم غفیر استقبال کیلئے موجود تھا، یہ حضرات جس محبت کی بنا پر دور دور سے آئے ہوئے تھے، اس کا تقاضہ تھا کہ ان سب سے کم از کم مصافحہ کیا جائے، چنانچہ کچھ دیر دورویہ قطاروں سے مصافحہ کا سلسلہ رہا، مگر بعد میں مولانا عبدالحمید صاحب نے مداخلت کی کہ اتنے بڑے مجمع سے مصافحہ میں بہت دیر لگ جائے گی۔ لہٰذا باقی حضرات کو دور دور سے سلام کرنے پر اکتفا کیا گیا۔

قیام کا انتظام استقلال ہوٹل میں تھا۔ دوپہر کا کھانا ایک مقامی تاجر کے گھر پر تھا۔ پاکستان سے قائدِ حزبِ اختلاف مولانا فضل الرحمٰن صاحب بھی آج صبح ہی یہاں پہنچے تھے، ان سے کھانے پر ملاقات ہوئی۔ دارالعلوم زاہدان کے اِس جلسے میں شرکت کیلئے شام سے تین علماء استاذ عدنان درویش، محمد قشلان اور علاءالدین حائک بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان سے بھی کھانے پر ملاقات ہوئی، یہ حضرات میری تصانیف کے توسط سے مجھ سے واقف تھے، بلکہ تینوں نے اپنے جذباتِ محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آپ سے

ملاقات کی نہ جانے کتنے عرصہ سے تمنا تھی، اللہ تعالیٰ نے آج وہ پوری کی۔

عصر کے بعد دار العلوم زاہدان کے ایک وسیع و عریض ہال میں علاقے کے علماء سے میرے خطاب کا اعلان ہو چکا تھا۔ میں اس ہال میں پہنچا تو اس میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، یہاں تک کہ مائیکروفون تک پہنچنے کیلئے بھی مجمع کو چیر کر جانا پڑا۔ بہت سے لوگوں کو بیٹھنے کی جگہ نہ مل سکی اور وہ کھڑے ہی رہ گئے۔ مولانا عبدالحمید صاحب نے بتایا کہ اس مجمع میں نہ صرف بلوچستان، بلکہ خراسان، ہرمزگان اور ایران کے متعدد صوبوں سے علماء کی بڑی تعداد شریک ہے، اور مناسب یہ ہے کہ خطاب عربی میں ہو تا کہ سب سمجھ سکیں، چنانچہ مغرب تک میں نے عربی میں اہل علم کی ذمہ داریوں کے موضوع پر خطاب کیا، مجمع میں بہت سے چہرے وہ نظر آئے جو جانے پہچانے تھے، ان میں بیشتر لوگ ہمارے دار العلوم کے فارغ التحصیل تھے اور سالہا سال بعد انہیں دیکھنے کی نوبت آئی تھی، مجمع کے سیلاب میں ان سے علیحدہ علیحدہ ملاقات اور گفتگو ممکن نہ تھی، لیکن ان کے چہروں پر مسرت اور حسرت کے ملے جلے جذبات صاف پڑھے جاسکتے تھے، مسرت اس بات کی کہ مدتوں کے بعد انہیں اپنے ایک نیازمند کو دیکھنے کا موقع ملا، اور حسرت اس کی کہ براہِ راست ملاقاتوں اور گفتگو کے درمیان مجمع کی موجیں حائل ہیں۔ مغرب اور عشاء کے بعد کچھ حضرات سے انفرادی ملاقاتیں ضرور ہوئیں، لیکن اتنی بڑی تعداد سے مختصر وقت میں الگ الگ ملنا ناممکن تھا۔

مولانا محمد یوسف صاحب اس علاقے کے ہردلعزیز علماء میں سے ہیں، وہ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں، اور انہوں نے گشت سراوان میں ایک بڑا دینی مرکز قائم کیا ہوا ہے۔ انہوں نے ہی حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر معارف القرآن کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے جو الحمدللہ کتابت وطباعت کے اعلیٰ معیار کے ساتھ چھپ گیا ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ میں ان کے مدرسہ میں حاضر ہوں جہاں ایک دن بعد ان کا سالانہ جلسہ ہونے والا تھا، وہ اپنے رفقاء کے ساتھ ملاقات کیلئے عشاء کے بعد ہوٹل میں تشریف لائے اور اپنی تالیفات کا تحفہ دیا۔ وقت کی قلت کی بنا پر میں گشت جانے کی

فرمائش پوری نہ کرسکا جسے انہوں نے یہ کہہ کر قبول فرمایا کہ مہمان کی راحت ہماری خواہش پر مقدم ہے۔ ان کے ساتھ ان کے مدرسہ کے وہ اساتذہ بھی تھے جنہوں نے ہمارے دارالعلوم کراچی میں تعلیم پائی اور بفضلہ تعالیٰ وہاں کے قابل اور مقبول اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ان حضرات سے ملاقات کے بعد کھانے کا وقت آیا تو مولانا عبدالہادی اور مولانا عبدالقادر عارفی کی تجویز پر ہم شہر سے باہر ایک پرفضاء مقام پر بنے ہوئے پارک براسآن چلے گئے، یہ پارک چند بلوچ بھائیوں نے بنایا ہے، اور اس میں کئی طرح کے ریسٹورنٹ قائم کئے ہیں۔ ایک ریسٹورنٹ کے کھلے میدان میں خوبصورت فرشی نشستوں پر کھانے کا انتظام ہے، اور سِکا ہوا گوشت اس کی امتیازی خصوصیت ہے، رات کا کھانا ہم نے یہیں پر کھایا اور ریسٹورنٹ کی جو خصوصیت سن رکھی تھی، تجربے نے اس کی تصدیق کی۔ ریسٹورنٹ کے مالک نے بڑی محبت سے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھلایا اور قیمت بھی نہ لی۔ بعد میں انہوں نے پارک کے احاطے میں بنی ہوئی ایک خوبصورت مسجد دکھائی جس کے ڈیزائن سے لے کر تعمیر تک ہر مرحلہ انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے انجام دیا ہے۔ تمام دیواروں پر چھوٹے چھوٹے پہاڑی پتھروں کو ایک خاص ترتیب سے جوڑ کر لگایا گیا ہے، جن سے دیواروں میں ایک انفرادی حسن پیدا ہوگیا ہے۔

اگلے روز جمعہ تھا، اور دارالعلوم زاہدان کے جلسے کی آخری نشست۔ صبح گیارہ بجے کے قریب ہم جلسہ گاہ میں پہنچے۔ اس سے پہلے سالوں میں یہ جلسہ دارالعلوم کی مسجد میں ہوا کرتا تھا، لیکن اس سال حاضرین کی متوقع کثرت کی بنا پر شہر کی عیدگاہ میں جلسہ کا انتظام کیا گیا تھا، پوری عیدگاہ میں سفید شامیانے لگا کر لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ جب ہم جلسہ گاہ میں پہنچے تو صوبہ بلوچستان کے گورنر "مہندس امینی استاندار" تقریر کر رہے تھے۔ اس کے بعد اہل تشیع کے امام جمعہ شیخ سلیمانی کی تقریر ہوئی، اور پھر مجھ سے خطاب کی فرمائش کی گئی، میں روسٹرم پر پہنچا تو سامنے حد نظر تک سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ محتاط اندازے کے مطابق حاضرین کی تعداد ایک لاکھ سے کم نہ تھی میری تقریر تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہی اور میں نے

اس میں آیت کریمہ کی تشریح کرنے کی کوشش کی:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ، وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ.

(سورۂ آلِ عمران:۱۶۴)

> ’’اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان فرمایا ہے کہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں تلاوت کرے، اور انہیں پاک صاف کرے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے، حالانکہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔‘‘

اس آیتِ کریمہ نے آنحضرت ﷺ کی بعثت کے چار مقاصد بیان فرمائے ہیں:

(۱) آیات قرآنی کی تلاوت (۲) کتاب اللہ کی تعلیم
(۳) حکمت ودانائی کی تعلیم۔ (۴) تزکیۂ اخلاق۔

اِن چاروں مقاصد کے بارے میں جب بندہ نے تقریر میں چند نکات کی وضاحت کی:

(۱) بندہ نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تلاوت قرآن کو تعلیم کتاب سے الگ کر کے آپ ﷺ کی بعثت کا ایک مستقل مقصد قرار دیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی صرف تلاوت بھی ایک عظیم مقصد ہے، آپ ﷺ نے اس کا طریقہ بتایا ہے، اور اس کی بنیاد پر تجوید وقرأت کے عظیم علوم وجود میں آئے ہیں، لہٰذا جو لوگ قرآن کریم کی صرف تلاوت کو بے مقصد سمجھتے ہیں، اور بچوں کو حفظ کرانے کو طوطا مینا کی طرح رٹانے سے تعبیر کرتے ہیں، اس آیت سے ان کی تردید ہوتی ہے۔

(۲) آپ ﷺ کو کتاب اللہ کا معلم بنا کر بھیجا گیا، ظاہر ہے کہ آپ ﷺ نے کتاب اللہ کی یہ تشریح اور تعلیم ان صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کے سامنے فرمائی جو عربی زبان

کے پہلے سے ماہر تھے، اور انہیں قرآن کا ترجمہ سمجھنے کیلئے کسی معلم کی ضرورت نہیں تھی، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کا صرف ترجمہ جان لینا کافی نہیں، اور آنحضرت ﷺ کی تعلیم وتشریح کے بغیر قرآن کریم کا صحیح منشاء نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ صرف قرآن کریم کے ترجمہ کے بل پر قرآن کریم سے احکام مستنبط کرنے کی کوشش کرتے اور آنحضرت ﷺ کی تشریحات کو نظر انداز کرکے اسے من مانے معنی پہناتے اور اس کا نام اجتہاد رکھتے ہیں، یہ آیت کریمہ ان کی واضح تردید کررہی ہے۔

(۳) کتاب اللہ کے ساتھ آپ ﷺ کو حکمت ودانائی سکھانے کا بھی فریضہ سونپا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ حقیقی حکمت ودانائی وہ ہے جو قرآن وسنت نے سکھائی ہے، قرآن وسنت سے بے نیاز ہوکر ہر معاملے میں نری عقل کا استعمال حکمت ودانائی نہیں ہے۔

(۴) کتاب وحکمت کی تعلیم کو بھی اللہ تعالیٰ نے کافی نہیں سمجھا، بلکہ اس بعد آپ ﷺ کا ایک اور فریضہ ”تزکیہ“ بیان فرمایا گیا ہے، یعنی صرف کتابی تدریس اصلاح خلق کیلئے کافی نہیں سمجھی گئی، بلکہ اس کے ساتھ عملی تربیت کے ذریعہ اخلاق باطنہ کی اصلاح کو ضروری سمجھا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک صاحب علم کو صرف ظاہری علوم کی تحصیل پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے، بلکہ اس کے ساتھ تزکیہ اخلاق کیلئے کسی مربی کی طرف رجوع کرنا بھی ضروری ہے۔

(۵) پانچواں نکتہ میں نے یہ عرض کیا کہ آنحضرت ﷺ کے یہ چار مقاصد بعثت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے پانچ مرتبہ جمع غائب کی ضمیر ھم استعمال فرمائی ہے جس کے براہِ راست مصداق صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم ہیں، انہی کی براہ راست تعلیم وتربیت کیلئے آنحضرت ﷺ کو مبعوث فرمایا گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے ان مقاصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے یا نہیں؟ دوسرے الفاظ میں جن صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیئے اور جن کے اخلاق سدھارنے کیلئے آپ ﷺ مبعوث ہوئے تھے، ان کو کتاب وحکمت کا علم حاصل ہوا یا نہیں؟ اور ان کے اخلاق پاک صاف ہوئے یا نہیں؟ اگر نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی آخر الزماں ﷺ جن کے بعد

کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، اپنے ان مقاصد کے حصول میں (معاذ اللہ) ناکام رہے جن کے لئے آپ ﷺ کو قیامت تک کیلئے اور پوری دنیا کے لئے ذریعہ ہدایت بنا کر بھیجا گیا تھا، اور جن کا ذکر قرآن کریم نے چار مقامات پر بڑے اہتمام کے ساتھ فرمایا ہے اور اگر آپ ﷺ ان مقاصد میں کامیاب رہے، اور یقیناً کامیاب رہے، تو یہ ماننا پڑے گا کہ جن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ کی براہ راست تعلیم و تربیت کا شرف حاصل ہوا، وہ کتاب و حکمت کے علوم کے امین بھی ہیں، اور ان کے اخلاق و اعمال و تزکیہ کے معیار مطلوب پر بھی پورے اترتے ہیں، لہٰذا ان کا تقدس و احترام اور انہیں اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ سمجھنا اس آیت کریمہ کا منطقی تقاضہ ہے، اور ان کی بے توقیری یا ان کی شان میں ادنی گستاخی آنحضرت ﷺ کے معیار و تعلیم و تربیت پر حرف زنی کے مترادف ہے۔

(۶) آخر میں نے عرض کیا کہ دینی مدارس بفضلہ تعالیٰ انہی چار مقاصد کے کام کو جاری رکھنے کیلئے قائم ہوتے ہیں، ان میں جزوی طور پر قابل اصلاح امور ہو سکتے ہیں، اور ہیں، لیکن ان کو بحیثیت مجموعی مطعون کرنا اور ان کے خصوصی مقاصد پر حرف گیری اس آیت کریمہ کے بالکل خلاف ہے۔

انہی چھ نکات کو بندہ نے قدرے وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ایک گھنٹے میں بیان کیا۔ مولانا محمد قاسم صاحب نے فارسی زبان میں تقریر کے ترجمہ کا حق ادا کیا۔ موضوع اگرچہ علمی تھا، اور عمومی جلسوں کیلئے قدرے خشک، لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اُسے عام فہم بنانے کی کوشش کی گئی اور مجمع نے اُسے ہمہ تن گوش ہو کر سنا، بعد میں استاذ عدنان درویش میرے پاس آئے، اور کہنے لگے کہ میں نے اپنے ایک ایرانی شاگرد سے کہا تھا کہ وہ آپ کی تقریر کے ساتھ ساتھ مجھے عربی میں ترجمہ بتاتے رہیں، اور میں بلا تکلف عرض کرتا ہوں کہ میری تقریر بھی اسی آیت پر تھی، لیکن جو نکات آپ نے بیان کئے، میں ان تک نہ پہنچ سکا تھا۔ بالخصوص اس آیت سے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم کی تعدیل پر جو استدلال آپ نے کیا، وہ بڑا موثر اور منفرد استدلال تھا۔ **فالحمدللہ علی توفیقہ۔**

میرے بعد مولانا فضل الرحمٰن صاحب اور مولانا عبدالحمید صاحب کی تقریریں ہوئیں اور پھر

پورے مجمع میں وہیں نماز جمعہ ادا کی جس کے بعد دستار بندی اور دعا کا اختتام ہوا۔

جو حضرات علماء کرام دور دور سے آئے ہوئے تھے، اور مجمع کے ہنگامے میں انہیں بندے سے ملاقات کا موقع نہ مل سکا تھا، ان کی طرف سے فرمائش آئی تھی کہ منتخب افراد پر مشتمل ایک خصوصی اجتماع رکھا جائے، جس میں ان حضرات سے تبادلۂ خیال اور سوالوں کے جوابات کا بھی موقع ملے، اور ان کی خواہش یہ تھی کہ وہ بندے سے اجازتِ حدیث حاصل کریں۔ چنانچہ اس غرض کیلئے مغرب کے بعد وقت طے ہوا، لیکن غلطی یہ ہوئی کہ اس کا اعلان جلسہ کے مجمع عام میں کردیا گیا۔ نتیجہ یہ کہ جب میں مغرب کے بعد اس مسجد میں پہنچا جہاں یہ اجتماع طے ہوا تھا تو مجمع کا پھر وہی عالم ہوگیا، مسجد کا پورا ہال بھر گیا، ایسے میں وہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ مولانا عبدالحمید صاحب نے مجبوراً مجھ سے کہا کہ اب آپ کوئی نصیحت ہی کردیں۔ بندے نے حضرات علماء کی خواہش کے احترام میں اپنی نااہلی کے باوجود انہیں حدیث مسلسل بالأولیۃ کی اجازت دی، اور اسی پر کچھ بیان بھی کیا جو عشاء تک جاری رہا۔

عشاء کے بعد ہوٹل میں بھی ملنے والوں کا سلسلہ جاری رہا۔ استاذ عدنان درویش شام کے نوجوان عالم ہیں جنہوں نے کچھ عرصہ قبل ”بدائع الصنائع“ کو اپنی تخریج وتحقیق کے ساتھ شائع کیا ہے، وہ زاہدان کے قیام میں بار بار یہ خواہش ظاہر کرتے رہے تھے کہ مجھے آپ سے بالواسطہ تو اجازت حدیث حاصل ہے، لیکن میری مدت کی تمنا ہے کہ براہ راست اجازت حدیث حاصل ہو، نیز کچھ فقہی مسائل پر بھی آپ سے بات کرنی ہے۔ عشاء کے بعد بھی وہ تشریف لائے، انہیں بندے نے اجازت حدیث دی اور متعدد فقہی مسائل پر گفتگو جاری رہی۔

مولانا محمد قاسم صاحب ماشاء اللہ ہمارے دارالعلوم کے ان فضلاء میں سے ہیں جن پر دارالعلوم فخر کرسکتا ہے، بقول مولانا عبدالحمید صاحب وہ دارالعلوم زاہدان کی روح رواں ہیں، اور انہوں نے مدرسہ کا تعلیمی اور تحقیقی معیار بلند کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان کی

خواہش پر اگلے دن ناشتہ اُن کے مکان پر ہوا جو دارالعلوم زاہدان سے بالکل متصل ہے، اور اس کے بعد انہوں نے دارالعلوم کے مختلف شعبوں کا معائنہ کرایا، اور یہ دیکھ کر دل باغ باغ ہوا کہ ماشاء اللہ اس ادارے نے نہ صرف ایران بلکہ بیرونِ ایران کے مسلمانوں اور طلبہ کی ضروریات کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لے کر ان کی تکمیل کیلئے مختلف شعبے قائم کئے ہیں۔ مدرسہ کا کتب خانہ بھی ماشاء اللہ بڑا وسیع اور جدید سہولیات سے آراستہ ہے، اس کا شعبہ تالیف وترجمہ اب تک بہت سی کتابیں شائع کر چکا ہے جن میں میری متعدد کتابوں کے ترجمے بھی شامل ہیں۔ طالبات کی تعلیم کا الگ انتظام ہے، اور ایک شعبہ مختلف سماجی خدمات کیلئے مختص ہے، اور ایک شعبہ جس کی کسی اور دینی مدرسہ میں کوئی نظیر میرے علم میں نہیں، ایسا ہے جو کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ کو اقامت گاہیں فراہم کرتا ہے، اور اس کے ذریعہ انہیں مختلف دینی، دعوتی اور اصلاحی پروگراموں میں شرکت کے مواقع حاصل ہوتے ہیں، اور جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی دینی ذہن سازی کا کام اس شعبے کے ذریعے انجام دیا جارہا ہے۔ دوسرے دینی مدارس کیلئے اس طرح کا کام یقیناً قابل تقلید ہے۔

مشہد میں

اسی روز ساڑھے گیارہ بجے دوپہر کی پرواز سے ہم مشہد کیلئے روانہ ہوئے، اور تقریباً ایک بجے مشہد پہنچے جو صوبۂ خراسان کا دارالحکومت ہے۔ اس شہر کا یہ نام تو غالباً صفوی دور میں حضرت علی بن موسیٰ الرضا رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کی وجہ سے رکھا گیا، ورنہ اس سے پہلے یہ شہر طوس کے نام سے معروف تھا، بلکہ طوس دو قریبی شہروں طابران اور توقان کے مجموعے کو کہتے تھے۔ یہ علاقہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں فتح ہوا تھا اپنے عہد شباب میں طوس کا شہر اپنی تمدنی سہولیات کے لحاظ سے بھی ایک شاندار شہر سمجھا جاتا تھا، علم وفضل کا مرکز ہونے کے لحاظ سے بھی، اور سیاسی اعتبار سے بھی اس کی بڑی اہمیت تھی۔ یہاں سے بڑے نامور اہل علم وفضل پیدا ہوئے جن میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ سب سے زیادہ نمایاں ہیں، ان کے علاوہ یہی شہر نظام الملک طوسی رحمۃ اللہ علیہ کا وطن ہے جنہیں علم وفضل

اور سیاست وحکومت دونوں میں تاریخ کی ایک مثالی شخصیت مانا گیا ہے۔ وہ ملک شاہ سلجوقی کے وزیر تھے، لیکن ملک شاہ نے سلطنت کا سارا کاروبار انہی کے ہاتھ میں دیا ہوا تھا۔ نظام الملک رحمۃ اللہ علیہ نے ایک طرف سلطنت کو رونق ووسعت دی اور امن وامان اور نظم ونسق کی ایک مثال قائم کی، دوسری طرف سلطنت کا کوئی شہر ایسا نہیں تھا جہاں ان کا تعمیر کردہ مدرسہ موجود نہ ہو۔ نظام الملک طوسی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جائیدادوں کا دسواں حصہ بھی تعلیم کے مصارف پر وقف کردیا تھا۔

خلاصہ یہ کہ طوس اسلامی تاریخ کا بہت بڑا مرکز رہا ہے، ہمارے پاس چونکہ وقت کم تھا، اس لئے ہم ایئرپورٹ سے ہوٹل جانے کے بجائے پہلے سیدھے طوس کے قدیم شہر طابران کی طرف چلے گئے جہاں قدیم تاریخ کے کچھ آثار ابھی تک باقی ہیں۔ جب ہم اس شہر کے قدیم علاقے میں داخل ہوئے تو ہمیں ایک برج نما عمارت نظر آئی جو یہاں “ہارونیہ” کے نام سے مشہور ہے۔ اور عام لوگوں میں اس کے بارے میں یہ روایت زبان زد ہے کہ یہ عمارت ہارون الرشید نے قید خانے کے طور پر بنائی تھی، اور غالباً سیاسی قیدیوں کو یہاں قید تنہائی میں محبوس رکھا جاتا تھا۔ لیکن جب ہم اس عمارت میں داخل ہوئے تو وہاں محکمۂ آثار قدیمہ کی طرف سے ایک تحریر دیکھی جس میں اس روایت کی تردید کی گئی تھی، یوں بھی عمارت اتنی پرشکوہ اور شاندار ہے کہ اُسے “قید خانہ” قرار دینا بعید معلوم ہوتا ہے۔ اسی عمارت کے باہر ایک قبر نما فصیل بنی ہوئی ہے جس پر امام غزالیؒ کے نام کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ وہ یہاں قیام فرماتے تھے، عوام میں یہ بھی مشہور ہے کہ یہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر ہے لیکن یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ یہ عمارت قید خانہ کے بجائے کسی خانقاہ کے طور پر بنائی گئی ہو، اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں جو ثابت ہے کہ وہ آخر میں عزلت نشین ہوگئے تھے، تو انہوں نے اسی کو اپنا گوشۂ عزلت قرار دیا ہو۔ ہمارے ساتھ خراسان کے کچھ علماء تھے، انہوں نے بتایا کہ درحقیقت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر ایک اور جگہ واقع ہے جو یہاں سے کچھ فاصلہ پر ہے۔

ہم یہاں سے آگے چلے تو ایک مقام پر فارسی کے مشہور شاعر فردوسی کا مزار نظر آیا۔ یہی وہ فردوسی ہیں جن کا ''شاہنامہ'' ایران کی فتوحات کا منظوم تذکرہ ہے اور فارسی ادب کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔

اس مزار سے مزید آگے بڑھ کر قدیم شہر کی فصیل ٹوٹی پھوٹی شکل میں نظر آتی ہے، اور اس کے درمیان کچھ بلند عمارتوں کے کھنڈر اُن کے عہد جوانی کے شکوہ کی گواہی دے رہے ہیں۔ اس قدیم فصیل سے باہر نکل کر ایک میدان ہے، اور اسی میدان میں ایک بوسیدہ قبر کے آثار نظر آتے ہیں، اور اس کے کنارے پر ایک کتبہ پڑا ہوا ہے جس پر لکھا ہے کہ یہ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کی قبر ہے۔ اب اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں کہ یہ بات کہاں تک صحیح ہے؟ لیکن ان کے سوانح نگاروں (مثلاً علامہ سبکی رحمتہ اللہ علیہ) نے جو لکھا ہے کہ ان کی قبر شہر طابران کے باہر کے میدان میں واقع ہے، اس کے پیش نظر یہ جگہ ہارونیہ کے مقابلہ میں زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔

بہر کیف! یہاں پہنچ کر امام غزالی (۱) رحمتہ اللہ علیہ کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ وہ ۴۵۰ھ میں اسی شہر میں پیدا ہوئے، اور ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی، پھر یہاں سے جرجان جا کر امام نصیر اسماعیلی سے علم حاصل کیا، اور ان کی تقریریں ضبط کر کے واپس آئے۔ اپنی تقریروں کے بارے میں ان کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ راستے میں ڈاکوؤں نے حملہ کر کے ان کا سارا مال و اسباب چھین لیا جس میں تقریریں بھی داخل تھیں۔ امام صاحبؒ نے ڈاکوؤں کے سردار سے التجا کی وہ اور سب کو رکھ لے، مگر تقریروں کا یہ مجموعہ انہیں واپس کر دے جو اس کے کسی کام کا نہیں ہے۔ اس نے وجہ پوچھی تو امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ

ان کی نسبت غزّالی (زاء پر تشدید کے ساتھ) اور غزالی (بغیر تشدید کے) دونوں طرح پڑھی گئی ہے۔ پہلی صورت نے یہ نسبت ان کے والد کے پیشہ کی طرف ہے کہ وہ سُوت کی تجارت کرتے تھے، اور دوسری صورت میں (علامہ سمعانیؒ کے قول کے مطابق) غزالی اس گاؤں یا محلے کا نام تھا جہاں وہ پیدا ہوئے لیکن بیشتر محققین نے پہلی بات کو زیادہ ترجیح دی ہے۔

نے بتایا کہ میں نے مدت تک اپنا وطن چھوڑ کر جو علم حاصل کیا ہے، وہ انہی تقاریر میں محفوظ ہے۔ اس پر ڈاکوؤں کے سردار نے ان کا مذاق اُڑایا کہ وہ علم کیا ہوا جو ان کاپیوں میں مقید ہے، کاپیاں گئیں تو تمہارا علم بھی گیا! یہ کہہ کر اس نے وہ کاپیاں تو لوٹا دیں، لیکن اس کا یہ جملہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑ گیا، خود فرماتے ہیں کہ:

هذا مستنطق أنطقه الله ليرشدني به في أمرى، فلما وافيت طوس أقبلت على الاشتغال ثلاث سنين حتى حفظت جميع ماعلقته، وصرت بحيث لو قطع عليّ الطريق لم أتجرد من علمي.

(طبقات الشافعیہ للسبکی۔ ص ۱۰۳ ج ۴)

> ”اس شخص سے یہ جملہ اللہ تعالیٰ نے میری ہدایت کیلئے کہلوایا تھا، چنانچہ میں طوس پہنچ کر تین سال تک ان تقاریر کو یاد کرنے میں لگا رہا، یہاں تک کہ میں نے وہ ساری تقاریر اس طرح یاد کرلیں کہ اگر اب مجھ پر ڈاکہ پڑے تو میں علم سے کورا نہ رہ جاؤں۔“

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں علم و فضل کا وہ مقام بخشا کہ بڑے بڑوں کی گردنیں ان کے آگے خم ہوئیں، تدریس ہو یا تصنیف، ہر میدان میں اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ تجدیدی کام لیا جو بہت کم لوگوں کو میسر آتا ہے، نظام الملک کی قدردانی سے وہ اعلیٰ درجہ کے عہدوں اور مناصب پر بھی پہنچے، لیکن بالآخر تمام عہدوں اور مناصب کو ترک کر کے مجاہدہ اور ریاضت کی زندگی اپنائی اور اسی دوران احیاء العلوم جیسی عظیم کتاب تالیف کی۔ تہافت الفلاسفہ کے ذریعہ یونانی فلسفے کی دھجیاں بکھیریں اور فقہ، اُصولِ فقہ، عقائد، کلام اور تصوف میں اپنی تالیفات کا وہ ذخیرہ چھوڑ گئے جس سے آج کوئی طالب علم مستغنی نہیں ہوسکتا، علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مستند شخص سے نقل کیا ہے کہ اس نے حساب لگایا کہ اگر ان کی زندگی

کے ایام کو اُن کے لکھے ہوئے صفحات پر تقسیم کیا جائے تو ایک دن میں سولہ صفحات لکھنے کا اوسط نکلتا ہے۔ (الغزالی: شبلی نعمانی، ص ۳۷)

امام غزالی کے بھائی احمد ابو الفتوح الغزالی رحمۃ اللہ علیہ بھی بڑے درجہ کے اولیاء اللہ میں سے ہیں، انہوں نے اپنے بھائی کی وفات کا واقعہ یہ نقل کیا ہے کہ فجر کی نماز کے بعد انہوں نے اپنا کفن اٹھایا اور اسے آنکھوں پر رکھ کر فرمایا "بادشاہ کی خدمت میں حاضری کیلئے سر تسلیم خم ہے" اس کے بعد لیٹے اور طلوع آفتاب کے بعد انتقال ہوگیا۔

(طبقات الشافعیہ۔ ص ۱۰۶۔ ج ۴)

طوس سے واپس آ کر ہم ہوٹل قصر میں پہنچے جو حضرت علی الرضا رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے قریب واقع تھا اور اسی میں ہمارے قیام کا انتظام تھا۔ عصر تک ہم نے یہاں آرام کیا، ہمارے رفقاء نے بتایا کہ نیشا پور یہاں سے صرف ۱۰۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے، اور وہاں تک موٹر وے بڑی صاف ہے، اس لئے ہم نے عصر کے بعد نیشا پور جانے کا ارادہ کر لیا اور مغرب کے قریب نیشا پور پہنچ گئے۔

نیشا پور میں

نیشا پور عالم اسلام کے ان عظیم شہروں میں سے ہے جس کی خاک سے اتنی بڑی تعداد میں اہل علم و فضل پیدا ہوئے ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے۔ یہ شہر اپنی آب و ہوا، قدرتی وسائل اور زرخیزی کیلئے بھی دنیا بھر میں مشہور تھا۔ یہاں کی زمین میں ایک قسم کی مٹی ہوتی تھی جسے لوگ کھاتے تھے اور وہ بادشاہوں کیلئے تحفہ کے طور پر بھیجی جاتی تھی، اسے "نقل" کہا جاتا تھا، اس کے علاوہ یہاں فیروزہ پتھر بھی بڑی تعداد میں نکلتا تھا۔ (آثار البلاد للقزوینی۔ ص ۴۷۳)

جو مشاہیر اس شہر میں پیدا ہوئے، اُن کے صرف نام گنوانا بھی اس سفرنامہ میں ممکن نہیں، لیکن ان میں نمایاں ترین نام امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جن کی صحیح مسلم ...... صحیح بخاری کے بعد حدیث کی سب سے مستند کتاب تسلیم کی گئی ہے۔ خود امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مدتوں

یہاں درس دیا ہے۔ اس کے علاوہ محدثین میں سے امام حاکم صاحب مستدرک رحمۃ اللہ علیہ اور امام بیہقی، صاحب السنن رحمۃ اللہ علیہ، مفسرین میں سے امام ابو منصور ثعالبی رحمۃ اللہ علیہ (صاحب تفسیر الثعالبی وفقہ اللغہ) اور امام واحدی رحمۃ اللہ علیہ (صاحب اسباب النزول وشرح دیوان المتنبی) فقہاء میں امام الحرمین الجوینی رحمۃ اللہ علیہ، صوفیاء کرام میں ابوالقاسم قشیری (صاحب الرسالۃ القشیریۃ)، ابوعلی الدقاق رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ، حکماء اور شعراء میں عمر خیام، سب اسی خطے میں پیدا ہوئے ہیں۔ نظام الملک طوسی رحمۃ اللہ علیہ نے بغداد سے پہلے نیشاپور میں مدرسہ نظامیہ کی بنیاد ڈالی تھی اور یہاں کا مدرسہ نظامیہ اپنے معیارِ تعلیم کے لحاظ سے مثالی مدرسہ سمجھا جاتا تھا جس میں پڑھنا اور پڑھانا بڑے اعزاز کی بات تھی۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں بھی درس دیا ہے اور آخر عمر میں نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ میں بھی۔ امام الحرمین الجوینی رحمۃ اللہ علیہ (جن کا پورا نام عبدالملک بن عبداللہ ابوالمعالی ہے) نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ کے صدر المدرسین تھے، جوین کے نام سے ایک بستی نیشاپور کے مضافات میں اب بھی موجود ہے جہاں وہ پیدا ہوئے تھے، بعد میں وہ چونکہ چار سال مکہ مکرمہ میں رہے اور مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ دونوں مقدس شہروں سے ان کے پاس استفتاء آتے تھے اور ان کا فتویٰ دونوں جگہ مانا جاتا تھا، اس لئے انہیں امام الحرمین کا لقب دیا گیا، جو ان کے نام سے زیادہ مشہور ہوگیا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ابتدائی عمر میں ان سے مدرسۂ نظامیہ ہی میں درس لیا ہے۔

(ان کے حالات کیلئے دیکھئے البدایۃ والنہایۃ۔ ص ۹۵، ج ۱۲ اور طبقات الشافعیہ جلد ۳۔)

مقامِ حسرت یہ ہے کہ اس شہر میں جسے بجا طور پر مدینۃ الرجال کہنا چاہئے اب ان بزرگوں کے آثار باقی نہیں رہے، مشاہیر میں صرف خواجہ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ اور عمر خیام کے مزارات اہتمام سے باقی رکھے گئے ہیں، ہم جب نیشاپور میں داخل ہوئے تو مغرب کا وقت ہو رہا تھا اور نماز پڑھنے کی فکر تھی، اتفاق سے نماز کیلئے جو قریب ترین جگہ ملی،

وہ شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کا احاطہ تھا۔ مزار کے ارد گرد ایک خوبصورت باغ ہے،، ہم نے باغ میں نمازِ مغرب ادا کی اور اس کے بعد حضرت شیخ کے مزار پر سلام عرض کیا۔

حضرت شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ وہی ہیں جن کی کتاب ''پند نامہ'' ہم نے بالکل بچپن میں درساً پڑھی تھی اور جس کے یہ اشعار بھلائے نہیں بھولتے ؎

پادشاہا، جرمِ مارا درگذار
ما گنہگاریم وتو آمرزگار
تو نکو کاری وما بد کردہ ایم
جرم بے انداز و بے حد کردہ ایم
بردر آمد بندۂ بگریختہ
آبروئے خود زعصیاں ریختہ
بے گنہ نگذشت برمن ساعتے
باحضورِ دل نہ کردم طاعتے

یہ سادہ مگر دل سے نکلے ہوئے اشعار کچھ ایسی تاثیر رکھتے ہیں کہ ملتزم پر حاضری کے وقت بکثرت زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔

حضرت عطار رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت غالباً ۵۱۳ھ میں ہوئی۔ ان کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ وہ دواؤں کے ایک کارخانے کے مالک تھے، ایک مرتبہ وہ اپنے کاروبار میں مشغول تھے کہ ایک فقیر نے آ کر صدا لگائی، یہ کام میں مصروف رہے اور اس کی طرف توجہ نہ کی، اس نے بار بار صدا لگائی خواجہ عطار رحمۃ اللہ علیہ اس وقت متوجہ ہوئے تو فقیر نے کہا کہ ''تمہاری جان کیسے نکلے گی؟'' خواجہ عطار رحمۃ اللہ علیہ نے جھنجھلا کر کہا: ''جیسے تمہاری جان نکلے گی۔'' اس پر فقیر نے اپنا کاسہ زمین پر رکھا اور اس پر لیٹتے ہوئے کہنے لگا ''میری جان تو اس طرح نکلے گی اور یہ کہہ کر اس نے کلمہ پڑھا اور اس کی روح پرواز کر گئی۔'' اس

واقعہ سے خواجہ عطار رحمۃ اللہ علیہ پر اتنا اثر پڑا کہ انہوں نے کاروبار چھوڑ کر درویشی اختیار کرلی اور حضرت رکن الدین آکاف رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں کئی سال رہے اور بالآخر حضرت شیخ مجد الدین بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ (یہ روایت مولانا جامی نے نفحات الانس میں بھی ''کہتے ہیں'' کے الفاظ سے نقل کی ہے۔ (حیات صوفیہ ترجمہ نفحات۔ ص۷۳۸)۔

یہ روایت کتنی مستند اور صحیح ہے؟ اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، لیکن اللہ تعالیٰ بعض اوقات کسی شخص کو ''اللہ یجتبی الیہ من یشاء'' کے اصول کے تحت ہدایت کرنے کیلئے کوئی غیبی لطیفہ بھیج دیتا ہے، جیسا کہ حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بھی ایسا ہی ہوا، اس لئے اگر خواجہ عطار رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بھی اس قسم کا کوئی واقعہ پیش آیا ہو تو بعید نہیں۔ حضرت عطار رحمۃ اللہ علیہ نے طویل عمر پائی، اور تاتاریوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ ان کی جلالت قدر کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ (صاحب مثنوی) ان کے بارے میں فرماتے ہیں؎

ہفت شہر عشق را عطارؒ گشت
ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

اور ؎

عطارؒ روح بود سنائیؒ دو چشم او
مادر پس سنائیؒ و عطارؒ آمدیم

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ بلخ جاتے ہوئے راستے میں خواجہ عطار رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت کی غرض سے نیشاپور رُکے تھے اور ان سے استفادہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے اس ولی کا کیا مرتبہ ہوگا؟ ہم جیسوں کو اس کا ادراک کیسے ہوسکتا ہے، لیکن ایک بات مجھ جیسے بے حس شخص نے بھی محسوس کی اور وہ یہ کہ جہاں خواجہ عطار رحمۃ اللہ علیہ آرام فرما ہیں، وہاں ایک

ایسی سکینت، طمانیت اور سرور کا عالم طاری ہے جو بہت کم جگہوں پر کبھی دل کو محسوس ہوا ہے۔ اس کو بھی شیخ عطار رحمتہ اللہ علیہ کی کرامت ہی کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ شیعہ حضرات (غلط طور پر) انہیں شیعہ سمجھتے ہیں اور شاید اسی لئے ان کا مزار اہتمام کے ساتھ باقی رکھا گیا ہے، لیکن ان کے مزار پر وہ بدعات وخرافات نظر نہیں آتیں جو ایران میں دوسرے مزارات پر نظر آتی ہیں۔ (واضح رہے کہ ان کی طرف شیعیت کی نسبت بالکل غلط ہے، جیسے خود ان کی کتاب ‘تذکرۃ الاولیاء’ میں حضرت امام جعفر صادق رحمتہ اللہ علیہ کے حالات اور حضرات خلفائے ثلاثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مدح میں ان کے اشعار پڑھنے سے واضح ہوتا ہے۔ البتہ انہوں نے حضرات اہل بیت سے خصوصی محبت کا اظہار کیا ہے جو ہر مسلمان کا جزوِ ایمان ہے)۔

حضرت خواجہ عطار رحمتہ اللہ علیہ کے مقبرے کی دیوار پر یہ اشعار لکھے ہیں، جو معلوم نہیں شیخ عطار رحمتہ اللہ علیہ ہی کے ہیں یا کسی اور کے، مگر مقبرے کی آواز ہونے کے لحاظ سے بڑے مؤثر اشعار ہیں ؎

گرت درجام دل خونیست برخیز
زچشم خوں فشاں برحال ماریز
کہ بعد از ما عزیزانِ وفادار
بہ حال مافروگویند بسیار
کنند از دل بہ سوئے ما خطابے
ولے از گورِما ناید جوابے
لبے خونہا بخوردند وبہ رفتند
بے درد وغصہ زیر حال خفتند

ہم نے عشاء کی نماز بھی حضرت خواجہ عطار رحمتہ اللہ علیہ کے مزار سے متصل باغ میں ادا کی اور اس کے بعد وہاں سے روانہ ہوئے۔ راستے میں عمر خیام کا مزار بھی ملا جن کی

رباعیات فارسی ادب کا قیمتی سرمایہ سمجھی جاتی ہیں۔ ان کی حکمت وفلسفہ کا بھی بڑا شہرہ ہے، اوران کے عقائد واعمال کے بارے میں متعارض باتیں مشہور ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا، نیشاپور کے دوسرے مآثر کا تو بیج مارا جاچکا ہے، لیکن خیال یہ ہوا کہ جب یہاں حاضری ہوئی تو کچھ دیر اس کی فضا ہی میں چکر لگالیں۔ نہ جانے کتنے اللہ والوں کے انفاسِ قدسیہ اور ان کے اذکار کی مہک ان فضاؤں میں محفوظ ہوگی، (آج تو سائنس بھی کہتی ہے کہ منہ سے نکلنے والی کوئی آواز فنا نہیں ہوتی، بلکہ فضا میں محفوظ رہتی ہے) چنانچہ ہم نیشاپور کے قدیم علاقے میں گئے، خیال یہ بھی تھا کہ کسی قدیم قبرستان میں پہنچ جائیں اور وہاں کے باسیوں کو سلام عرض کرکے کچھ ایصالِ ثواب کردیں، نیشاپور کے اس سفر میں خراسان کے تین علماء مولانا شہاب الدین شہیدی (فاضل دارلعلوم کراچی)، مولانا عبداللہ موحدی اور مولانا حبیب الرحمٰن مظہری بھی ہمارے ساتھ تھے، انہوں نے بعض جاننے والوں سے پوچھ کر ہمیں ایک قدیم قبرستان کا پتہ بتایا اور ساتھ ہی یہ بھی کہ شاید امام مسلم رحمتہ اللہ علیہ کی قبر بھی اسی قبرستان میں ہے۔ یہ جدید شہر کے باہر ایک قدیم اور دور تک پھیلا ہوا قبرستان تھا جس کے سرے پر ایک مقبرہ ''فضل بن شاذان'' کے نام سے بنا ہوا ہے۔ ''فضل بن شاذان'' کی شخصیت اس لحاظ سے متنازعہ ہے کہ شیعہ حضرات انہیں شیعہ کہتے ہیں، بعض اہلسنت انہیں سنی قرار دیتے ہیں، اور حشویہ انہیں اپنا ہم مسلک مانتے ہیں۔
(دیکھئے فہرست ابن الندیم۔ ص ۳۸۱ دارالکتب العلمیہ بیروت)

ان کی طرف بہت سی کتابیں منسوب ہیں جن میں سے بعض شیعہ مسلک کے مطابق ہیں اور بعض اہلسنّت کے مطابق۔

(معجم رجال الحدیث للسید ابی القاسم الخوئی، مطبوعہ قم، ص ۲۹۱، ج ۳)۔

بہرحال! اس قدیم قبرستان میں غالباً عصر قدیم کے علماء واولیاء کے بھی مزارات ہوں گے اور کچھ بعید نہیں کہ امام مسلم رحمتہ اللہ علیہ بھی یہیں آرام فرما ہوں، واللہ اعلم۔ اس قبرستان کے پاس چھوٹا سا پارک تھا، ہمارے رفقاء مولانا رشید اشرف صاحب، مولانا محمد

قاسم صاحب، مولانا عبدلقادر عارفی، مولانا عبدالہادی، خراسان کے مولانا شہاب الدین شہیدی، مولانا عبداللہ موحدی اور مولانا حبیب الرحمٰن مظہری نے مل کر اصرار کیا کہ نیشاپور محدثین کا شہر رہا ہے۔ لہٰذا تبرکاً یہاں اس پارک میں بیٹھ کر آپ ہمیں کوئی حدیث سنا دیں۔ مولانا محمد قاسم صاحب نے تجویز پیش کی کہ انہیں حدیث مسلسل بالمصافحہ سنا کر اس کی اجازت دے دی جائے، چنانچہ بندہ نے حصولِ برکت کیلئے ان کی خواہش کی تعمیل کی اور حدیث مسلسل بالمصافحہ سنا کر سب سے مصافحہ کیا اور ان حضرات کو اس کی اجازت دی۔

نیشاپور کا یہ سفر اتنا پُر کیف اور خوشگوار تھا کہ کئی روز کی مسلسل تھکن کے باوجود طبیعت پر کیف ونشاط کا عجیب عالم طاری رہا اور رات گئے ہم مشہد واپس پہنچے۔

اگلی صبح فجر کے متصل بعد حضرت علی الرضا رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری ہوئی جو ہمارے ہوٹل کے قریب واقع تھا۔ یہ جگہ سناآباذ کہلاتی تھی۔ طوس کی مضافاتی بستی تھی۔ ہم نے حضرت علی رضا رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری کیلئے اس وقت کا انتخاب اس لئے کیا تھا کہ اس وقت زائرین کا ہجوم نسبتاً کم ہونے کی توقع تھی اور واقعتہً ایسا ہی ہوا۔ یہ مقبرہ کیا ہے؟ ایک عظیم الشان محل ہے، جس میں مسجد بھی ہے اور حضرت علی رضا رحمتہ اللہ علیہ کا مزار بھی۔

حضرت علی الرضا رحمتہ اللہ علیہ حضرت موسیٰ کاظم رحمتہ اللہ علیہ کے صاحبزادے ہیں (جن کا مختصر تذکرہ میں نے جہانِ دیدہ میں عراق کے سفر کے تحت کیا ہے) آپ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی چھٹی پشت میں آتے ہیں اور ۱۵۱ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے تھے، آپ آنحضرت ﷺ کی اولاد میں ہونے کے شرف کے ساتھ ساتھ بڑے صاحب علم و فضل بزرگ تھے، سنن ابن ماجہ میں ان کی روایت بھی مروی ہے اور حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آپ کی عمر ابھی بیس سال سے کچھ ہی زیادہ تھی کہ آپ مسجد نبوی ﷺ میں فتویٰ دینے لگے تھے۔ البتہ روایت حدیث سے زیادہ اشتغال نہیں رہا اور آپ سے روایت کرنے والے اکثر ضعفاء ہیں۔ (تہذیب التہذیب ص:۳۸۷، ج:۷)۔ مامون الرشید اُن کا بہت معتقد تھا۔ ایک مرتبہ حضرت علی رضا رحمتہ اللہ علیہ کے بھائی زید بن موسیٰ نے بصرہ

میں مامون الرشید کے خلاف بغاوت کر کے وہاں خاصی خونریزی کی تھی، مامون الرشید نے حضرت علی رضا رحمۃ اللہ علیہ کو وہاں بھیجا اور انہوں نے اپنے بھائی کو ملامت کی اور یاد دلایا کہ مسلمانوں میں خونریزی کرنے کی بناء پر آنحضرت ﷺ تم سے ناراض ہوں گے۔ مامون الرشید کو اطلاع ملی تو وہ رو پڑا اور کہا کہ ''اہل بیت ایسے ہوتے ہیں'' مامون الرشید نے آپ کو خراسان آنے کی دعوت دی۔ ۲۰۲ھ میں اپنی بیٹی اُم حبیب کا حضرت علی رضا رحمۃ اللہ علیہ سے نکاح کیا اور اُن کو اپنا ولی عہد بھی مقرر کیا، جس کا واقعہ یہ ہوا کہ اُس وقت خلافت بنوعباس میں چلی آ رہی تھی، اس نے بنوعباس کے تمام لوگوں کو شہر مَرو میں جمع کیا اور وہاں حضرت علی رضا رحمۃ اللہ علیہ کو بھی دعوت دی اور وہاں اعلان کیا کہ تمام موجودہ افراد کے بارے میں غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس وقت خلافت کیلئے حضرت علی رضا رحمۃ اللہ علیہ سے افضل کوئی شخص موجود نہیں ہے۔ چنانچہ اُن کے ہاتھ پر بیعت کی گئی اور ان کا لقب اسی بناء پر ''الرضا'' رکھا گیا اور سیاہ لباس اور سیاہ جھنڈے جو بنی عباس کا شعار سمجھے جاتے تھے، ان کو تبدیل کر کے سبز عمامہ اور سبز جھنڈا اختیار کیا۔ بنوعباس مامون الرشید کے اس اقدام سے سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے مامون الرشید کے خلاف بغاوت بھی کی، مگر مامون الرشید اپنے فیصلے پر قائم رہا، لیکن ابھی مامون زندہ ہی تھا اور حضرت علی رضا رحمۃ اللہ کے خلیفہ بننے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ۲۰۳ھ میں اُن کی وفات ہوگئی۔ بعض لوگوں نے تو یہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے انگور بڑی تعداد میں کھا لیے تھے، جو ان کی بیماری اور بالآخر وفات کا سبب بنے اور بعض حضرات نے خیال ظاہر کیا ہے کہ بنوعباس نے اُن کو زہر دیا تھا، مامون الرشید کو اُن کے انتقال پر سخت صدمہ ہوا اور اُس نے اپنے والد ہارون الرشید کے قریب ایک باغ میں ان کی تدفین کی۔ (وفیات الاعیان لابن خلکان۔ ص: ۲۶۹، ۲۷۰۔ وسیر اعلام النبلاء للذہبیؒ۔ ص: ۳۸۷، ج: ۹)۔ ہارون الرشید کی قبر کا تو بعد میں نشان ہی مٹ گیا، اب کوئی نہیں جانتا کہ اس کی قبر کہاں تھی؟ لیکن حضرت علی رضا رحمۃ اللہ علیہ کی قبر مرجع خاص و عام بن گئی۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ابوبکر محمد بن المؤمل کا یہ قول

نقل کیا ہے کہ:

"خرجنا مع امام اهل الحديث ابی بکر ابن خزيمة وعديله أبی علی الثقفی مع جماعة من مشايخنا، وهم اذ ذاک متوافرون، إلی زيارة قبر علی ابن موسیٰ الرضا بطوس، قال: فرأيت من تعظيمه يعنی ابن خزيمة لتلک البقعة و تواضعه لها وتضرعه عندها ما تحيّرنا. "

> ہم اہل حدیث کے امام ابوبکر بن خزیمہ رحمتہ اللہ علیہ اور اُن کے ہم پلہ محدث ابوعلی ثقفی رحمتہ اللہ علیہ اور اپنے مشائخ کی ایک جماعت کے ساتھ (جو اس زمانے میں کثرت سے زندہ تھے) طوس میں حضرت علی بن موسیٰ الرضا رحمتہ اللہ علیہ کی قبر کی زیارت کیلئے گئے تو میں نے حضرت ابن خزیمہ رحمتہ اللہ علیہ کو اس جگہ کا اتنا احترام اور وہاں اتنی تواضع اور تضرع کا مظاہرہ کرتے دیکھا کہ میں حیران رہ گیا۔"

(تہذیب التہذیب۔ ص:۳۸۸، ج:۷)

لیکن اس وقت اس قبر پر بدعات وخرافات، بلکہ تقریباً شرک کی حد تک اس کی تعظیم کا جو طوفان برپا ہے وہ بعض اوقات رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ صاحبِ مزار ان افعال سے بَری ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس قسم کی حرکتیں اُن کے ساتھ ظلم اور زیادتی کے مترادف ہیں۔ اعاذنا الله منها.

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ حضرت علی بن موسیٰ الرضا رحمتہ اللہ علیہ سے منسوب کر کے متعدد روایات محدثین اہلسنّت نے بھی اپنی کتابوں میں ایسی نقل کر دی ہیں جو منکرات میں شمار کی گئی ہیں۔ حافظ ذہبی رحمتہ اللہ علیہ نے سیر اعلام النبلاء میں اور حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ نے تہذیب التہذیب میں ان روایات پر تنبیہ فرمادی ہے۔

واپس تہرآن اور رے میں

اسی روز دوپہر کو ہم مشہد سے واپس تہران روانہ ہوئے، کیونکہ رات دس بجے ہمیں دبئی کیلئے پرواز کرنا تھا۔ تہران میں چند گھنٹے کے قیام میں ہم چاہتے تھے کہ شہر رے میں بھی حاضری لگادی جائے۔ دراصل تہران تو شہر کا نیا نام ہے، قدیم زمانے میں یہ علاقہ رے ہی کے نام سے مشہور تھا۔ چنانچہ دوپہر کو چند گھنٹے مولانا عبدالہادی صاحب کے مکان پر ان کی مہمان نوازی سے لطف اندوزی اور آرام کے بعد ہم عصر کی نماز پڑھ کراُن کے گھر سے نکلے اور تہران کے مختلف محلوں سے گذرتے ہوئے اُس محلے میں پہنچے جواب بھی رے کہلاتا ہے۔ نیشاپور کی طرح یہ شہر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں فتح ہوا تھا اور اپنے عہد شباب میں دنیا کے مشہور ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا، یہاں سے بھی علم وفضل کے پہاڑ پیدا ہوئے ہیں۔ یہاں کے رہنے والے رازی کہلاتے تھے اور رازی کی نسبت سے جتنے مشاہیر معروف ہیں، سب یہیں کے باشندے تھے۔ محدثین میں امام ابوزرعہ رازی رحمۃ اللہ علیہ، امام ابوحاتم رازی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے صاحبزادے ابن ابی حاتم رازی رحمۃ اللہ علیہ (جن کی کتاب الجرح والتعدیل رجال حدیث میں ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے اور جن کی تفسیر بھی معروف ومشہور ہے)، اسماعیل بن زنجویہ السمان رحمۃ اللہ علیہ، فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہ میں حنفیہ کے امام ابوبکر جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ (صاحب احکام القرآن)، تفسیر اور کلام کے امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ، تصوف کے ائمہ میں حضرت ابراہیم بن احمد الخواص رحمۃ اللہ علیہ، طب اور حکمت میں ابوبکر زکریا رازی رحمۃ اللہ علیہ، یہ تمام حضرات اسی شہر میں پیدا ہوئے تھے اور یہی وہ شہر ہے جسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مایۂ ناز شاگرد امام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ نے آخر میں اپنا مستقر بنایا اور اس میں ان کی وفات ہوئی۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس شہر میں چونکہ جنگیں بہت ہوتی رہتی تھیں، اس لئے لوگوں نے اپنے گھر زمین دوز بنائے ہوئے تھے، علامہ حموی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ میں نے یہ گھر دیکھے ہیں، ان تک پہنچنے کیلئے راستے بڑے تنگ وتاریک رکھے جاتے تھے، تاکہ دشمن انہیں

استعمال کرنے سے گھبرائے۔

یہاں کے پھل بڑے لذیذ ہوتے تھے اور ایک خاص قسم کی مٹی سر دھونے کیلئے اُمراء کو بھیجی جاتی تھی اور کنگھیوں کی صنعت یہاں کی امتیازی خصوصیت سمجھی جاتی تھی۔ اصمعی رحمتہ اللہ علیہ کا یہ مقولہ مشہور ہے کہ

" الرّیّ عروس الدنیا والیه متجر الناس "

یعنی رےّ دنیا کی دلہن ہے اور دنیا بھر کے لوگوں کا تجارتی مرکز۔ (علامہ حمویؒ نے معجم البلدان۔ ص: ۱۱۶ تا ۱۲۲۔ ج: ۳۔ اور قزوینیؒ نے آثار البلاد، ص: ۳۷۵ تا ۳۸۲ میں اس شہر اور اس کے خاص خاص رجال کا مفصل ذکر کیا ہے)۔

نیشاپور کی طرح یہاں بھی مذکورہ بالا بزرگوں کے آثار بالکل مٹ گئے ہیں اور ہم یہ جاننے کے باوجود اس لئے یہاں آئے تھے کہ چند سانس اس فضا میں بھی لے لیں جو کبھی علم وفضل کی صداؤں سے گونجا کرتی تھی۔ اب یہ سارا علاقہ تہران ہی کا ایک حصہ ہے، ہم تلاش کرکے رےّ کے بالکل قدیم علاقے میں پہنچے، یہاں ایک قدیم قبرستان ہے جس کے سرے پر ایک عالیشان مقبرہ بنا ہوا ہے اور ایک بڑی مسجد بھی ہے۔ صاحب مزار کا نام "عبدالعظیم بن عبداللہ الحسنی رحمتہ اللہ علیہ" لکھا ہوا ہے اور کہا جاتا ہے کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی پانچویں پشت کے صاحبزادے ہیں۔ مجھے اہلسنّت کی کتب رجال میں ان کا تذکرہ نہیں مل سکا۔ البتہ رجال شیعہ میں ان کا مفصل تذکرہ موجود ہے ان کو جلیل القدر عالم اور ولی اللہ قرار دیا گیا ہے، لیکن ان کے بارے میں عجیب قسم کی روایات بیان کی گئی ہیں جن میں سے اکثر کو خود مصنفین رجال شیعہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ (دیکھئے معجم رجال الحدیث للخوئی۔ ص: ۴۶، ۴۷۔ ج: ۱۰)

ان کے مقبرے کے ساتھ ہی ایک بڑا قبرستان ہے جو کافی رقبے میں پھیلا ہوا ہے، لیکن حوادثِ روزگار نے تاریخی حقائق و آثار پر دبیز تہیں چڑھادی ہیں اور اس کے سوا کچھ نہیں کہا

جاسکتا کہ ۔

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں

شہر رے کی یہ حسرت آمیز سیاحت ہمارے اس دورۂ ایران کا آخری مرحلہ تھا۔ یہیں سے ہم ایئرپورٹ روانہ ہوئے اور رات ساڑھے دس بجے ہماری واپسی کی پرواز دبئی کیلئے روانہ ہوگئی، جہاں ایک دن ٹھہر کر یکم شعبان المعظم کو بفضلہ تعالیٰ بخیر وعافیت کراچی پہنچے۔

و آخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

نیوزی لینڈ کا ایک سفر

شوال ۱۴۲۶ھ

نومبر 2005ء

نیوزی لینڈ کا ایک سفر

(شوال ۱۴۲۶ھ / نومبر 2005ء)

حمد وستائش اس ذات کیلئے ہے، جس نے اس کارخانہ عالم کو وجود بخشا

اور

درود وسلام اس کے آخری پیغمبر ﷺ پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

الحمدللہ و کفی، وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، امابعد!

نیوزی لینڈ جنوبی بحرالکاہل کے متعدد جزیروں پر مشتمل ایک ترقی یافتہ ملک ہے جو آسٹریلیا سے جنوب مشرق میں ایک ہزار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ چونکہ جنوب میں انٹارکٹیکا تک نیوزی لینڈ کے بعد کوئی اور آبادی نہیں ہے۔ اس لئے اُسے جنوب میں دنیا کا آخری ملک کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ یوں تو اس ملک میں کئی چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی ہیں، لیکن بڑے جزیرے جن پر ملک کی بھاری اکثریت آباد ہے اور جو بڑے شہروں پر مشتمل ہیں، دو ہی ہیں۔ ایک کو شمالی جزیرہ اور دوسرے کو جنوبی جزیرہ کہا جاتا ہے اور ان کے درمیان بیس میل چوڑی آبنائے کُک حائل ہے، چنانچہ شمالی جزیرے سے جنوبی جزیرے کی طرف جانے کیلئے جہاز اور کشتیاں ہی استعمال ہوتی ہیں اور اگر کاروں یا بسوں کے ذریعے سفر ہو تو یہ کاریں اور بسیں بھی جہاز پر سوار ہو کر جنوبی جزیرے میں پہنچتی ہیں، ملک کا کل رقبہ تقریباً ایک لاکھ ساڑھے تین ہزار مربع میل میں پھیلا ہوا ہے، شمالی جزیرے کی ابتداء سے جنوبی جزیرے کی انتہاء تک ملک کی لمبائی ۹۹۵ میل ہے اور مشرق و مغرب کے درمیان

چوڑائی ۲۸۰ میل۔ اس وسیع رقبے میں آبادی کل چالیس لاکھ افراد پر مشتمل ہے، یعنی صرف کراچی شہر کی آبادی کا بھی تقریباً ایک تہائی۔ ملک کا دارالحکومت ویلنگٹن ہے جو شمالی جزیرے کے جنوبی سرے پر واقع ہے اور اس کے علاوہ تین بڑے شہر اور ہیں، آک لینڈ جو ملک کا سب سے بڑا شہر ہے اور کرائسٹ چرچ اور ہملٹن۔

نیوزی لینڈ میں آبادی تو معلوم تاریخ کے مطابق ۱۰۰۰ء سے چلی آتی ہے، یہاں کی مقامی آبادی کو ماوری (Maori) کہا جاتا ہے، یہ گندمی رنگ کی ایک نسل ہے جو اس ملک میں آباد چلی آتی تھی، کہتے ہیں کہ سب سے پہلے ۱۶۴۲ء میں ایک ڈچ جہاز ران نے اس علاقے پر اترنے کی کوشش کی، لیکن ماوری قبائل نے اسے مار بھگایا، پھر ۱۷۶۹ء میں برطانوی نژاد کیپٹن جیمس کک نے نیوزی لینڈ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی، شروع میں ماوری قبائل نے مسلح مزاحمت کی لیکن بالآخر کک نے ان پر قابو پالیا، اور رفتہ رفتہ وہاں برطانیہ کے افراد آ کر آباد ہونا شروع ہو گئے، یہاں تک کہ انیسویں صدی میں وہ نیو ساؤتھ ویلز کی باقاعدہ نوآبادی (Colony) بن گیا۔ ۱۸۴۰ء میں ماوری قبائل نے ملک پر برطانیہ کے حق میں اپنی حاکمیت سے دستبرداری پر آمادگی ظاہر کی جس کے بدلے میں ان سے وعدہ کیا گیا کہ ان کے جان و مال کو تحفظ دیا جائے گا، اور جن زمینوں پر وہ قابض ہیں، ان پر ان کا قبضہ برقرار رکھا جائے گا، اس کے باوجود ماوریوں سے چھوٹی موٹی جنگیں جاری رہیں، یہاں تک کہ ۱۸۴۷ء میں انہیں مکمل طور پر زیر کر لیا گیا۔ ۱۸۵۲ء میں نیوزی لینڈ کو ایک دستوری ایکٹ کے ذریعے ایک خودمختار اور ایک مستقل ملک قرار دیدیا گیا جو دولت مشترکہ کا آزاد رکن ہے، مگر گورنر جنرل برطانیہ کے بادشاہ یا ملکہ کے نمائندے کی حیثیت سے نامزد کیا جاتا ہے جس کی حیثیت محض علامتی ہے، اصل اختیارات پارلیمنٹ کی منتخب کابینہ کو حاصل ہیں جس کا سربراہ وزیر اعظم ہوتا ہے۔

ماوریوں سے شروع میں اگرچہ یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ انہیں ان کی زمینوں پر برقرار رکھا جائے گا، لیکن جوں جوں برطانوی باشندے یہاں آ کر آباد ہونا شروع ہوئے، ماوریوں کو

ان کی زمینیں بیچنے پر مجبور کیا گیا جس پر انہوں نے پھر مزاحمت کی، اور برطانوی آبادکاروں سے ان کی لڑائیاں پھر شروع ہوگئیں، ۱۸۶۰ء کی دہائی میں یہ جنگیں جاری رہیں، لیکن بالآخر برطانوی آبادکار غالب آئے اور ماوریوں کو ہتھیار ڈالنے پڑے، اس کے بعد سے ماوری قوم نے کوئی قابل ذکر مزاحمت نہیں کی اور اب وہ نیوزی لینڈ کی حکومت کے تابع فرمان ہوکر ملک کے عام شہریوں کی طرح رہتے ہیں، پارلیمنٹ میں ان کی کچھ نشستیں بھی مخصوص ہیں، اور اب حکومت ان کی ثقافت کو بھی فروغ دینے کی کوشش کر رہی ہے۔

چونکہ نیوزی لینڈ ایک زرخیز ملک ہے، اس لئے عالم اسلام کے مختلف خطوں سے بہت سے مسلمان بھی یہاں آکر آباد ہوگئے ہیں، جن کی تعداد اب شاید ایک لاکھ کے لگ بھگ ہو۔ یہاں کے مسلمانوں کی طرف سے مجھے پہلے کئی مرتبہ نیوزی لینڈ آنے کی دعوت دی گئی، لیکن مختلف اسباب کی بنا پر اب تک یہ سفر ہو نہیں پایا تھا۔

بالآخر شوال ۱۴۲۶ھ کے تیسرے ہفتے میں میرا اس ملک میں جانا مقدر تھا۔ چنانچہ بدھ ۱۳ر شوال ۱۴۲۶ھ مطابق ۱۶ر نومبر ۲۰۰۵ء کا دن گذار کر رات ایک بجے سفر کیلئے روانگی ہوئی، اور جمعہ ۱۵ر شوال ۱۸ر نومبر کو نیوزی لینڈ کے وقت کے مطابق صبح آٹھ بجے نیوزی لینڈ کے سب سے بڑے شہر آک لینڈ پر جہاز اترا۔ نیوزی لینڈ کا وقت پاکستان سے آٹھ گھنٹے آگے ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت پاکستان میں جمعرات کی رات کے بارہ بج رہے تھے، اور اس طرح یہ سفر ۲۳ گھنٹے میں طے ہوا جس میں بیچ میں ہانگ کانگ سے طیارہ بدلنے کا وقت (۳ گھنٹے) بھی شامل ہے۔

نیوزی لینڈ چونکہ دنیا کے بیشتر ممالک سے دور الگ تھلگ واقع ہے، اس لئے وہاں کے حالات سے بھی ہم لوگوں کو زیادہ واقفیت نہیں تھی۔ چنانچہ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس دور افتادہ ملک میں اتنی بڑی تعداد میں مسلمان موجود اور آباد ہیں۔ صرف مسلمان ہی نہیں، مناسب تعداد میں صاحب استعداد علماء بھی ہیں جو اکثر ہندوستان کے دینی مدارس کے تعلیم یافتہ بھی ہیں، ان میں سے مولانا خلیل نادات صاحب میرے داعی اور میزبان تھے۔ یہ

ڈابھیل کے مشہور دینی مدرسے کے فارغ التحصیل ہیں، اور ماشاء اللہ علمی ذوق کے حامل، قوی الاستعداد اور عالم دین ہیں جو سالہا سال سے نیوزی لینڈ میں دینی خدمات انجام دے رہے ہیں اردو کے علاوہ انگریزی اور عربی پر انہیں عبور حاصل ہے، اور ضرورت کے مطابق تینوں میں سے ہر زبان میں خطاب بھی کرتے ہیں، اور یہاں کے مسلمانوں کی دوسری دینی ضروریات پوری کرنے میں بھی منہمک رہتے ہیں، اور نیوزی لینڈ کے مسلمانوں میں مقبول اور ہردلعزیز ہیں۔

آک لینڈ شہر بحرالکاہل کے کنارے چھوٹے چھوٹے پہاڑوں کے درمیان آباد ہے اس بہت سے محلے ان پہاڑوں کے نام سے موسوم ہیں، انہی میں سے ایک پہاڑی کا نام ماؤنٹ روسکل (Mount Roskill) ہے جس کے اردگرد ایک وسیع محلہ بھی اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ اسی محلے میں ایک خوبصورت مسجد، مسجد عمر کہلاتی ہے جو خاصے وسیع رقبے پر تعمیر ہوئی ہے اور اس کے ساتھ بچوں کی تعلیم کا ایک مدرسہ بھی قائم ہے۔ ڈابھیل ہی کے فارغ التحصیل ایک نوجوان عالم دین مولانا محمد صاحب اس کے امام ہیں، اس مسجد کی وجہ سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے مسجد کے قرب وجوار میں رہائش اختیار کی ہوئی ہے۔ جس روز میں آک لینڈ پہنچا وہ جمعہ کا دن تھا، اور مولانا خلیل صاحب وغیرہ نے اسی مسجد عمر میں میری جمعہ کی تقریر کا اعلان کیا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ ماشاء اللہ مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی اور اس میں تیس سے زیادہ ملکوں کے مسلمان شیروشکر ہو کر نماز ادا کر رہے تھے۔ پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش کے علاوہ مصر، شام، عراق، الجزائر، مراکش، افغانستان، سوڈان، صومالیہ، انڈونیشیا، ملائیشیا اور نہ جانے کتنے ملکوں کے مسلمان ہیں جو یہاں آ کر آباد ہو گئے ہیں اور یہ مسجد ان کا مشترک اجتماعی مرکز ہے۔ دس روزہ قیام کے بعد میری بیشتر نمازیں اسی مسجد میں ہوئیں، اور اس کی بنا پر یہاں کے نمازیوں سے ایسا تعلق قائم ہو گیا جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے سے واقف ہوں۔ عرب حضرات کی بھی خاصی تعداد یہاں پنج وقتہ نمازوں میں شریک ہوتی تھی، ان کے اصرار پر روزانہ نماز فجر کے

بعد مختصر سا درس حدیث عربی زبان میں ہوتا رہا جس میں عرب بھائی بڑے ذوق وشوق سے شریک ہوتے تھے۔

ایک پاکستانی نژاد تاجر جناب محمد علی صاحب یہاں کے ممتاز مسلمان تجار میں سے ہیں، اور یہاں کی دینی سرگرمیوں میں بڑے جذبے کے ساتھ حصہ لیتے ہیں، انہوں نے ایک قریبی محلے ماؤنٹ البرٹ (Mount Albert) میں اپنا ایک نیا گھر تعمیر کیا ہے جس میں وہ ابھی منتقل نہیں ہوئے۔ انہوں نے میرے قیام کیلئے اپنے اس گھر کی پیشکش کی جو بحمد اللہ ہر قسم کی رہائشی سہولیات سے آراستہ تھا، یہ علاقہ بھی بڑا پرسکون تھا، اور اس میں قیام ہر طرح آرام دہ ثابت ہوا۔ جناب محمد علی صاحب اور ان کی اہلیہ نے راحت رسانی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، اللہ تعالیٰ انہیں اس کی جزائے خیر عطا فرمائیں۔ آمین۔ چونکہ یہ مکان مسجد سے قدرے فاصلہ پر واقع تھا، اس لئے مولانا خلیل صاحب اور مولانا امتیاز صاحب نے ہر نماز کے لئے مسجد لے جانے کی ذمہ داری بڑی محبت سے نبھائی، اور ہر طرح کی خاطر و مدارات میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ فجزاهم الله تعالىٰ خيرا.

آک لینڈ میں ماشاء اللہ ایک درجن کے قریب مسجدیں ہیں، اور ہر مسجد کے ساتھ بچوں کے حفظ و ناظرہ اور ابتدائی دینیات کی تعلیم کا انتظام ہے۔ آک لینڈ میں میرا قیام ایک ہفتہ رہا۔ یہ ملک چونکہ خط استوا کے انتہائی جنوب میں واقع ہے، اس لئے نومبر اس میں آتی گرمیوں کا مہینہ ہے، اور دن بہت بڑا ہو رہا تھا۔

عصر کی نماز ساڑھے چھ بجے، مغرب ساڑھے آٹھ بجے اور عشاء دس بجے ہو رہی تھی۔ ایک ہفتہ کے قیام میں ہر روز عصر سے مغرب تک آک لینڈ کی کسی نہ کسی مسجد میں میرا خطاب ہوتا تھا۔ بعض خطابات اردو میں اور بعض انگریزی میں ہوئے۔ ہر جگہ جا کر مسجد کے ائمہ اور منتظمین کو دینی اور دعوتی سرگرمیوں میں مشغول پایا۔ آک لینڈ میں جو دوسرے علماء مصروفِ خدمت ہیں، ان میں مولانا اسحاق صاحب، مولانا ابوبکر صاحب اور مولانا منظور صاحب بطورِ خاص قابل ذکر ہیں، اور یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ الحمدللہ یہ حضرات باہمی

تعاون اور مشورے سے یہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اتوار ۷ر شوال کو دن گیارہ بجے آک لینڈ اور مضافات میں کام کرنے والے علماء کا ایک اجتماع بھی جناب ایوب صاحب کے مکان پر ہوا جس میں عرب ائمہ وخطباء بھی شریک تھے۔ یہاں ان حضرات کے سامنے عربی میں خطاب بھی ہوا، اور ملک میں بہت سے فقہی مسائل پر مذاکرہ بھی۔

عوامی خطابات میں بندہ نے زیادہ تر تو عمومی اصلاح کے علاوہ مقامی مسائل پر زور دیا، لیکن یہاں کے حضرات نے بتایا کہ اس ملک میں سودی معاملات کا بہت زور ہے، بہت سے مسلمان بھی اس میں مبتلا ہیں، اور ان کے عمومی رواج کے نتیجہ میں سود کی حرمت اور اس کی برائی بھی دلوں سے مٹ رہی ہے، اس لئے میرے میزبانوں نے فرمائش کی کہ ہر بڑے شہر میں کم از کم ایک مفصل خطاب سود کی حرمت پر ہونا چاہئے، چنانچہ نیوزی لینڈ کے تین بڑے شہروں آک لینڈ، ویلنگٹن اور ہملٹن میں ایک ایک مفصل خطاب اسی موضوع پر ہوا، الحمدللہ اس کے مفید اثرات محسوس ہوئے، متعدد مردوں اور خواتین نے اس گناہ سے تائب ہونے کی اطلاع دی۔

سود کے سلسلے میں لوگوں کے لئے سب سے بڑا مسئلہ مکان کا حصول ہے، عام طور سے لوگ سودی قرض لے کر مکان خریدتے ہیں، نیوزی لینڈ میں بھی اس کا رواج عام ہے، لیکن یہاں کے مسلمانوں کی تنظیم ”فیڈریشن آف اسلامک ایسوسی ایشنز آف نیوزی لینڈ“ نے جسے مخفف کرکے یہاں FIANZ کہا جاتا ہے، ایک مقامی انویسٹمنٹ کمپنی سے مل کر ایک ایسی پروڈکٹ تیار کرنے کی کوشش کی ہے جس کے ذریعے مسلمانوں کے لئے سود کے بغیر مکان حاصل کرنا ممکن ہو سکے۔ اس غرض کیلئے FIANZ نے نیوزی لینڈ کے علماء پر مشتمل ایک ”علماء بورڈ“ قائم کیا ہے، تاکہ اس طریق کار کی تفصیلات اس بورڈ کے سامنے رکھ کر یہ اطمینان کیا جا سکے کہ مجوزہ طریق کار شرعی احکام کے واقعۃً مطابق ہے۔ اس علماء بورڈ میں آک لینڈ کے مولانا اسحاق صاحب، مولانا خلیل صاحب، مولانا منظور صاحب کے علاوہ ویلنگٹن کے مولانا مبارک پوری صاحب اور بعض عرب علماء بھی شامل ہیں۔ کمپنی نے جو

طریق کار تجویز کیا ہے، وہ تحریری شکل میں اس بورڈ کو پیش کیا جا چکا ہے، بورڈ کے ارکان کو اس پر حتمی فیصلے سے پہلے اس پر ایک مجلس مشاورت منعقد کرنی تھی، چونکہ ان دنوں میں بھی نیوزی لینڈ میں موجود تھا، اس لئے ان حضرات کا اصرار ہوا کہ یہ مجلس مشاورت میری موجودگی اور صدارت میں منعقد ہو جائے۔ چنانچہ اتوار ۱۷رشوال کو شام چار بجے سے عصر تک یہ مجلس مشاورت ہوئی جس میں علماء بورڈ کے ارکان کے علاوہ مذکورہ انویسٹمنٹ کمپنی اور FIANZ کے ذمہ دار حضرات بھی مجوزہ طریق کار کی وضاحت کیلئے موجود تھے۔ بعد میں علماء بورڈ کا تنہائی میں اجلاس ہوا، مجوزہ طریق کار پر غور کرکے اس میں ترامیم پیش کی گئیں، اور کمپنی کے حضرات کو بتا دیا گیا کہ اگر وہ ان ترامیم پر عمل کیلئے تیار ہوں تو علماء بورڈ اس کی منظوری دے سکتا ہے، کمپنی کے حضرات نے ان ترامیم کو روبہ عمل لانے کا وعدہ کیا، لیکن علماء بورڈ کی طرف سے کہا گیا کہ وہ ان ترامیم کے مطابق معاہدات تیار کرکے بورڈ کے سامنے پیش کریں تو انہیں دیکھنے کے بعد ہی حتمی منظوری دی جاسکے گی۔

جن مغربی ملکوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں کا بہت بڑا، بلکہ میری نظر میں سب سے بڑا مسئلہ بچوں کی تعلیم وتربیت ہے۔ ان ملکوں کی تعلیم گاہیں مسلمان بچوں اور بچیوں کیلئے ایک بہت بڑے فتنے سے کم نہیں ہیں، اگرچہ مسلمان والدین اپنے بچوں کو مغربی طرز کے اسکولوں میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ انہیں شام کے وقت مساجد کے ساتھ قائم مکتبوں سے بھی وابستہ رکھتے ہیں، یعنی شام کے وقت بچے ان مکتبوں میں قرآن کریم اور ابتدائی دینیات کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، نیز بہت سی مساجد اور اسلامی مراکز میں سنڈے اسکولوں کا نظام بھی قائم ہے، جن میں اتوار کی چھٹی کے دن صبح کے وقت میں بھی بچوں کو دینی تعلیم دینے کا انتظام ہے، لیکن ظاہر ہے جن اداروں میں بچہ ہمہ وقتی تعلیم حاصل کرتا ہو اور جہاں اوقات کار کا بیشتر حصہ گزارتا ہو، ان کے ماحول کے اثرات کو اس گھنٹے دو گھنٹے میں دھونا بہت مشکل ہوتا ہے، اس لئے اس مسئلہ کا کوئی حل اس کے سوا نہیں کہ مسلمان عصری تعلیم کیلئے بھی اپنے ادارے خود قائم کریں، اور اپنے بچوں کو اپنے ماحول میں تعلیم دینے کا انتظام

کریں، میں ان ممالک میں جہاں بھی جاتا ہوں، اس کام کی طرف مسلمانوں کو ضرور متوجہ کرتا ہوں، الحمدللہ بہت سے مقامات پر محدود پیمانے پر ہی سہی، اس ضرورت کی طرف مسلمان متوجہ ہورہے ہیں۔ آک لینڈ میں بھی یہاں کے باہمت مسلمانوں نے المدینہ اسکول کے نام سے ایک اسلامی اسکول قائم کیا ہوا ہے، جہاں ہائر سیکنڈری کی سطح تک مسلمان بچوں کی تعلیم کا انتظام ہے، پرائمری کی سطح تک تعلیم مخلوط ہے، اس کے بعد لڑکوں کو الگ اور لڑکیوں کو الگ پورے پردے کے ساتھ تعلیم دی جاتی ہے، لڑکیوں کی تعلیم گاہ کا مکمل انتظام ایک سفید فام نو مسلم خاتون انجام دیتی ہیں جو نیوزی لینڈ ہی سے تعلق رکھتی ہیں، المدینہ اسکول کی انتظامیہ نے مجھے اسکول میں مدعو کیا، وہاں بھی ایک مختصر خطاب ہوا اور مدرسہ کے نصاب ونظام کے بارے میں مشورے بھی دیئے گئے۔ یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ اسکول کے طلبہ کی کامیابی کا اوسط دوسرے تعلیمی اداروں کے مقابلے میں زیادہ تھا۔

آک لینڈ کے آٹھ روزہ قیام میں زیادہ وقت تو مذکورہ بالا مشاغل میں گذرا، لیکن درمیان میں شہر کے بعض تفریحی مقامات پر بھی جانے کا اتفاق ہوا، یہ شہر بحرالکاہل کے کنارے اس طرح واقع ہے کہ سمندر کی شاخیں جگہ جگہ شہر میں پھیلی ہوئی ہیں، اور شہر کے مختلف حصوں کو باہم ملانے کیلئے پل بنے ہوئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پہاڑ بھی جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ اور سبزہ تو اتنا زیادہ ہے کہ خشک زمین نظر نہیں آتی۔ سمندر کے بہت سے ساحل سرسبز پہاڑوں کے دامن میں واقع ہیں جہاں سمندر کی موجیں ان پہاڑوں سے آکر ٹکراتی ہیں، اور پہاڑوں اور سمندروں کا یہ آمیزہ قدرتی مناظر کے شائقین کے لئے ایک دلآویز تحفے سے کم نہیں ہے۔ پہاڑوں کی بلندی سے نظر ڈالیں تو ایک طرف سبزہ وگل کے درمیان خوبصورت عمارتیں، اور دوسری طرف سمندری شاخوں کا جال قدرت کی صناعی کا وہ منظر پیش کرتی ہیں جس کے نظارے سے نظر سیر نہیں ہوتی۔ اگرچہ وہاں آج کل گرمیوں کی آمد آمد تھی۔ لیکن ہم کراچی والوں کیلئے موسم اچھا خاصا ٹھنڈا اور نہایت خوشگوار تھا۔ یہاں سخت ترین گرمی دسمبر جنوری میں ہوتی ہے، مگر اس میں بھی درجۂ حرارت ۳۰ سے عموماً آگے نہیں

بڑھتا، چونکہ آبادی زیادہ نہیں ہے، اس لئے ماحول میں آلودگی بھی زیادہ نہیں، اور آب وہوا بڑی صحت بخش ہے، البتہ کہا جاتا ہے کہ یہاں کی دھوپ کے سامنے زیادہ وقت رہنے سے جلد خراب ہوجاتی ہے اور وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اوزون (OZONE) میں جو شگاف بیان کیا جاتا ہے، وہ اسی جگہ ہے، لہٰذا دھوپ کی شعاعیں اوزون سے چھننے کے بجائے براہِ راست جسم پر پڑتی ہیں جن سے جسم جھلس جاتا ہے، اور اس بنا پر یہاں جلد کے سرطان کی بیماری بکثرت پائی جاتی ہے۔ اعاذنا اللہ منہ.

ویلنگٹن تک کا سفر

منگل ۱۹ ر شوال کو ہمارے میزبانوں نے ہمیں نیوزی لینڈ کے دار الحکومت ویلنگٹن لے جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ وقت کی قلت کی بنا پر یہ سفر ہوائی جہاز سے ہونا تھا، لیکن نیوزی لینڈ کے قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کیلئے انہوں نے یہ انتظام کیا تھا کہ آک لینڈ سے تقریباً تین سو میل کی مسافت پر واقع یہاں کے مشہور سیاحتی شہر رُوترُوا تک ہمارا سفر کار کے ذریعے ہو، پھر یہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز ویلنگٹن پہنچیں۔ چنانچہ ہم علی الصبح کار کے ذریعہ آک لینڈ سے روانہ ہوئے، شہر سے نکلتے ہی حسین قدرتی مناظر کا ایک جہان آباد نظر آیا۔ اللہ تعالیٰ نے جو اس ملک کو قدرتی حسن عطا فرمایا ہے، وہ شاذ و نادر ہی کسی اور ملک کے حصہ میں آیا ہوگا۔ سرسبز وادیاں، سبزہ وگل سے لدے ہوئے پہاڑ جن کے سروں پر پائن کے خوشنما درخت میلوں تک قطار باندھے نظر آتے ہیں، تھوڑے تھوڑے وقفوں سے خوشنما جھیلیں، وادیوں کے نشیب وفراز پر نظر افروز چراگاہیں، جن میں اون سے لدی ہوئی بھیڑوں کے گلّے اور کہیں کہیں خوبصورت ہرن چرتے ہوئے ملتے ہیں۔ تقریباً تین گھنٹے کا یہ برّی (زمینی) سفر بڑا دلچسپ اور سرور انگیز تھا۔ بالآخر مولانا خلیل صاحب نے جو گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے، کار ایک پہاڑ کے درمیان بل کھاتی ہوئی سڑک کے کنارے روکی، اور ہمیں نیچے اتر کر نظارہ کرنے کی دعوت دی۔ سڑک کے کنارے پہنچے تو نظر کے سامنے ایک دلآویز آبشار تھا جو پورے جوش وخروش کے ساتھ پہاڑ کی ڈھلان پر پتھروں سے ٹکراتا ہوا وادی

میں گر رہا تھا، پانی کے تیز بہاؤ اور پتھروں سے ان کے ٹکرانے کی وجہ سے پانی میں خوشنما رنگ پیدا ہو رہے تھے۔ اس آبشار کے عین اوپر ایک لکڑی کا پل بھی بنا ہوا ہے، وہاں پہنچ کر قدرت کی اس حسین تخلیق کا نظارہ اور بھی زیادہ حسین ہو جاتا ہے۔

فتبارک اللہ احسن الخالقین

یہاں سے کچھ فاصلے پر ٹاؤپو کے نام سے ایک وسیع وعریض اور خوبصورت جھیل ہے۔ جو نیوزی لینڈ کی سب سے بڑی جھیل کہلاتی ہے۔ ہم تھوڑی دیر کیلئے اس جھیل کے کنارے بھی رکے جسے کوئنس ٹاؤن کے بعد نیوزی لینڈ کا دوسرا بڑا سیاحتی مرکز سمجھا جاتا ہے جھیل ہی کے نام پر قریب میں آباد شہر کا نام بھی ٹاؤپو ہے۔ جھیل کا پانی نہایت ٹھنڈا اور میٹھا ہے، لیکن قریبی پہاڑی سے پانی کی ایک نالی جھیل میں گر رہی ہے، اس نالی کا پانی تیز گرم ہے، غالباً اس پہاڑی میں لاوا موجود ہے، جس کی بنا پر یہ پانی نہایت گرم ہو گیا ہے۔

ٹاؤپو سے روانہ ہو کر دوپہر ایک بجے کے قریب ہم روتروا شہر میں داخل ہوئے۔ یہاں قدرت کا وہ نظارہ دیکھنے کا موقع ملا جو کم از کم میں نے دنیا میں کہیں اور نہیں دیکھا۔ یہاں ایک زندہ آتش فشاں پہاڑ ہے جس سے چوبیس گھنٹے لاوا ابلتا رہتا ہے۔ یہ لاوا نہ تو بجھ کر مردہ ہوا ہے، اور نہ اس کی کمیت اور کیفیت ایسی ہے جو آس پاس کی آبادی پر تباہی لائے۔ ایسا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مأمون رکھ کر اپنی قدرت کا یہ نظارہ دکھانے کیلئے اس علاقے کو منتخب کیا ہے۔ یہ تقریباً دو کلومیٹر میں پھیلا ہوا رقبہ ہے جس میں جگہ جگہ زمین میں تنور کے منہ کی طرح بھٹیاں نظر آتی ہیں، اور ان کے آس پاس کی ساری زمین کہیں خشک اور پھلپھلی اور کہیں دلدل کی طرح تر ہے، یہ دلدل لاوے کے اثر سے مسلسل اچھلتی رہتی ہے۔ اور بعض بھٹیوں سے سفید اور گرم بھاپ کی شکل میں اور بعض سے کھولتے ہوئے پانی کی شکل میں پانی اُبلتا ہے، اور بعض مرتبہ ۲۵ میٹر کی بلندی تک چلا جاتا ہے اس علاقے کو دور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جگہ جگہ آگ کے الاؤ سے دھواں اُٹھ رہا ہے۔ انتہائی سرسبز وشاداب اور ٹھنڈی وادیوں کے عین درمیان اُبلتی ہوئی آتشیں بھاپ کا یہ منظر بڑا عبرت خیز

ہے، حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہنم کو نفسانی خواہشات کی دلفریبی سے گھیرا ہوا ہے، اس انتہائی حسین علاقے میں آگ کی بھٹیوں کا یہ خوفناک منظر اس حدیث کا ایک محسوس نمونہ معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ سالہا سال سے یہ علاقہ لاوے کے کسی تباہ کن اُبال سے محفوظ چلا آتا ہے، لیکن کون جان سکتا ہے کہ کب اس میں زندگی کی مزید حرکت پیدا ہو اور یہ جگہ جو سیاحوں کی دلچسپی کا بہت بڑا مرکز بنی ہوئی ہے کسی وقت روح فرسا نظارے دکھانے لگے۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِ حَرِ النَّار

روتروا شہر میں ایک طرف یہ آتش فشاں پہاڑ ہے جس کے ابلتے ہوئے لاوے سے آس پاس کی فضا میں ایک عجیب قسم کی بُو بسی ہوئی ہے، اور دوسری طرف ایک خوش منظر جھیل ہے جو پانی کے شائقین کیلئے تفریح کے بہت سے سامان رکھتی ہے، اس لئے یہ شہر سیاحوں کا بہت بڑا مرکز ہے، قدم قدم پر ان کیلئے قیام گاہوں کا انتظام ہے۔

نیوزی لینڈ انواع واقسام کے پرندوں کیلئے دنیا بھر میں مشہور ہے، دو پرندے ایسے ہیں جو صرف نیوزی لینڈ ہی میں دیکھے جاسکتے ہیں، ان میں سے ایک کیوی (Kiwi) ہے جو گھنے جنگلات کے اندھیرے ہی میں زندہ رہ سکتا ہے، یہاں روتروا کے آتش فشاں علاقے کے باہر عجائب گھر کے ایک کمرے میں اندھیری فضا پیدا کر کے یہ پرندہ رکھا گیا ہے، اسے پہلی بار یہیں دیکھا۔ دوسرا پرندہ پینگوئن ہے (Penguin) ہے، یہ انٹارکٹیکا کے برفانی علاقے کا پرندہ ہے جو صرف برف میں زندہ رہتا ہے چنانچہ آک لینڈ کے ایک میوزیم میں چاروں طرف برف کے تودے رکھ کر یہ پرندے محفوظ کئے گئے ہیں، اور شیشے کے پیچھے سے ان کی ''زیارت'' کی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے یہ مختلف رنگ ہیں کہ کوئی اندھیرے کے بغیر زندہ نہیں رہتا تو اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے اندھیرا پیدا فرمایا ہے، اور اسی اندھیرے میں اسے رزق مل رہا ہے، اور کوئی برف کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تو اس کیلئے برفانی تودوں کی فضا مہیا ہے، اور اسی میں اس کے رزق کا سامان ہو رہا ہے،

فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ، وَمَا مِنْ دَابَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ

رِزْقُهَا وَ يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَودَعَهَا.

یہاں محدود تعداد میں کچھ مسلمان بھی آباد ہیں۔ نماز ظہر کا وقت ہو چکا تھا اور ہمیں نماز ادا کرنے کی فکر تھی۔ ہمارے رہنماؤں نے ہمیں ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس ریسٹورنٹ میں ایک ترکی نوجوان گوشت بھون بھون کر فروخت کر رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس غیرت مند مسلمان نے اپنے ریسٹورنٹ کے بالائی منزل کو جماعت خانہ بنایا ہوا ہے، ہم اس جماعت خانے میں پہنچے تو وہاں مردوں اور عورتوں کیلئے الگ الگ صفیں بچھیں ہوئی تھیں۔ وضو کا بھی انتظام تھا، اور ایک الماری میں قرآن مجید اور دینی ودعوتی کتابیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ یہ بالائی منزل نیچے کے ریسٹورنٹ سے زیادہ کشادہ تھی، اور اس مہنگے علاقے میں بالائی منزل کو نماز کیلئے مخصوص کر کے اس ترکی نوجوان نے جس دینی جذبے کا ثبوت دیا، وہ نہایت قابل قدر ہے۔ معلوم ہوا کہ تبلیغی جماعتیں بھی یہیں آ کر ٹھہرتی ہیں، اور ان کی رہائش کے علاوہ کھانے پکانے کا بھی یہاں انتظام ہے۔ الحمدللہ! بڑے سکون واطمینان سے ہم نے یہاں نماز ظہر ادا کی، دوپہر کا کھانا کھایا اور اس کے بعد ایئرپورٹ روانہ ہو گئے۔ اور ایک گھنٹے کی پرواز کے بعد ویلنگٹن کے ہوائی اڈے پر اترے۔

ویلنگٹن میں

نیوزی لینڈ کا دارالحکومت ویلنگٹن شمالی جزیرے کے انتہائی جنوبی سرے پر سمندر کے کنارے واقع ہے، اور یہاں بیشتر اوقات بہت تیز ہوائیں چلتی رہتی ہیں، اسی لئے اسے Windy Wellington کہا جاتا ہے، ہم ہوائی جہاز سے نیچے اترے تو انہی تیز برفانی ہواؤں نے استقبال کیا، یہاں تک کہ ہوائی اڈے کی عمارت تک پہنچنا مشکل ہو گیا۔ ہوائی اڈے پر مولانا عامر مبارکپوری صاحب استقبال کیلئے موجود تھے۔ یہ ہندوستان کے مشہور محقق ومصنف مولانا قاضی اطہر مبارکپوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے ہیں، اور بذات خود بڑے صاحب استعداد عالم ہیں، عربی اردو انگریزی تینوں زبانوں پر عبور رکھتے

brother
brother

ولینگٹن شہر

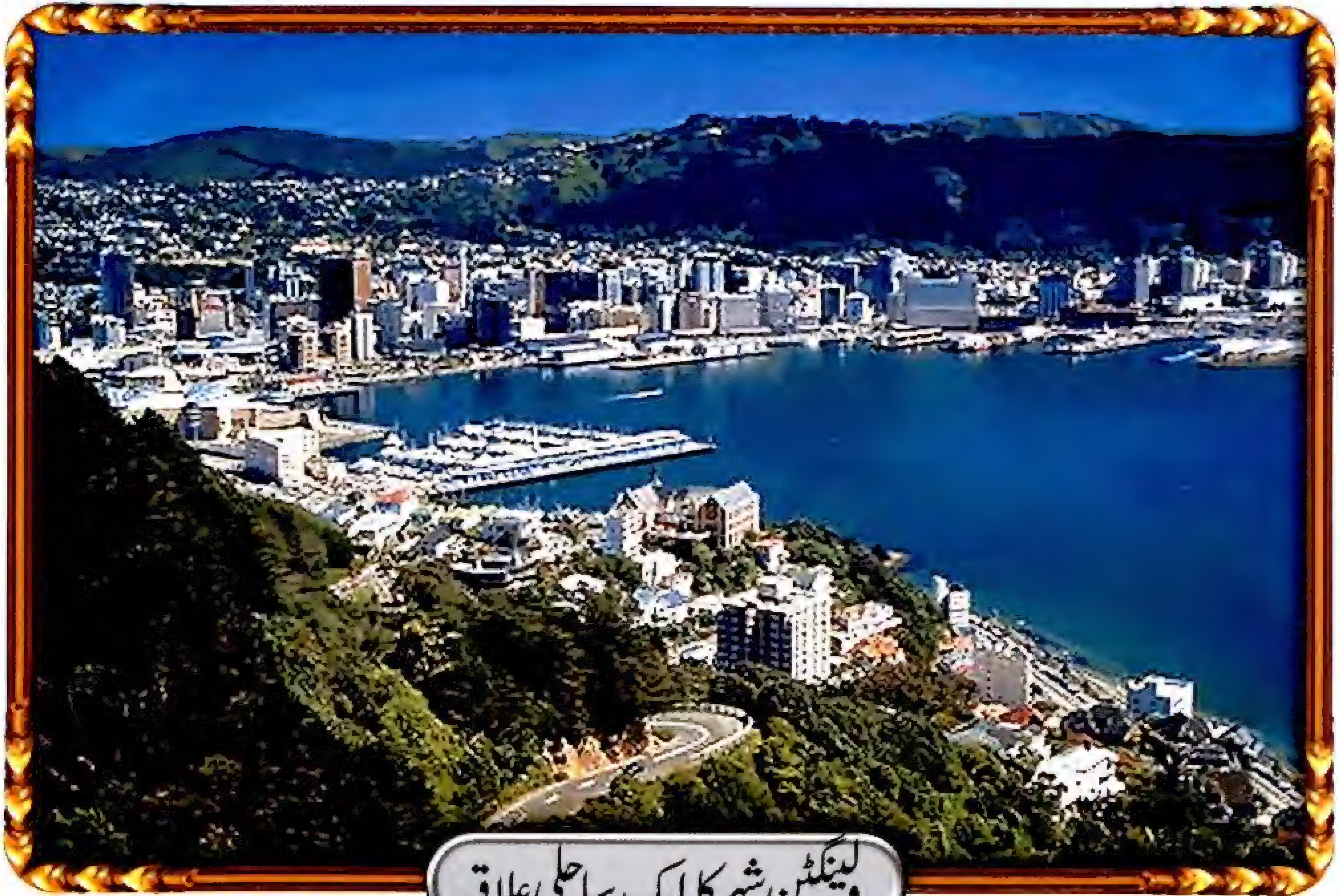

ولینگٹن شہر کا ایک ساحلی علاقہ

ہیں، اور مطالعے اور تحقیق کا ذوق۔ میرے نیوزی لینڈ پہنچنے کے اگلے ہی دن یہ آک لینڈ تشریف لے آئے تھے، اور آک لینڈ میں جو پروگرام ہوئے ان میں سے اکثر میں شریک رہے۔ اور میرے سفرِ ویلنگٹن سے ایک دن قبل واپس ویلنگٹن آ گئے تھے۔ ویلنگٹن میں تین بڑی مسجدیں ہیں، ان میں بھی سب سے مرکزی مسجد جو قلب شہر میں واقع ہے، مولانا اس کے امام وخطیب بھی ہیں اور مسجد کے تحت جو اسلامی مرکز قائم ہے، اس کے تحت تدریس اور دعوت کے کاموں میں سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں اور یہاں کے مسلمانوں میں بڑے مقبول ہیں۔

مغرب کے بعد یہاں میری تقریر کا اعلان ہو چکا تھا، چونکہ یہاں بھی مجمع مختلف ملکوں کے مسلمانوں کا تھا، اور ان کی مشترک زبان انگریزی ہی ہو سکتی تھی۔ اس لئے خطاب انگریزی میں ہوا۔ یہاں کے حضرات نے پہلے سے خطاب کا موضوع ''سود کی حرمت اور اس سے نجات کے طریقے'' طے کیا تھا، اسی کا اعلان بھی ہوا تھا، اور خود میں نے اس موضوع پر مفصل گفتگو کی ضرورت محسوس کی تھی، اس لئے اسی موضوع پر خطاب ہوا جس کے بعد عشاء تک سوال جواب کا سلسلہ بھی رہا، اور بفضلہٖ تعالیٰ اس کے اچھے اثرات محسوس کئے گئے۔ اس محفل میں ویلنگٹن کے مختلف رنگ ونسل کے مسلمانوں سے ملاقات ہوئی، اور اسلامی اُخوت ومحبت کے مظاہرے سامنے آئے۔

اگلے دن بارہ بجے مسلمانوں کی تنظیم فیڈریشن آف اسلامک ایسوسی ایشنز نیوزی لینڈ (FIANZ) کے ذمہ دار حضرات نے اپنے دفتر میں، جو مسجد کے احاطے ہی میں واقع ہے، تنظیم کے سرکردہ حضرات سے ایک ملاقات اور ظہرانے کا اہتمام کیا تھا۔ ان حضرات سے دیر تک مقامی مسائل پر گفتگو ہوئی، اور دوسری باتوں کے علاوہ یہ معلوم ہوا کہ نیوزی لینڈ میں حلال گوشت کی تیاری اور ترسیل میں اس تنظیم کے نمائندوں نے علماء کرام کے مشورے سے طریق کار مرتب کیا ہے، اور اس کی باقاعدہ نگرانی کی جاتی ہے۔ مقامی علماء نے تصدیق کی کہ یہ طریق کار ان کے مشورے سے مرتب ہوا ہے۔

اس ملاقات سے پہلے مولانا عامر مبارکپوری صاحب نے ویلنگٹن شہر کی سیر بھی کرائی، یہ شہر پہاڑوں اور سمندری شاخوں سے بھرا ہوا ہے، زیادہ تر مکانات پہاڑوں کی ڈھلان پر واقع ہیں، اور سمندر کے ساحل جن کے ایک طرف سرسبز پہاڑ اور دوسری طرف سمندر موجزن نظر آتا ہے، بڑے خوش منظر ہیں، وسط شہر کا علاقہ نئی عمارتوں سے مزین ہے، شہد چونکہ نیوزی لینڈ کی خاص پیداوار ہے، اس لئے پارلیمنٹ کی عمارت شہد کے چھتے کی شکل میں بنائی گئی ہے، اور ایک عجیب وغریب ٹیکنالوجی یہاں عام ہے کہ بنی بنائی عمارت کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ منتقل کردیا جاتا ہے۔ شہر کے اسی حصہ میں ایک کئی منزلہ عمارت ہمیں دکھائی گئی جو پہلے سڑک کے دوسرے کنارے پر واقع تھی، اُسے اُٹھا کر یہاں منتقل کردیا گیا ہے۔ آک لینڈ میں ایک جگہ ہم نے مکان اٹھانے کا منظر خود دیکھا۔ وہاں بنے بنائے مکانات کی ایک مارکیٹ ہے، خریدار کو جو مکان پسند ہو، وہ اٹھا کر لے جاتا ہے، اور جس پلاٹ پر چاہے اُسے فٹ کردیتا ہے، یہ عجیب وغریب طریق کار بھی میں نے کسی اور ملک میں دیکھا یا سنا نہیں تھا۔ لکڑی کے مکانات میں تو یہ بات اتنی مشکل نہیں، لیکن یہاں کے حضرات کا کہنا ہے کہ یہ عمل سیمنٹ سے بنی ہوئی عمارتوں کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے، چنانچہ ویلنگٹن میں جس عمارت کو منتقل کیا گیا وہ سیمنٹ کی عمارت تھی۔

بدھ ۲۰؍شوال کی سہ پہر ہم ویلنگٹن سے بذریعہ ہوائی جہاز نیوزی لینڈ کے چوتھے بڑے شہر ہملٹن پہنچے، یہ بھی بڑا سرسبز وشاداب شہر ہے، اور مسلمانوں کی بڑی تعداد یہاں آباد ہے۔ یہاں کی ایک مسجد میں جس میں زیادہ تر نمازی صومالی حضرات ہیں، عصر کے بعد یہاں بھی اعلان کے مطابق میرا انگریزی میں خطاب ہوا، اور بعد میں سوال وجواب کی ایک نشست۔ جس کے بعد ہم آک لینڈ کیلئے بذریعہ کار روانہ ہوئے، اور رات گئے قیام گاہ تک پہنچے۔

یوں تو نیوزی لینڈ قدرتی مناظر سے بھرا پڑا ہے، لیکن کہا جاتا ہے کہ اس کا سب سے زیادہ خوبصورت علاقہ جنوبی جزیرے میں کوئنس ٹاؤن ہے۔ دورۂ نیوزی لینڈ کے آخر میں ہمارے میزبانوں نے ایک ہوائی جہاز کے ذریعے وہاں لے جانے کا پروگرام بنایا، علی الصبح

آک لینڈ سے روانہ ہوکر جہاز کرائسٹ چرچ رُکا جو ملک کا دوسرا بڑا شہر ہے، اور یہاں بھی مسلمان خاصی تعداد میں آباد ہیں، اس کے بعد اس نے کوئنس ٹاؤن پہنچایا جو واقعۃً اپنے قدرتی حسن و جمال میں اپنی مثال آپ ہے، تین طرف برف پوش پہاڑوں کے درمیان ایک قدرتی جھیل اور اس کے درمیان نکلے ہوئے سرسبز جزیرے نے سارے علاقے کو غیر معمولی حسن عطا کردیا ہے اور میلوں تک کار میں سفر کریں تو ہر تھوڑی دیر بعد ایک نیا منظر دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔

کوئنس ٹاؤن سے واپسی کے بعد ایک دن مزید آک لینڈ میں گزار کر ۲۴؍شوال کی صبح روانگی ہوئی، اور ۲۵؍شوال کی صبح بفضلہٖ تعالیٰ کراچی واپسی ہوگئی۔

شام کا دوسرا سفر

جنوری 2005ء

ذوالحجہ ۱۴۲۵ھ

شام کا دُوسرا سفر

(جنوری 2005ء / ذوالحجہ ۱۴۲۵ھ)

حمد وستائش اس ذات کیلئے ہے جس نے اس کارخانۂ عالم کو وجود بخشا

اور

درود وسلام اس کے آخری پیغمبر ﷺ پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

''جہان دیدہ'' میں شام کے سفر کا ذکر ہوا، اس کے اُنیس سال بعد ۲۴ جنوری ۲۰۰۵ء کو دوبارہ شام جانے کا اتفاق ہوا، اس مرتبہ شام میں ایک ہفتہ قیام رہا، اس دوران دمشق کے علاوہ حمص، حماۃ اور حلب بھی جانے کا اتفاق ہوا، اس سفر میں مزید مقامات پر حاضری کی سعادت ملی اور مزید معلومات حاصل ہوئیں۔ اس سفر کے داعی دراصل ڈاکٹر محمد حمور تھے جو شام کے باشندے ہیں، مگر عرصہ سے پیرس میں مقیم ہیں، اور امریکہ میں انہوں نے گائیڈنس فائنانس کے نام سے مسلمانوں کیلئے مکانات حاصل کرنے کا ایک ادارہ قائم کیا ہوا ہے، جو اس وقت امریکہ میں اس مقصد کیلئے کامیاب ترین ادارہ ہے، اور اس کی شرعی رہنمائی کیلئے انہوں نے جو بورڈ قائم کیا ہوا ہے، مجھے اس کی سربراہی سونپی ہوئی ہے، وقتاً فوقتاً اس بورڈ کے اجتماعات مختلف مقامات پر ہوتے رہتے ہیں، ان کی خواہش تھی کہ اس کا ایک اجتماع شام میں بھی رکھا جائے تاکہ وہاں کے متبرک مقامات اور وہاں کے علماء کی زیارت بھی ہوسکے۔ چنانچہ انہوں نے اس سفر کا نظم بڑی خوش ذوقی سے ترتیب دیا، میرے بیٹے عزیزم مولانا عمران اشرف سلمہ بھی گائیڈنس کے بورڈ کے رکن ہیں، اس لئے وہ بھی سفر

میں مدعو تھے، اور میرے چھوٹے بیٹے عزیزم مولوی حسان اشرف سلمہٗ اور دوسرے گھر والے بھی شام کی زیارت کے شوق میں ہمراہ ہوگئے۔

شام کی بہت سی خصوصیات کا ذکر تو میں اپنے پہلے سفرنامے میں کر چکا ہوں، اس مرتبہ جن نئے مقامات پر جانے کا اتفاق ہوا، زیرِ نظر تحریر میں صرف انہی کے تذکرے پر اکتفا کرتا ہوں۔

جامع اُموی اور اس کے نواح میں

جامع اُموی کا مفصل تذکرہ میں اپنے پہلے سفرنامے میں کر چکا ہوں۔ اس مرتبہ جامع اُموی کی زیارت کے وقت ہمارے دو فاضل دوست ساتھ تھے۔ جنہوں نے شام کے تاریخی مقامات کی خصوصی تحقیق کی ہے۔ ایک تو شیخ وائل حنبلی صاحب ہیں جو عرصۂ دراز سے بندہ سے خط وکتابت کرتے رہے ہیں، دو سال قبل حج کے موقع پر ان سے ملاقات بھی ہوئی تھی اور چند ماہ قبل جب برادرِ معظم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم نے شام کا سفر کیا تو وہ ان کے بہترین رفیق کے طور پر ساتھ رہے، دوسرے کویت میں ہمارے فاضل دوست شیخ ناصر العجمی جو ایک محقق عالم ہیں، انہیں جب بحرین کے شیخ نظام یعقوبی سے معلوم ہوا کہ میں اور وہ گائیڈنس کے اجتماع میں شرکت کیلئے دمشق جارہے ہیں اور میں چند روز وہاں ٹھہروں گا تو وہ بھی شام آگئے، چونکہ وہ اپنے متعدد تحقیقی کاموں کیلئے بار بار شام آتے رہتے ہیں، اس لئے یہاں کے علماء اور تاریخی مقامات کی خوب واقفیت رکھتے ہیں۔

ان دونوں حضرات کی معیت میں جامع اُموی اور اس کے نواح کے بارے میں کچھ نئی معلومات حاصل ہوئیں۔ جامع اُموی کے شمال مغربی کونے پر ایک کمرہ ہے جس کے بارے میں یہاں کے علماء ومشائخ کے درمیان یہ بات مشہور ومعروف ہے کہ یہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا خلوت کدہ تھا، اسی طرح مسجد کے ہال میں جنوب مغرب کی طرف محراب الحنابلہ کے دائیں جانب ایک کمرہ ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں علامہ موفق ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ (صاحب المغنی) درس دیتے رہے ہیں، اسی کمرے میں آج کل

جامع اموی دمشق

شام کا تاریخی شہر حماۃ

مشائخ شام میں بزرگ ترین عالم شیخ عبدالرزاق حلبی درس دیتے ہیں، وہ آج کل حج کیلئے گئے ہوئے تھے اس لئے ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ جامع اُموی کا جنوب مغربی دروازہ جو محراب الحنابلہ اور محراب الشافعیہ کے درمیان واقع ہے اگر اُس سے باہر بازار کی طرف نکلیں تو سلطان نورالدین زنگی رحمتہ اللہ علیہ کے مقبرے کی طرف جاتے ہوئے ذرا سا آگے چل کر بائیں جانب ایک جگہ ٹین کے دروازے سے بند کی ہوئی ہے، وائل حنبلی صاحب نے بتایا کہ اہل دمشق میں یہ بات مشہور ہے کہ یہاں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا مکان تھا۔

جامع اُموی کے آس پاس کا علاقہ صحابہ کرامؓ اور علمائے سلف کی یادگاروں سے بھرا پڑا ہے۔ شیخ ناصر العجمی اور شیخ وائل حنبلی نے ان یادگاروں میں جن اہم یادگاروں کی زیارت کرائی، ان میں دارالحدیث الاشرفیہ بطورِ خاص قابل ذکر ہے۔

دارالحدیث الاشرفیہ

یہ دارالحدیث جامع اُموی کے شمال مغرب میں قلعہ دمشق کے دروازے کے قریب واقع ہے۔ حدیث کا یہ بابرکت مدرسہ تعمیر کرنے کی سعادت سلطان صلاح الدین ایوبی رحمتہ اللہ علیہ کے بھتیجے الملک الاشرف مظفرالدین کو حاصل ہوئی تھی۔ اسی لئے اس کو ”دارالحدیث الاشرفیہ“ کہا جاتا ہے۔ جب ۶۳۰ھ میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی تو ملک اشرف نے اس دور کے مشہور حافظ حدیث علامہ تقی الدین بن الصلاح رحمتہ اللہ علیہ کو یہاں کا شیخ الحدیث مقرر کیا، جو تیرہ سال یہاں درس حدیث دیتے رہے اور یہیں بیٹھ کر انہوں نے وہ شہرۂ آفاق مقدمہ ابن الصلاح تالیف کیا جو اُصولِ حدیث کے بہترین ماخذ و مرجع کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسی دارالحدیث کے چوتھے شیخ الحدیث علامہ محی الدین نووی رحمتہ اللہ علیہ (شارح مسلم) تھے جو یہاں تقریباً بارہ سال تک (۶۶۵ھ تا ۶۷۷ھ) درسِ حدیث دیتے رہے۔ اسی عظیم مدرسہ کے نویں شیخ الحدیث علامہ ابوالحجاج مزّی رحمتہ اللہ علیہ تھے جن کی مشہور کتاب ”تہذیب الکمال“ صحاحِ ستہ کے رجال پر اہم ترین ماخذ سمجھی جاتی ہے۔ علامہ مزّی

رحمۃ اللہ علیہ یہاں تیئس (۲۳) سال (۷۱۸ھ سے ۷۴۲ھ) تک درس دیتے رہے۔ اُن کے فوراً بعد اسی دارالحدیث کی سربراہی شیخ الاسلام علامہ تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی اور ان کے بعد اُن کے صاحبزادے علامہ تاج الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ (صاحب تفسیر ابن کثیر) بھی اسی دارالحدیث کے سربراہ کی حیثیت میں درس دیتے رہے ہیں۔

یہ بابرکت تاریخی دارالحدیث بیچ میں حوادثِ روزگار کا شکار ہوگیا، یہاں تک کہ ایک عیسائی شخص نے اسے خرید لیا۔ لیکن پھر تیرہویں صدی میں شیخ یوسف مراکشی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے خرید کر دوبارہ دارالحدیث کے طور پر بحال کیا اور یہاں درسِ حدیث جاری کیا۔ انہی کے صاحبزادے علامہ محمد بدرالدین الحسنی رحمۃ اللہ علیہ بلادِ شام کے متاخر علماء میں مدارالحدیث کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اپنے والد کی وفات کے بعد صرف بارہ سال کی عمر میں دارالحدیث کے متولی بنے اور پھر تمام عمر اپنی وفات (۱۳۴۵ھ) تک یہاں درسِ حدیث دیتے رہے۔

آج کل اس دارالحدیث کے سربراہ شیخ حسین حسن صعبیہ ہیں۔ اب یہ عظیم الشان تاریخی درسگاہ باقاعدہ اعلیٰ معیار کے دارالحدیث کی شکل میں تو باقی نہیں رہی، لیکن یہاں ایک ثانوی سطح تک کی درسگاہ اب بھی جاری ہے۔ حسین حسن صعبیہ قدیم طرز کے روایتی عالم ہیں، ایک رات پہلے ڈاکٹر حمور نے بندہ سے ملاقات کرانے کی غرض سے چیدہ چیدہ علماء کو ایک عشائیہ پر مدعو کیا تھا، جس میں شیخ وہبہ زحیلی، شیخ سعید رمضان البوطی، شیخ حسام الدین فرفور اور شیخ حسین حسن صعبیہ وغیرہ بھی مدعو تھے۔ باقی حضرات سے تو میں پہلے سے واقف تھا، لیکن شیخ حسین حسن صعبیہ سے میری پہلی ملاقات تھی اور پہلی ہی نظر میں اُن کے نورانی سراپا کو دیکھ کر دل نے ان کی طرف خاص کشش محسوس کی۔ یہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دارالحدیث الاشرافیہ کے سربراہ ہیں۔ اسی وقت انہوں نے دارالحدیث آنے کی دعوت دی تھی اور ان سے صبح دس بجے کا وقت طے ہوگیا تھا۔ اس مبارک درسگاہ میں داخل ہو کر اور یہ

تصور کر کے کہ یہاں کیسے کیسے جبالِ علم وعمل کا فیض جاری رہا ہے، دل کی عجیب کیفیت تھی۔ شیخ صعبیہ نے بڑی محبت وشفقت سے استقبال کیا اور ہمیں اس متبرک محراب میں لے گئے، جو سالہا سال تک حافظ ابن الصلاح، علامہ نووی، حافظ مزی، علامہ سبکی، حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہم جیسے عبقری علماء کا مستقر رہی ہے۔

اس حاضری کے موقع پر میرے بیٹوں عزیزم ڈاکٹر مولوی عمران اشرف اور مولوی حسان اشرف سلمہما کے علاوہ بحرین کے شیخ نظام یعقوبی، کویت کے شیخ ناصر العجمی اور دمشق سے شیخ وائل حنبلی اور بعض دوسرے علماء ساتھ تھے۔ ان تمام حضرات نے اصرار کرنا شروع کر دیا کہ میں یہاں بیٹھ کر انہیں حدیث کا درس اور اس کی اجازت دوں۔ انتہاء یہ کہ شیخ حسین حسن صعبیہ بھی ان کے اصرار میں شریک ہو گئے۔ اُن کی اس فرمائش نے مجھے سخت آزمائش میں مبتلا کر دیا۔ یہاں علامتی طور سے ہی سہی، مسندِ تدریس پر بیٹھنا ایک جسارت معلوم ہوتی تھی، لیکن ان تمام حضرات کے اصرار کو فالِ نیک سمجھتے ہوئے حصولِ برکت کیلئے میں نے ان کو حدیث مسلسل بالأولیۃ سنائی۔ شیخ نظام یعقوبی پہلے سے میرے بیٹے مولوی عمران اشرف سلمہ سے فرمائش کر چکے تھے کہ وہ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ثبت ”الازدیاد السنی علی الیانع الجنی“ ساتھ لے کر آئیں۔ شیخ ناصر العجمی نے اس کی کاپیاں کرا کر تمام حاضرین میں تقسیم کر دیں، اور پھر اس ثبت کا وہ حصہ میرے سامنے پڑھا جو حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کی اسانید حدیث پر مشتمل تھا اور یہیں بیٹھ کر ایک اجازت نامہ تحریر کر کے تمام حاضرین میں تقسیم کیا۔ میرے لئے اس متبرک دار الحدیث کے ساتھ یہ علامتی نسبت بھی ایک عظیم سعادت تھی۔

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

دار الحدیث النوریہ

اس دار الحدیث سے مشرق میں چند قدم کے فاصلے پر ایک اور ”دار الحدیث“ ہے جو اس وقت غیر آباد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دمشق کا سب سے قدیم دار الحدیث ہے جو سلطان

نورالدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وقت کے امام حدیث حافظ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ کیلئے بنایا تھا۔ اس لئے اس کا نام "دارالحدیث النوریہ" ہے یہ عمارت اگرچہ آجکل غیرآباد ہے، لیکن وائل حنبلی صاحب کے ایک دوست اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ انہوں نے ہمارے لئے یہ عمارت کھولی، یہاں قبلے کی سمت ایک بوسیدہ محراب کے پتھر عمارت کی قدامت کی گواہی دے رہے ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ ابن اثیر جزری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سلطان نورالدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے دارالحدیث کے نام سے کوئی مدرسہ قائم کیا (البدایۃ والنہایۃ۔ ص:۴۸۷، ج:۱۶، دارہجر ۱۴۱۹ھ) یہ وہی دارالحدیث ہے جس میں ہم اس وقت کھڑے تھے۔ علماء دمشق میں یہ بات مشہور ہے کہ حافظ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ دمشق اسی دارالحدیث میں تالیف فرمائی۔ تاریخ دمشق کیا ہے؟ اَسّی جلدوں پر مشتمل ایک عظیم انسائیکلو پیڈیا ہے جسے صرف پڑھنے کیلئے سالہا سال چاہئیں۔ نام کو یہ دمشق کی تاریخ ہے، لیکن حقیقت میں پورے عالم اسلام اور اس کے مشاہیر کا مبسوط تذکرہ اور احادیث واسانید اور جرح وتعدیل کا بھی بڑا وسیع دفتر ہے، تاریخ پر اتنی ضخیم کتاب اس سے پہلے نہیں لکھی گئی تھی، اَسّی جلدوں کی اس کتاب کو شائع کرنا بھی کارے دارد تھا۔ چنانچہ چند سال پہلے تک کسی ناشر کو اسے مکمل شائع کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا تھا، اب بفضلہٖ تعالیٰ ۱۴۱۵ھ میں یہ پوری کی پوری شائع ہوئی ہے۔ تصنیف وتالیف کا یہ عجوبہ، جو صرف ایک شخص کی کاوش ہے، اسی دارالحدیث کے ایک چھوٹے سے کمرے میں فرش پر بیٹھ کر انجام پایا تھا۔ اللہ اکبر۔

اسی دارالحدیث میں جن اکابر علماء نے درس دیا، ان میں حافظ علم الدین برزالی (متوفی ۷۳۹ھ) بھی شامل ہیں۔ جو شام کے دوسرے بڑے مورخ ہیں اور علم حدیث میں مقامِ بلند کے حامل ہیں۔ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ان کی نقل پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ (حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں **سمعتُ العلامة ابن تیمیة یقول: نقل البرزالی نقرفی حجر.** (البدایۃ والنہایۃ۔ ص:۲۱۳، ج:۱۸)

مقام ابی الدرداء رضی اللہ عنہ

جامع اُموی سے کچھ فاصلے پر قلعہ دمشق کی شمالی دیوار کے ساتھ ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس پر مسجد ابی الدرداء لکھا ہوا ہے، نیز یہ بھی لکھا ہے کہ "یہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا مقام ہے" بلادِ شام میں "مقام" کا لفظ مزار کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اور جہاں کسی کا قیام رہا ہو، اِسے بھی "مقام" کہہ دیتے ہیں۔ اس مسجد کے مشرقی کونے میں ایک قبر بنی ہوئی ہے، جس پر لکھا ہے کہ یہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔ یہاں ان کی قبر کا ہونا تاریخی طور پر مشکوک ہے کیونکہ حافظ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ دمشق میں کئی روایتیں نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی تدفین الباب الصغیر کے قبرستان میں ہوئی تھی۔ (تاریخ ابن عساکر باب ذکر فضل مقابر اہل دمشق۔ ۲:۴۱۸) لیکن یہ بعید نہیں ہے کہ یہاں ان کا قیام رہا ہو۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ اُن زاہد و عابد صحابہ کرام میں سے ہیں جنہیں نبی کریم ﷺ نے "حکیم اُمتی" (میری اُمت کے حکیم) کا لقب عطا فرمایا تھا۔ وہ انصار کے قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے اور غزوۂ بدر کے موقع پر مسلمان ہوئے تھے، غزوۂ اُحد پہلا جہاد تھا جس میں وہ نہ صرف شریک ہوئے، بلکہ شجاعت کے وہ جوہر دکھائے کہ آنحضرت ﷺ نے انہیں "بہترین شہسوار" (نعم الفارس) قرار دیا۔ آپ ﷺ کی وفات کے بعد انہوں نے دمشق میں سکونت اختیار کر لی تھی اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک میں جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ یہاں کے گورنر تھے انہیں دمشق کا قاضی مقرر کر دیا گیا تھا۔ وہ تاریخ اسلام کے عظیم معرکوں میں شریک رہے اور دمشق میں انہوں نے روایت حدیث کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

(ان کے حالات کی تفصیل کیلئے دیکھئے الاصابہ۔ ص ۴۵، ۴۶، ج: ۳)

اُن کی مبینہ قبر کے برابر میں ایک اور قبر بنی ہوئی ہے، اور اس پر لکھا ہوا ہے کہ یہ مشہور حنبلی فقیہ علامہ موفق الدین ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ کی قبر ہے۔ مجھے اس کی صحت کی تحقیق نہیں ہو سکی۔ لیکن ان کا جامع اُموی میں درس دینا تقریباً تواتر سے مشہور ہے۔ اس لئے کچھ

بعید نہیں ہے کہ ان کی تدفین یہاں ہوئی ہو۔ جامع اُموی کے اردگرد کا یہ سارا علاقہ تاریخ اسلام کی جلیل القدر شخصیتوں کے انفاسِ قدسیہ سے مہکا ہوا محسوس ہوتا ہے اور اس کا کیف ہم جیسے بے حس لوگوں کو بھی محسوس ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

حافظ ابوالحجاج مزّی رحمۃ اللہ علیہ

دمشق کے اس قیام کے دوران متعدد ایسے مقامات اور ایسی شخصیتوں کی زیارت ہوئی جو میرے پچھلے سفر شام میں نہیں ہو سکی تھی۔ جن بزرگوں کی قبروں پر اس مرتبہ حاضری ہوئی، اُن میں حافظ ابوالحجاج مزّیؒ، علامہ ابن تیمیہؒ، حافظ ابن کثیرؒ اور علامہ ابن قیمؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اوّل الذکر تینوں بزرگوں کی قبریں دمشق کے اُس قبرستان میں بیان کی جاتی ہیں جو مقبرۃ الصوفیہ کے نام سے مشہور ہے، اب یہ قبرستان بحیثیت مجموعی تو ختم ہو چکا ہے اور یہاں جامعہ دمشق کی بعض عمارتیں بن گئی ہیں، لیکن ان تین بزرگوں کی قبریں ابھی تک باقی ہیں۔ حافظ ابوالحجاج مزّی رحمۃ اللہ علیہ جن کا اصل نام یوسف بن الزکی ہے اور لقب جمال الدین ہے، علم حدیث اور اسماء الرجال کے وہ امام ہیں جن کی کتاب ''تہذیب الکمال'' صحاحِ ستہ کے رجال پر مستند ترین مأخذ سمجھی جاتی ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے تہذیب التہذیب اور تقریب التہذیب اسی کی بنیاد پر تالیف فرمائی ہیں۔ نیز اطراف پر اُن کی کتاب تحفۃ الاشراف مشہور و معروف ہے۔ یہ اصلاً حلب کے رہنے والے تھے، لیکن پھر دمشق کے محلے مزّہ میں آباد ہو گئے تھے، اس لئے انہیں مزّی کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم حدیث اور اسانید کی معرفت کا وہ مقام عطا فرمایا تھا کہ وقت کے جلیل القدر محدثین مثلاً علامہ تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ مشکلات میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان کے شاگرد علامہ تاج الدین سبکی نے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں جن میں علم حدیث کے طلبہ و اساتذہ کیلئے بڑے قیمتی اور نادر فوائد ہیں۔ (دیکھئے طبقات الشافعیۃ للسبکیؒ۔ ص: ۲۵۵ تا ۲۶۷، ج: ۶ دار المعرفۃ بیروت) حافظ شمس الدین ذہبیؒ جیسے نقاد اور مبصر حدیث اُن کے بارے میں یہ تبصرہ کرتے ہیں:

"ھو صاحب معضلاتنا و موضح مشکلاتنا"

(الدرالکامنہ، للحافظ ابن حجرؒ، ص: ۴۶۰، ج: ۴)

یہ وہ صاحب ہیں جو ہماری پیچیدگیاں دور کرتے اور ہمارے
لئے مشکل مقامات کو واضح کرتے ہیں۔

ان کی عمر نوے سال سے زیادہ ہوئی، مگر وہ اپنے لئے کوئی سواری نہیں رکھتے تھے اور آخر عمر تک پیدل چل کر مدرسہ جایا کرتے تھے اور اس بڑھاپے میں بھی ٹھنڈے پانی سے غسل فرماتے تھے، انتہائی نرم خو، کم گو اور باوقار بزرگ تھے، ان کی مجلس میں کبھی کسی کی غیبت نہیں سنی گئی۔ مال و دولت کی طرف کبھی توجہ نہیں فرمائی اور زیادہ عمر تنگدستی میں بسر کی، یہاں تک کہ آخر میں معاشی ضرورت کی بناء پر اپنی مایۂ ناز تالیف "تہذیب الکمال" کا اپنے قلم سے لکھا ہوا نسخہ فروخت کرنے پر مجبور ہوئے۔ (الدرالکامنہ، للحافظ ابن حجرؒ، ص: ۴۶۰، ج: ۴)

حافظ ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ ان کے داماد تھے اور انہوں نے بیان فرمایا ہے کہ وہ بہت کم دن بیمار رہے۔ جمعہ کے دن حدیث کا درس دے کر جمعہ کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک پیٹ میں درد اُٹھا جسے قولنج سمجھا گیا مگر درحقیقت وہ طاعون کا اثر تھا، یہاں تک کہ آیۃ الکرسی پڑھتے پڑھتے ۱۲؍صفر ۷۴۲ھ کو وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

(البدایۃ والنہایۃ۔ ص ۴۲۷، ج: ۱۸)

علامہ ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ

دوسری قبر حافظ مزّی کے مایۂ ناز شاگرد علامہ ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ کی ہے، اگرچہ زیارتِ قبور کے بارے میں ان کا مسلک معروف ہے، لیکن شدِ رحال کے بغیر کسی بزرگ کی قبر پر سلام عرض کرنے کو وہ بھی ناجائز نہیں کہتے، دوسری طرف ان کے تفردات کے باوجود ان کے تبحر علمی، ان کی خدماتِ جلیلہ اور ان کی شجاعت و عزیمت کی بناء پر دل میں ہمیشہ ان کیلئے محبت و احترام کے جذبات موجزن رہے ہیں، اس لئے ان کی قبر پر سلام عرض کرنے

کی توفیق ہوئی۔

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ہماری تاریخ کی ان شخصیات میں سے ہیں جن کے بارے میں لوگ عموماً افراط وتفریط کا شکار رہے ہیں، ان کے بعض نظریات اور بعض فقہی تفردات کی بناء پر انہی کے زمانے میں کچھ حضرات نے انہیں گمراہ قرار دیا، اور اس کی بناء پر انہیں بار بار قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ (اس کی پوری تفصیل حافظ ابن حجرؒ نے الدرر الکامنہ کی پہلی جلد میں صفحہ ۱۴۴ سے ۱۶۰ تک بیان فرمائی ہے)۔ یہاں تک کہ آخر عمر میں انہیں قلعۂ دمشق میں نظر بند کیا گیا اور وہیں ۷۲۸ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ دوسری طرف ان کے مداحوں کے ایک گروہ نے ہر ہر معاملے میں ان کی اتباع اور دفاع میں اتنا غلو کیا کہ ان کے مقابلے میں علماءِ اُمت کی عظیم اور مایۂ ناز شخصیات کی تنقیص سے بھی گریز نہیں کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے علم وفضل، اُن کے زہد وتقویٰ اور اخلاص و للّٰہیت میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں بے پناہ قوت حافظہ اور وسعت علم کے ساتھ غیر معمولی زورِ بیان اور ایک سیال قلم عطا فرمایا تھا، جس سے انہوں نے دین کی عظیم الشان خدمات انجام دیں، خاص طور پر علومِ نقلیہ میں ان کی تصانیف بحرِ ناپیدا کنار کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن مسئلہ یہاں سے پیدا ہوا کہ انہوں نے اپنے زمانے کے باطل فرقوں کی تردید میں جو کلامی مباحث چھیڑے، اُن کی وجہ سے اُن پر تشبیہ وتجسیم کے الزمات عائد ہوئے، ایک طرف انہوں نے صفات متشابہہ (مثلاً استواء علی العرش) کے بارے میں یہ مؤقف اختیار کیا کہ اُن کے حقیقی معنی مراد ہیں، لیکن یہ حقیقی معنی مخلوقات وحوادث سے مختلف ہیں، ان کی کنہ غیر معلوم ہے اور ان پر ''بلا کیف'' ایمان رکھنا چاہئے لیکن دوسری طرف جب اس مسئلے پر بحث ومناظرہ کی گرما گرمی شروع ہوئی تو ''حقیقی معنی'' پر زور دینے کے جوش میں وہ انتہائی نازک تفصیلات میں داخل ہو گئے جو ''بلا کیف'' ایمان کی حدود سے آگے تھیں، اس کیلئے بعض ایسی تعبیرات اختیار کیں جو تشبیہ کی سرحد کو چھو رہی تھیں، واقعہ یہ ہے کہ باری تعالیٰ کی ذات وصفات کے بارے میں فلسفیانہ موشگافیاں انسان کو بعض اوقات ایسے دلدل میں

لے جاتی ہیں جہاں اس کے پھسل جانے کے امکانات بہت ہیں، اس لئے سلف نے اس بارے میں ''بلا کیف'' ایمان رکھنے کا صرف دعویٰ ہی نہیں کیا، اس پر عمل بھی فرمایا۔ کاش کہ علامہ ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ اپنے آپ کو بھی سلف کے طریقے کے مطابق اسی حد تک محدود رکھتے اور مزید تفصیلات میں داخل نہ ہوتے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں ان کی معتد بہ تحریروں کے مطالعے کے بعد کم از کم میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان کی تاویل ممکن ہے اور ان کی بناء پر انہیں براہِ راست مشبہہ یا مجسمہ میں شامل کرنا یا ان کو قدم عالم کا قائل سمجھنا درست نہیں۔

جہاں تک ان کے فقہی تفردات کا تعلق ہے۔ علمائے کرام کی ایک جماعت نے انہیں شروط اجتہاد کا جامع قرار دیا ہے (مثلاً علامہ ابن الزملکانی البدایۃ والنہایۃ، ص:۲۹۸، ج ۱۸) اور حافظ شمس الدین ذہبیؒ نے ان پر بہترین تبصرہ فرمایا ہے کہ:

وقد انفرد بفتاویٰ نیل من عرضه لأجلها، وهي مغمورة في بحر علمه، فالله تعالیٰ يسامحه و يرضى عنه، فمارأيت مثله و كل أحد من الأمة فيؤخذ من قوله ويترك.

(تذکرہ الحفاظ۔ ص ۱۴۹۷، ج:۴)

انہوں نے بعض فتاویٰ میں تفرد اختیار کیا جن کی بناء پر انہیں بُرا بھلا کہا گیا، لیکن یہ فتاویٰ ان کے علم کے سمندر میں چھپ گئے ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے چشم پوشی فرمائے اور ان سے راضی ہو، میں نے ان جیسا آدمی نہیں دیکھا اور اُمت کے ہر فرد کا حال یہ ہے کہ اس کے اقوال میں سے کچھ قابل قبول ہوتے ہیں اور کچھ چھوڑ دینے کے لائق۔''

اگرچہ حافظ ذہبیؒ کی طرف ایک رسالہ ''زغل العلم'' کے نام سے منسوب ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعد میں علامہ ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ کے سخت مخالف ہو گئے تھے، لیکن اس کی نسبت حافظ ذہبیؒ کی طرف پوری طرح ثابت کرنا مشکل ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

حافظ ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ

''مقبرۃ الصوفیہ'' میں جو تین قبریں باقی رہ گئی ہیں، ان میں تیسری قبر جو علامہ ابن تیمیہ رحمتہ اللہ کی پائنتی کی طرف ہے، حافظ ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ کی بیان کی جاتی ہے۔ ان کا نام اسماعیل تھا، لقب عماد الدین اور کنیت ابوالفداء۔ یہ حافظ مزّی کے داماد بھی تھے اور ان کے خاص شاگرد بھی۔ وہ علامہ ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ کے بھی شاگرد تھے اور شافعی المسلک ہونے کے باوجود ان کے بعض نظریات میں ان سے متفق بھی۔ لیکن حافظ ذہبیؒ کی طرح انہوں نے بھی علامہ ابن تیمیہ رحمتہ اللہ کے مناقب بیان کرنے کے بعد ان پر بڑا معتدل تبصرہ فرمایا ہے:

وبالجملة، كان من كبار العلماء وممّن يصيب ويخطئي وقد صح في البخاري: "اذا اجتهد الحاكم فأصاب فله أجران، وإذا اجتهد فاخطأ فله أجر" وقال الإمام مالک بن أنس: كل أحد يؤخذ من قوله ويترک إلا صاحب هذا القبر (ﷺ).

خلاصہ یہ ہے کہ علامہ ابن تیمیہ رحمتہ اللہ علیہ بڑے علماء میں سے تھے اور دوسرے علماء کی طرح ان سے بھی صحیح باتوں کے ساتھ غلطیاں بھی ہوئیں اور بخاری کی صحیح حدیث میں ہے کہ فیصلہ کرنے والا حق تک پہنچنے کی کوشش کر کے صحیح فیصلہ کرے تو اسے دو اجر ملتے ہیں اور کوشش کے باوجود غلطی کر جائے تو ایک اجر۔ نیز امام مالک بن انس رحمتہ اللہ علیہ نے نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''آپ ﷺ کے سوا ہر شخص کے اقوال میں کچھ قابل قبول ہوتے ہیں اور کچھ قابل ترک۔'' (البدایہ والنہایہ۔ ص:۳۰۲، ج:۱۸)

حافظ ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ بصریٰ میں پیدا ہوئے تھے، یہ صرف تین سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا، لہٰذا ان کی پرورش ان کے بڑے بھائی شیخ عبدالوہابؒ نے کی اور وقت کے کبار علماء سے علم حاصل کرنے میں اُن کی مدد کی۔ اُن کی تفسیر پر نہ صرف علماء وقت

نے اعتماد کیا بلکہ وہ بعد میں تفسیر کے بنیادی مآخذ میں شمار ہوئی۔ کیونکہ انہوں نے تفسیری روایات نقل کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ ان کی چھان پھٹک اور جرح وتعدیل کا بھی فی الجملہ اہتمام فرمایا ہے۔ اسی طرح اُن کی تاریخ ''البدایۃ والنہایۃ'' تاریخ اسلام کے مستند ترین ماخذوں میں سے ہے۔ کیونکہ انہوں نے تاریخ طبریؒ، کامل ابن اثیرؒ، تاریخ الاسلام للذہبیؒ اور اپنے شیخ حافظ علم الدین برزالی کی تواریخ کو سامنے رکھ کر واقعات کا انتخاب فرمایا ہے اور اس میں استنادِ روایات کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مدنظر رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے وسعت علم کے ساتھ انہیں ذوقِ عبادت بھی عطا فرمایا تھا، یہاں تک کہ ابن حبیب رحمہ اللہ نے انہیں ''امام ذی التسبیح والتہلیل'' (تسبیح وتہلیل کا امام) قرار دیا ہے۔ (انباء الغمر، للحافظ ابن حجر، ص: ۴۶، ج: ۱) اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے شگفتہ طبعیت عطا فرمائی تھی اور ان کی مجلسیں پاکیزہ مذاق کی حامل ہوتی تھیں۔ شعروادب کا بھی ذوق تھا اور ان کے یہ دو شعر اس ذوق کی شہادت دیتے ہیں:

تَمُرُّ بِنَا الْأَيامُ تترى وَإِنْمَا   نُساق إلى الآجالِ والعينُ تنظرُ
فلا عائد ذاك الشباب الذى مضى   ولا زائل هذا المشيب المكدّر

(إنباء الغمر بأنباء العمر، ١: ٤٠ ذكر من مات سنة ٧٧٤ھ)

ہمارے سامنے دن ہیں کہ گذرے چلے جاتے ہیں اور ہم ہیں
کہ اپنی آنکھوں کے سامنے موت کی طرف ہنکائے جارہے ہیں
جوانی جو گذر گئی ہے اب نہ وہ واپس آنے والی ہے اور نہ یہ بڑھاپا
جس نے زندگی مکدر کردی ہے، جانے والا ہے۔

۱۵ر شعبان ۷۷۴ھ کو وفات پائی اور اپنے دو استادوں کے ساتھ یہاں مدفون ہیں۔

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ

دمشق کے باب الجابیہ کے آگے گذرتے ہوئے ہمارے ایک رفیق سفر نے ایک قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی قبر ہے، اس لئے وہاں بھی سلام عرض کیا، ان کا نام شمس الدین محمد بن ابی بکر تھا۔ ان کے والد علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ

علیہ کے قائم کردہ مدرسہ جوزیہ کے مہتمم تھے۔ اس لئے انہیں قیم الجوزیہ کہا جاتا تھا۔ ان کی نسبت سے یہ ''ابن قیم الجوزیہ'' کے نام سے مشہور ہوئے۔ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں یہ سب سے زیادہ ان کے ساتھ رہے۔ یہاں تک کہ قید بھی ان کے ساتھ کاٹی اور اُن کے افکار کے شارح و ناشر کی حیثیت سے پہچانے گئے۔ کم وبیش ہر مسئلے میں وہ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہم نوا تھے، بلکہ جن کلامی مسائل کا علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے میں پیچھے ذکر آیا ہے، اُن میں یہ اپنے شیخ سے بھی اس لحاظ سے آگے بڑھ گئے کہ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو افکار لمبے لمبے مقالوں میں بیان کئے تھے، انہوں نے اُن کو اپنے مشہور قصیدے میں نظم کیا جو نونیہ ابن القیمؒ کے نام سے مشہور ہے، اس میں انہوں نے جو تعبیرات اختیار کیں، وہ ان کے شیخ کی تعبیرات سے زیادہ تنقید و ملامت کا نشانہ بنیں۔

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی ایک خصوصیت اُن کی وہ کتابیں ہیں جو انہوں نے تزکیۂ نفس کے موضوع پر لکھی ہیں اور عظیم الشان فوائد کی حامل ہیں۔ ہم جیسے طالب علم اُن کی کتابوں سے استفادہ بھی کرتے آئے ہیں اور بہت سے وہ اُمور جن میں انہوں نے جمہور سے الگ راستہ اختیار کیا ہے، ان میں اختلاف بھی۔ لیکن ان کے علم و فضل اور ان کی خدمات یقیناً قابل احترام ومحبت ہیں۔

علامہ شامی کے پڑپوتے سے ملاقات

اس سفر کا ایک یادگار واقعہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کے پڑپوتے سے ملاقات ہے۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ جب شام تشریف لے گئے تھے تو علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک پڑپوتے مفتی ابوالیُسر رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی تھی جو بعد میں شام کے مفتی بھی رہے۔ معلوم ہوا کہ مفتی ابوالیُسر رحمۃ اللہ علیہ کے ایک حقیقی بھائی شیخ محمد مرشد ابوالارشاد ابھی بقید حیات ہیں۔ چنانچہ ہمارے دوست شیخ وائل حنبلی اور شیخ ناصر العجمی نے ان سے مغرب کے بعد ملاقات کا وقت لیا، اور ہم اُن کے مکان پر حاضر ہوئے۔ شیخ مرشد کی عمر اس وقت پچانوے سال ہے اور وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ جو تقریباً

ان کی ہم عمر ہیں، مکان میں تنہا رہتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ردّالمحتار کے مصنف علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ اُن کے دادا کے چچا تھے، اور انہوں نے پوری ردّالمحتار اپنے بھائی مفتی ابوالیسر سے پڑھی تھی، اور انہوں نے اپنے والد مفتی ابوالخیر سے۔ شیخ مرشد عرصۂ دراز تک دمشق میں قاضی شرعی بھی رہے اور وہاں سے ریٹائرمنٹ کے بعد گوشہ نشین ہیں۔ ضعف کے باوجود انہوں نے بڑی شفقت کا معاملہ فرمایا۔ ردّالمحتار کی اجازت بھی دی، اور کچھ کتابیں بھی عطا فرمائیں۔ اس ملاقات میں شیخ نظام یعقوبی، شیخ ناصر العجمی، شیخ وائل حنبلی اور میرے دونوں بیٹے بھی موجود تھے۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کی کتابوں سے ہم طالب علموں کو جو فیض پہنچا ہے اور اُن سے جو مسلسل رابطہ رہتا ہے، اس کی بناء پر شیخ مرشد کی ملاقات میں ہمارے لئے بڑی حلاوت کا سامان تھا۔

علامہ جمال الدین قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے سے ملاقات

شیخ ناصر العجمی نے بتایا کہ دمشق میں علامہ جمال الدین قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی پوتے شیخ سعید بن ضیاء الدین مقیم ہیں، ان کے پاس علامہ قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کا پورا کتب خانہ بھی ہے اور وہ شیخ مرشد کے بعد ان سے ملاقات کا وقت لے چکے ہیں۔ چنانچہ ہم لوگ شیخ مرشد کے بعد اُن کے مکان پر پہنچے، وہ بڑے خلیق، متواضع، اور علم دوست بزرگ ہیں، اُن کی بیٹھک چاروں طرف چھت تک کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ علامہ جمال الدین قاسمی رحمۃ اللہ علیہ تیرہویں صدی ہجری کے عالم ہیں جن کی وفات ۱۳۳۱ھ میں ہوئی۔ وہ آخر دور کے محقق علماء میں شمار ہوتے ہیں جن کی تالیفات کی تعداد سو کے قریب ہے۔ جس میں ان کی تفسیر ''محاسن التأویل'' سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور ''تفسیر القاسمی'' کے نام سے مشہور ہے۔ مجھے سب سے پہلے اُن کا نام دارالعلوم میں پڑھنے کے دوران اُس وقت معلوم ہوا جب میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو اُن کا رسالہ ''الفتویٰ فی الاسلام'' کہیں سے مستعار ملا۔ اس زمانے میں فوٹو اسٹیٹ کا رواج نہیں تھا، اس لئے حضرت والد صاحبؒ نے مولانا مظہر بقاء صاحب مدظلہم سے اس کی پوری نقل کرا کر جلد بندھوائی اور اپنے ذاتی کتب خانے

میں رکھی۔

بعد میں ان کی کتابوں میں سے ''تفسیر القاسمی'' کے علاوہ اُصول حدیث پر ان کی کتاب ''قواعد التحدیث'' سے استفادے کا اتفاق ہوا اور اس سے اُن کی غزارت علم، وسعت مطالعہ اور محققانہ مزاج کا اندازہ ہوا۔ اُن کے لائق پوتے استاذ سعید بن ضیاء الدین نے جو آج کل ایک ادیب کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں، اُن کا کتب خانہ دکھایا، معلوم ہوا کہ ان کے ذاتی کتب خانے میں تقریباً دو ہزار کتابیں تھیں، اور قریب قریب ہر کتاب پر ان کے لکھے ہوئے نوٹ گواہی دیتے ہیں کہ انہوں نے اس کا دِقت نظر سے مطالعہ کیا ہے، انہوں نے ''تفسیر القاسمی'' کا مسودہ بھی دکھایا جو بڑے پاکیزہ خط میں لکھا ہوا تھا، پھر یہ انکشاف بھی کیا کہ تفسیر القاسمی کو شائع کرتے وقت فواد عبدالباقی صاحب نے اصل کتاب کے کچھ حصے حذف بھی کر دیئے تھے، ان میں سے کچھ حصے انہوں نے اصل مسودے سے ہمیں دکھائے جو مطبوعہ تفسیر میں موجود نہیں ہیں۔

علامہ جمال الدین قاسمی رحمۃ اللہ علیہ مسلکاً اہلحدیث تھے، لیکن دوسرے مذاہب کے ائمہ وعلماء کے انتہائی قدر دان، اُن کے قلم سے مختلف رائے رکھنے والے علماء کیلئے ثقیل الفاظ نکلنے کا کوئی دستور نہ تھا، وہ اپنی تحریروں میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ اور امام غزالیؒ کی کتابوں کے اقتباسات اسی وقعت وعزت واحترام کے ساتھ نقل کرتے ہیں جس کے ساتھ علامہ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کے اقتباسات نقل فرماتے ہیں۔ چونکہ ان کی تفسیر آخری دور کی تصنیف ہے، اس لئے اس میں گذشتہ مفسرین کے اقوال کا خلاصہ اور عہد جدید کے بہت سے مسائل پر فکر انگیز بحثیں بھی مل جاتی ہیں۔

شیخ حسام الدین فرفور

قریبی زمانے کے علمائے دمشق میں شیخ صالح الفرفور رحمۃ اللہ علیہ کا نام علمی حلقوں میں بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ ان کے بڑے صاحبزادے شیخ عبداللطیف الفرفور ہمارے ساتھ مجمع الفقہ الاسلامی میں شام کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان کا تذکرہ میں ''جہانِ دیدہ''

میں شام کے پہلے سفر کے سلسلے میں کر چکا ہوں۔ اُن کے چھوٹے بھائی شیخ حسام الدین فرفور سے میرا تعارف اس وقت ہوا جب انہوں نے ردّ المحتار کی تیرہ جلدیں جو ان کی تخریج و تحقیق کے ساتھ شائع ہوئی ہیں مجھے کراچی بھجوائیں اور واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے جس محنت، عرق ریزی اور خوش ذوقی کے ساتھ فقہ حنفی کی اس عظیم کتاب کی خدمت کی ہے، اُسے دیکھ کر میں آفرین کہے بغیر نہ رہ سکا۔ ردّ المحتار، جسے حاشیۂ ابن عابدین اور ہمارے ملک میں فتاویٰ شامی بھی کہتے ہیں۔ عرصۂ دراز سے کسی ایسے کام کے انتظار میں تھی جس کے ذریعے مسائل کا استخراج اور ماخذ کی مراجعت آسان ہو جائے اور شیخ حسام الدین فرفور نے واقعتہً یہ کام کر کے علماء کا بہت بڑا قرض چکایا ہے۔ میں نے اسی وقت انہیں مبارکباد کا خط لکھا تھا۔ ڈاکٹر حمور نے علمائے دمشق کا جو اجتماع رات کے کھانے پر بلایا تھا، اس میں ان سے پہلی بار ملاقات ہوئی، اور ان کا اصرار تھا کہ میں ان کے مدرسہ یا گھر پر حاضر ہوں۔ وقت کی کمی کے پیش نظر میں وعدہ نہ کر سکا تھا لیکن سارے دن ان کے فون آتے رہے تھے، اس لئے قاسمی صاحب کے یہاں سے ہم ان کے مکان پر چلے گئے، خیال تھا کہ مختصر سی ملاقات کے بعد اجازت لیں گے، لیکن ان کی باغ و بہار مجلس نے اُٹھنے نہ دیا اور پھر وہیں پر انہوں نے رات کے کھانے کا انتظام بھی کر لیا، جو علماء ان کے ساتھ اس کام میں شریک ہیں، ان سے ملاقات بھی کرائی، اپنے والد کے بڑے سبق آموز واقعات سنائے اور پھر بڑے دل آویز ترنم کے ساتھ نعتیں بھی سنائیں۔ رات گئے تک یہ مجلس جاری رہی اور تمام حاضرین اس سے لطف اندوز ہوئے۔

حلب کا سفر

چار دن دمشق میں گزارنے کے بعد ہمارا پروگرام حلب جانے کا بھی تھا۔ جو دمشق کے بعد شام کا دوسرا بڑا اور تاریخی شہر ہے۔ چنانچہ ہم جمعہ ۲۸ر جنوری کی صبح نو بجے بذریعہ کار دمشق سے روانہ ہوئے۔ کار کے ذریعہ سفر کرنے میں پیش نظر یہ تھا کہ راستہ میں حمص، حماء اور معرہ جیسے شہروں میں بھی تھوڑا تھوڑا قیام ہو جائے۔ چنانچہ اس پروگرام کے تحت ہم نے

جمعہ کی نماز حمص میں پڑھنے کا ارادہ کیا ہوا تھا۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے کے دلچسپ سفر کے بعد گاڑی شہر حمص میں داخل ہوئی۔

حمص میں

حمص شام کا وہ مشہور شہر ہے جو کسی زمانے میں قیصر روم کی اقامت گاہ بھی رہا ہے۔ حضرت ابوعبیدہ ابن جراح رضی اللہ عنہ نے دمشق کی فتح سے فارغ ہو کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو یہاں بھیجا تھا اور پھر خود ان کے ساتھ آ کر شامل ہو گئے تھے۔ شروع میں یہاں لڑائی ہوئی، لیکن بعد میں اہل شہر نے صلح کی پیشکش کی اور اس طرح دمشق کی طرح یہ شہر بھی صلحاً فتح ہوا اور صحابہؓ و تابعین اور بڑے بڑے علماء اور اہل اللہ کا مرکز رہا۔ مشہور روایت کے مطابق حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ یہیں پر مدفون ہیں اور انہی کے نام پر یہاں کی سب سے بڑی جامع مسجد خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کہلاتی ہے۔ ہمیں نمازِ جمعہ اسی مسجد میں ادا کرنی تھی، چنانچہ ہم اذانِ اوّل سے ذرا پہلے مسجد میں داخل ہوئے، مسجد بڑی پُرشکوہ تھی اور مؤذن کی اذان نے سماں باندھ دیا، پوری مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی، اور شدید سردی کے باوجود پورا صحن آباد تھا۔ ایک نوجوان خطیب نے مفید خطبہ دیا اور اس کے بعد نماز جمعہ ادا کی گئی۔ جمعہ کے بعد اعلان ہوا کہ احتیاط الظہر ادا کی جائے گی، چنانچہ لوگوں کی خاصی تعداد اس میں شریک ہوئی۔ یہ احتیاط الظہر جسے فقہاء نے بدعت کہا ہے بعض ممالک میں اس شبہ کی بناء پر ادا کی جاتی ہے کہ شاید جمعہ کی صحت کی شرائط میں سے کوئی شرط مفقود ہو۔ میں نے چینی ترکستان میں بھی اس کا رواج دیکھا، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ بے اصل چیز ہے، اور اس سے اجتناب کرنا چاہئے۔

مسجد ہی کے ایک گوشے میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا مزار بیان کیا جاتا ہے، وہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جن کے نام اور ان کے کارناموں سے مسلمانوں کا بچہ بچہ واقف ہے، انہوں نے اسلام کیلئے سو سے زیادہ جنگیں لڑیں اور ان کا یہ مقولہ مشہور ہے کہ ”جس رات میں مجھے کوئی نئی نویلی دلہن پیش کی جائے، یا مجھے کسی لڑکے کی ولادت کی

خوشخبری دی جائے، مجھے اُس رات سے زیادہ محبوب نہیں جو سختیوں سے بھری ہوئی ہو اور میں اس میں مہاجرین کے کسی لشکر کے ساتھ دشمن سے نبرد آزما ہوں۔"

(الاصابہ۔ ص ۲۱۸، ج:۲)

جنگ یرموک کے موقع پر ان کی ٹوپی گم ہوگئی تھی، انہوں نے بہت اہتمام سے اسے تلاش کروایا، لوگوں نے اس اہتمام کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ میں نے اس ٹوپی میں حضور سرورِ دو عالم ﷺ کے موئے مبارک رکھے ہوئے ہیں۔ جس جنگ میں بھی یہ ٹوپی میرے ساتھ ہوتی ہے، اس میں مجھے کھلی آنکھوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

(الاصابہ۔ ص ۲۱۷، ج:۲)

یہ بھی کرشمہ قدرت ہے کہ اتنی جنگیں لڑنے کے باوجود حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی وفات بستر پر ہوئی اور ان کا یہ مقولہ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمایا کہ:

لقد طلبت القتل مظانه، فلم يقدرلي إلا أن أموت على فراشي، وما من عملي شئ أرجى عندي بعد أن لاإله الا الله من ليلة بتها وأنا متترس والسماء تهلني تمطر إلى الصبح حتى نغير على الكفار.

> جہاں جہاں مجھے قتل ہونے کا گمان ہوسکتا تھا، میں وہاں وہاں (شہادت کی طلب میں) پہنچا، لیکن میرے مقدر میں یہی تھا کہ میں اپنے بستر پر مروں اور کلمہ طیبہ کے بعد مجھے اپنے کسی عمل سے اتنی زیادہ (ثواب کی) اُمید نہیں جتنی اس رات سے ہے جو میں نے سر پر ڈھال رکھ کر اس حالت میں گزاری کہ آسمان سے صبح تک بارش برستی رہی اور صبح کے وقت ہم نے کفار پر حملہ کیا۔"

اس کے بعد انہوں نے وصیت کی کہ میرے تمام ہتھیار اور گھوڑے اللہ کے راستے میں جہاد کیلئے دیدیئے جائیں۔ مشہور تو یہی ہے کہ ان کی وفات حمص میں ہوئی لیکن دوسری

روایت یہ بھی ہے کہ انہوں نے مدینہ منورہ میں وفات پائی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ان کے جنازے میں شریک ہوئے، علامہ حموی رحمتہ اللہ علیہ نے اسی کو صحیح قرار دیا ہے۔ لیکن حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اکثر روایات ان کے حمص میں وفات پانے پر دلالت کرتی ہیں۔ (معجم البلدان۔ ص:۳۰۳، والاصابہ۔ ص:۲۱۹، ج:۲)

اسی مسجد کے ایک اور گوشے میں حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی قبر بتائی جاتی ہے اور علامہ حموی رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قبر کے قریب دوآبہ دجلہ و فرات کے فاتح حضرت عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ کی قبر کا بھی ذکر کیا ہے۔ حمص ہی میں ایک اور جگہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کا مزار بھی بنا ہوا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مختلف صحابہ اور بزرگوں کے مزارات کے بارے میں روایات اتنی مختلف ہیں کہ کوئی بات یقین کے ساتھ کہنی مشکل ہے۔

نمازِ جمعہ کے بعد مسجد خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے خطیب بڑی محبت اور تپاک سے ملے اور انہوں نے مسجد کی خاص خاص جگہوں کا معائنہ کرایا۔ ہم مسجد سے نکلے تو ایک عمر رسیدہ بزرگ رہنمائی کیلئے ساتھ ہوگئے اور گاڑی کے گذرتے ہوئے ایک جگہ رُک کر انہوں نے بتایا کہ یہاں حضرت کعب الاحبار رحمتہ اللہ علیہ کا مکان تھا۔ کعب الاحبارؒ ان تابعین میں سے ہیں جو اصلاً یہودی اور پچھلی کتبِ مقدسہ کے بڑے عالم تھے، نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں پیدا ہو چکے تھے، لیکن زیارت سے محروم رہے اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد مسلمان ہوئے، ان سے اسرائیلی روایات بہت مروی ہیں اور میں نے ''علوم القرآن'' میں ان کی استنادی حیثیت پر گفتگو کی ہے۔

حمص سے تقریباً پچاس کلو میٹر کے فاصلے پر ایک قلعہ ''قلعۃ الحصن'' کے نام سے مشہور ہے، ہمارے رہنما ہمیں وہاں لے گئے، یہ سرسبز و شاداب وادیوں کے درمیان ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر بنا ہوا ایک نہایت مستحکم قلعہ ہے، جو اصل میں عیسائیوں نے بنایا تھا، اور علاقے میں سب سے بلند جگہ ہونے کی بناء پر وہ اسے آس پاس کی مسلمان بستیوں کے

خلاف قتل و غارت گری کیلئے استعمال کرتے تھے، بالآخر ایوبی دور میں اسے مسلمانوں نے فتح کرکے اس شر کا خاتمہ کیا۔ علاقے کے سب سے بلند پہاڑ پر بنے ہوئے اس قلعے کی فصیل پر چڑھ کر اسے فتح کرنے والوں کے عزم اور حوصلہ کا اندازہ وہی شخص کرسکتا ہے جو پہاڑ کے دامن میں کھڑا ہو کر اس کی بلندی کو دیکھے۔ قلعے کی فصیل سے چاروں طرف پھیلی ہوئی سرسبز وادیوں کا منظر انتہائی دلفریب تھا، یہاں بنی ہوئی ایک مسجد میں ہم نے نمازِ عصر ادا کی۔

حماۃ میں

دمشق سے نکلتے ہی ہمارے پاس شہر حماۃ کے ایک نوجوان عالم شیخ مرہف کا بار بار موبائل پر فون آرہا تھا کہ حلب جاتے ہوئے راستے میں حماۃ شہر میں ضرور کچھ قیام کریں۔ حلَب کے معروف عالم شیخ نورالدین عتر سے (جن کی علم حدیث پر متعدد کتابیں اہل علم میں مقبول ہیں) میری پہلے سفر شام کے وقت سے ملاقات تھی، شیخ مرہف نے بتایا کہ وہ بھی حماۃ میں ہیں، اور ان کی بھی خواہش ہے کہ ہم راستے میں وہاں رُکتے ہوئے جائیں۔

حماۃ شام کا ایک اور مشہور تاریخی شہر ہے جہاں سے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے ہیں۔ علامہ یاقوت حمویؒ (صاحب معجم البلدان) اور علامہ زین الدین حمویؒ (شارح الاشباہ والنظائر) یہیں کے باشندے تھے۔ یہ شہر دریائے عاصی کے کنارے واقع ہے، زمانۂ جاہلیت سے یہ شہر اپنی تہذیب وتمدن کے اعتبار سے مشہور تھا، امراؤالقیس نے اسی کے بارے میں کہا ہے کہ۔

تقطّع اَسبابُ اللُّبَانَةِ و الْهَوىٰ
عشِيّةَ جاوزنا حمَاةَ وشيزرا

ماضی قریب میں بھی یہ شہر علماء کا مرکز رہا ہے اور یہی وہ شہر ہے جہاں کے علماء کو بعث پارٹی کے اقتدار کے بعد شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ جہاں علماء کا قتل عام ہوا اور اب

بھی یہاں کے بہت سے علماء جیلوں میں بند ہیں۔

چونکہ یہ شہر حلب کے راستے ہی میں پڑتا ہے، اس لئے خیال ہوا کہ شیخ مرہف کی یہ دعوت قبول کرلی جائے، چنانچہ ہم مغرب کے وقت اس شہر میں داخل ہوئے اور شیخ مرہف کے مکان پر پہنچے تو وہاں حماۃ کے علماء کا اچھا خاصا بڑا اجتماع تھا، شیخ نورالدین عتر بھی موجود تھے۔ عشاء کے بعد تک یہاں ان اہل علم کے ساتھ پُرلطف مجلس جمی رہی۔ تمام حاضرین نے مجھ سے اجازت حدیث کی فرمائش کی اور اپنی نااہلی کے باوجود تبرکاً میں نے ان حضرات کو اپنے تمام مشائخ کی اسانید کی اجازت دی۔ شیخ نورالدین عتر آج کل بلوغ المرام کی شرح لکھنے میں مصروف ہیں اس کی ابتدائی جلدیں اور اپنی کچھ مزید تالیفات انہوں نے عطا فرمائیں۔ وقت مختصر تھا، اور منزل ابھی دور، اس لئے عشاء کی نماز کے بعد ہم جلد ہی یہاں سے روانہ ہوگئے۔

معرّہ اور دیر سمعان

حماۃ سے نکلنے کے بعد حلب سے پہلے ایک اور قدیم شہر معرّہ راستے میں آتا ہے اس کا مشہور نام ‘‘معرّۃ النعمان’’ ہے اور مشہور یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے صحابی حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ یہاں سے گذرے تو یہیں پر ان کی وفات ہوئی اور یہیں وہ مدفون ہیں۔ اس لئے اسے ‘‘معرّۃ النعمان’’ کہا جاتا ہے اور یہی وہ شہر ہے جہاں عربی کا مشہور شاعر ابوالعلاء معرّی پیدا ہوا تھا، اور اس کے علاوہ بھی بہت سے علماء جو معرّی کی نسبت سے مشہور ہیں یہیں کے باشندے تھے۔

معرّہ ہی سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر دیر سمعان کے نام سے ایک جگہ ہے۔ سمعان ایک بستی کا نام ہے (واضح رہے کہ ‘‘سمعانی’’ کی نسبت سے جو علماء معروف ہیں (مثلاً علامہ عبدالکریم سمعانی) وہ اس شہر کی طرف منسوب نہیں، بلکہ اپنے کسی جد امجد کی طرف منسوب ہیں جن کا نام سمعان تھا۔ (اللباب فی تہذیب الانساب لابن اثیر۔ ص: ۱۳۸، ج: ۲) اس بستی میں ایک عیسائی راہب کی خانقاہ تھی، عربی میں راہبوں کی خانقاہ کو دیر کہتے ہیں، اس

معرّہ (شام) کی ایک مسجد

شام کا شہر حلب

لئے اس خانقاہ کا نام دیرِ سمعان ہے۔ اس جگہ کی تاریخی اہمیت اس وجہ سے ہوئی کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اسی جگہ مرض الوفات میں مبتلا ہوئے اور خانقاہ کے راہب سے اپنی قبر کیلئے جگہ خریدی۔ (تاریخ الاسلام للذہبیؒ۔ ص:۲۰۵، ج:۷)۔ پھر یہیں پر ان کی وفات ہوئی اور اسی جگہ پر ان کا مزار ہے۔ اگرچہ اُن کے نام سے ایک مزار حمص میں بھی بنا ہوا ہے جس کا ذکر میں پیچھے کر چکا ہوں لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ دیرِ سمعان میں مدفون ہیں۔ تمام مستند مؤرخین نے یہی بیان کیا ہے کہ ان کی وفات اور تدفین دیرِ سمعان میں ہوئی۔ (طبقات ابن سعد ص:۴۰۴، ۴۰۵، ج:۵۔ تاریخ الاسلام للذہبی ص:۲۰۵، ج:۷۔ سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن الجوزی ص ۳۲۳)۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے مزار پر

ہماری گاڑی دیرِ سمعان میں داخل ہوئی تو آس پاس چھوٹی سی بستی تھی، اور اس میں ایک بڑی مسجد بنی ہوئی تھی، اسی مسجد کے احاطے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے، اور انہی کی پائنتی میں اُن کی باوفا اہلیہ حضرت فاطمہؒ کا۔ ان دونوں کی قبر پر سلام عرض کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی کسی تعاف کا محتاج نہیں، یہ تاریخ اسلام کی وہ عظیم شخصیت ہیں جنہیں پانچواں خلیفہ راشد کہا گیا ہے۔ (علامہ ابن جوزی نے حضرت مجاہدؒ، سعید بن المسیبؒ اور حسن بصریؒ وغیرہ کے اقوال نقل کیے ہیں کہ انہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو خلفاء راشدین مہدیین میں شمار کیا۔ سیرۃ، :۷۲، ۷۳)۔ انہوں نے اس وقت حکومت کی باگ ڈور سنبھالی جب بنو اُمیہ کے خلفاء میں بادشاہت کا رنگ آچکا تھا، اور حکمرانی میں شرعی احکام کی پابندی کا اہتمام باقی نہیں رہا تھا۔ اُن سے پہلے سلیمان بن عبدالملک نے اپنے دورِ خلافت میں کچھ اصلاح کی ناتمام کوشش کی تھی، لیکن وہ محض چند جزوی اصلاحات تھیں۔ اُس دور کے حساس علماء اس صورتحال سے ناخوش اور پریشان تھے۔ اُسی زمانے میں وقت کے جلیل القدر محدث اور فقیہ امام رجاء بن

حیوۃ رحمتہ اللہ علیہ تابعین میں سے تھے، متعدد صحابہ کرام کے شاگرد تھے، اور اپنے وقت میں شام کے سب سے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے (تذکرہ الحفاظ للذہبیؒ ص ۱۱۸، ج ۱) انہوں نے اصلاحِ حال کیلئے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے پاس اثر و نفوذ حاصل کیا، یہاں تک کہ خلیفہ ان پر اعتماد کرنے لگے۔ جب سلیمان بن عبدالملک مرضِ وفات میں مبتلا ہوئے اور اپنے بعد کیلئے کسی کو خلیفہ نامزد کرنے کا وقت آیا تو وہ اپنے بیٹے ایوب یا داؤد کو نامزد کرنے کا ارادہ کر رہے تھے، لیکن حضرت رجاء بن حیوہؒ نے ان سے کہا: ''اللہ تعالیٰ سے ڈریئے، آپ اپنے پروردگار کے پاس جا رہے ہیں وہ آپ سے اس معاملے میں بھی باز پرس کرے گا۔'' سلیمان نے پوچھا: 'پھر آپ کس کا مشورہ دیتے ہیں؟'' حضرت رجاء بن حیوہؒ نے فرمایا: ''عمر بن عبدالعزیز کو نامزد کر جائیں۔'' سلیمان بن عبدالملک کو خوف تھا کہ خاندان کے لوگ سخت مخالفت کریں گے۔ لیکن حضرت رجاء بن حیوہؒ نے ان کی ہمت بندھائی اور بالآخر انہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کو خلیفہ نامزد کر دیا۔

(تاریخ الاسلام للذہبیؒ۔ ص ۱۹۲، ۱۹۳۔ ج ۷)

خلافت سے پہلے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ ایک سجیلے اور خوش پوشاک نوجوان تھے، اور ان کی چال ڈھال شہزادوں کی طرح تھی، لیکن خلافت کی ذمہ داری سنبھالتے ہی ان کی زندگی میں انقلاب آ گیا۔ ابوالفرج اصبہانی نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کے ایک ہمعصر صالح سے نقل کیا ہے کہ ہم نے اپنے دھوبی سے کہہ رکھا تھا کہ ہمارے کپڑے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کے کپڑوں سے بچے ہوئے پانی سے دھویا کرو، کیونکہ ان کے کپڑوں میں مشک بہت ہوا کرتی تھی۔ اس خصوصیت کیلئے ہم دھوبی کو زیادہ پیسے بھی دیتے تھے، لیکن خلافت کے بعد ان کے کپڑوں کا حلیہ ہی بدل گیا۔ (الأغانی۔ ص ۱۵۵، ج: ۸)۔ خلافت کے اعلان اور ان کے پہلے خطبے کے بعد واپس جانے کے لئے ان کے پاس شاہی سواری لائی گئی، مگر انہوں نے واپس کر دی اور اپنے ذاتی خچر پر سوار ہو کر واپس گئے اور پہلا کام یہ کیا کہ اپنے اور اپنے خاندان کی ساری دولت بیت المال

میں داخل کردی، پچھلے حکمرانوں نے لوگوں کے جو مال غصب کئے تھے، ایک ایک کر کے سب کو لوٹائے، ظالمانہ ٹیکسوں کا خاتمہ کر دیا اور خود انتہائی سادگی کی زندگی بسر کی جس میں بسا اوقات ایک ہی جوڑا مہینوں ان کے جسم پر رہتا تھا، اسی کو دھو دھو کر پہنتے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا خوف ہر وقت ان کے ذہن پر طاری رہتا تھا۔ ان کی اہلیہ بتاتی ہیں کہ دن بھر حکومت کے کاموں میں مصروف رہنے کے بعد رات کو گھر آتے تو عشاء کے بعد بارگاہ الٰہی میں ہاتھ اُٹھا کر رات گئے تک روتے رہتے تھے۔ سرکاری باورچی خانے کے چولہے سے وضو کا پانی گرم کرنا بھی انہیں گوارا نہیں تھا، عدل وانصاف اور مخلوق خدا کی راحت رسانی کیلئے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی انہوں نے دریغ نہیں کیا، ان کو ڈھائی سال سے بھی کچھ کم حکومت کا وقت ملا اور صرف چالیس سال کی عمر میں ان کی وفات ہوئی، لیکن اس ڈھائی سال میں انہوں نے ملک کی کایا ہی پلٹ ڈالی اور خلافت راشدہ کا پورا پورا نمونہ دکھا کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ یہ سفر نامہ اس جلیل القدر خلیفہ راشد کی پوری سیرت اور حالات کا متحمل نہیں۔ علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی سیرت پر مستقل کتاب لکھی ہے اور اردو میں مولانا عبدالسلام ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ''سیرت عمر بن عبدالعزیز'' اس کی بہترین تلخیص ہے۔

تاریخ اسلام کی اس عظیم شخصیت کی قبر پر سلام عرض کرتے وقت دل کی عجیب کیفیت تھی، عظمت کردار کے اس فلک بوس پہاڑ کے سامنے اپنا وجود زمین پر ایک بوجھ محسوس ہو رہا تھا، انہی کی پائنتی میں ان کی باوفا اہلیہ حضرت فاطمہؒ مدفون ہیں، وہ فاطمہ جنہوں نے ایک شہزادی کی حیثیت سے ناز و نعم میں پرورش پائی تھی اور عمر بن عبدالعزیز سے ایک شہزادہ سمجھ کر ہی نکاح کیا تھا، لیکن جب انہوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر تم میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو تو اپنے تمام زیورات، ہیرے جواہر اور اپنی پوری دولت بیت المال میں داخل کرنی ہوگی تو انہوں نے بلا تامل جواب دیا کہ مجھے آپ کا ساتھ اس سے سینکڑوں گنا دولت قربان کر کے بھی منظور ہے، اور پھر ساری زندگی اپنے شوہر کے ساتھ عسرت کی حالت میں گزار دی۔

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

حلب میں

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے مزار سے روانہ ہوکر ہم رات گئے حلب پہنچے جو شام کا دمشق کے بعد دوسرا بڑا اور قدیم شہر ہے۔ اسی کو حلب الشہباء بھی کہتے ہیں اور عوامی طور پر اس کی وجہ تسمیہ یہ مشہور ہے کہ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قیام فرمایا تھا۔ اس وقت ایک سفید بکری اُن کے ساتھ تھی اور وہ جمعہ کے دن اُس کا دودھ دوہکر فقراء میں تقسیم فرمایا کرتے تھے، فقراء کہتے تھے "حلب حلب؟" اور کسی نے یہ جملہ بھی کہا کہ ''حلب الشہباء''۔ "حلب" عربی زبان میں دودھ دھونے کو کہتے ہیں اور ''شہباء'' کے معنی سفید بکری۔ جملے کا مطلب یہ ہوا کہ ''انہوں نے اپنی سفید بکری کا دودھ دوھا ہے۔'' علامہ حمویؒ نے یہ روایت نقل کرکے اس پر اعتراض کیا ہے کہ اُس وقت نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان عربی تھی، نہ شام کے لوگوں کی۔ البتہ انہوں نے اس امکان کا اظہار کیا ہے کہ سریانی یا عبرانی زبان کے الفاظ چونکہ عربی سے کافی ملتے ہیں۔ اس لئے شاید ''حلب'' کا لفظ ان میں سے کسی زبان میں بھی دودھ دوھنے کیلئے بولا جاتا ہو۔ (معجم البلدان للحمویؒ، ص:۲۸۲، ج:۳)۔ لیکن علامہ راغب طباخ رحمۃ اللہ علیہ نے حلب کی جو تاریخ لکھی ہے اس میں اس قصے کو بے اصل بتایا ہے اور ان کا رجحان یہ ہے کہ یہ شہر عمالقہ نے بسایا تھا اور ان کے والی کا نام حلب تھا اس لئے شہر کا نام بھی حلب پڑ گیا اور چونکہ یہاں کی زمین اور پتھر سفید تھے اس لئے اسے شہباء کہا گیا۔ واللہ اعلم۔ (اعلام النبلاء بتاریخ حلب الشہباء۔ ص:۸۳، ج:۱)۔ یہ روایت صحیح ہو یا نہ ہو لیکن یہ روایت تواتر سے نقل ہوتی چلی آئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس شہر کو کوئی نہ کوئی نسبت ضرور ہے، یہاں اُن کے بعض مآثر پائے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر حمور صاحب کے ایک دوست ڈاکٹر محمود حریثانی حلب ہی کے باشندے ہیں اور انہوں نے حلب کی تاریخ اور اس کے مآثر پر بڑا تحقیقی کام کیا ہے اور ''احیاء العرب

القدیمۃ'' کے نام سے کتاب بھی لکھی ہے۔ ہمارے حلب پہنچتے ہی اُن کا فون آیا کہ ڈاکٹر حمور نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ آپ کے حلب میں قیام کے دوران میں آپ کو حلب کے تاریخی مقامات پر لے کر جاؤں۔ دوسری طرف میرے دوست ڈاکٹر عبدالستار ابوغدہ (جو شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ کے بھتیجے ہیں) حلب ہی کے باشندے ہیں۔ مگر ان دنوں وہ کسی ضرورت سے ملک سے باہر تھے، انہوں نے حلب کے ایک باذوق تاجر جناب ادیب بازنجکی کو فون کیا کہ وہ حلب میں قیام کے دوران ہماری رہنمائی کریں۔ حلب کے ایک مشہور عالم شیخ سعید بازنجکی (حفظ اللہ) ہیں وہ کچھ عرصہ پہلے پاکستان آئے تھے تو خصوصی طور پر مجھ سے ملنے کیلئے دارالعلوم تشریف لائے تھے، اُن کو میری آمد کا پتہ چلا تو انہوں نے فون پر رات کے کھانے کی دعوت دی۔

ان پیشکشوں میں تطبیق کی صورت ہم نے یہ تجویز کی کہ پہلے دن ہم نے ڈاکٹر محمود حریثانی کی رہنمائی سے استفادہ کیا اور بعد میں شیخ سعید بازنجکی اور ادیب بازنجکی صاحب سے۔ حلب کے دو نوجوان علماء استاذ سعید رستم اور استاذ جابر کعدان میرے حلب آنے کی خبر سن کر ہوٹل آگئے اور پھر وہ بھی ہمارے ساتھ رہے۔ ڈاکٹر حریثانی ہمیں سب سے پہلے حلب کے قدیم اور تاریخی قلعہ میں لے گئے۔ یہ قلعہ حلب کے قدیم شہر کے بیچوں بیچ واقع ہے اور ۳۱۲ء میں رومیوں نے تعمیر کیا تھا (اعلام النبلاء للطباخ۔ ص۸۴، ج۱)۔ ڈاکٹر حریثانی کا کہنا تھا کہ اس قلعہ کا یہ ریکارڈ ہے کہ اُسے کسی نے طاقت کے زور سے فتح نہیں کیا۔ (مسلمانوں نے بھی اسے صلحاً فتح کیا تھا) اس کی وجہ اس کے وہ دفاعی انتظامات ہیں جو اپنے زمانے میں بے مثال تھے، اوّل تو اس کے گرد ایک بڑی خندق ہے، دوسرے قدم قدم پر دفاعی لائنیں اس طرح ترتیب دی گئی ہیں کہ دشمن کا ہر ہر انچ پر مؤثر مقابلہ کیا جا سکے۔ ہم نے قلعے تو دنیا میں بہت دیکھے ہیں، لیکن ان قلعوں کے دفاعی اسرار و رموز پہلے کبھی سمجھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ڈاکٹر محمود حریثانی نے ان اسرار و رموز کی جس طرح تشریح کی، اس سے پہلی بار تفصیل سے سمجھ میں آیا کہ قلعے کی تعمیر میں دفاعی نقطہ نظر سے کیا کیا رعایتیں رکھی جاتی

ہیں اور خاص طور پر اس قلعے میں کیا کیا انتظامات رکھے گئے ہیں۔

اس قلعے میں ایک مسجد ہے جس کے صحن میں ایک جگہ کو "مقامِ ابراہیمؑ" کہا جاتا ہے اور عوامی طور پر مشہور یہ ہے کہ اس جگہ کبھی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قیام فرمایا تھا۔ بلکہ جو لوگ ''حلب'' کی وجہ تسمیہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دودھ دوھنے کو کہتے ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں آپ بکری کا دودھ دوہا کرتے تھے۔ لیکن اس روایت کی کوئی سند نہیں ہے۔

قلعے میں ایک جگہ محکمہ آثارِ قدیمہ کے لوگ کھدائی میں مصروف ہیں اور وہاں شہر کی تین تہیں برآمد ہوئی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شہر تین مرتبہ تباہ ہوکر دوبارہ تعمیر کیا گیا ہے۔ ایک دیوار کے بارے میں حریتانی صاحب نے بتایا کہ یہ چار ہزار سال پرانی ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

قلعے سے نیچے اُتریں تو سامنے سلطان صلاح الدین ایوبی کے بیٹے کا مقبرہ ہے۔ اور اس کے دائیں جانب ایک ثانوی مدرسہ ہے، جس کے بارے میں بتایا گیا کہ ہمارے شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ اور شیخ مصطفیٰ الزرقاءؒ نے اس میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے بعد ہم حلب کی جامع اُموی میں پہنچے۔ دمشق کی جامع اُموی ولید بن عبدالملک کی بنائی ہوئی ہے اور حلب کی جامع اُموی ان کے جانشین سلیمان بن عبدالملک نے تعمیر کی تھی۔ آج کل یہ عظیم الشان مسجد مرمت کے کام کی وجہ سے بند ہے۔ لیکن حریتانی صاحب نے خصوصی طور پر کھلوائی۔ اسی مسجد کے ہال میں ایک قبر بنی ہوئی ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت زکریا علیہ السلام کی قبر ہے۔ لیکن کسی مستند روایت کی غیر موجودگی میں وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ بات کس حد تک درست ہے۔ دمشق کی جامع اُموی کی طرح یہ مسجد بھی علماء کا مرکز رہی ہے اور یہاں نہ جانے علم وفضل کے کتنے شناوروں کے حلقہ ہائے درس قائم رہے ہیں۔ ہم نے نمازِ ظہر اسی مسجد میں ادا کی۔

آج کل چونکہ مسجد مرمت کی وجہ سے بند ہے، اس لئے پنج وقتہ نمازیں اس کے پہلو میں

ایک اور مسجد میں ہورہی ہیں، یہ دراصل ایک مدرسہ تھا اور اس میں بھی بڑے بڑے علماء درس دیتے رہے ہیں، اسی کے ایک کمرے میں وہ محراب رکھی ہوئی ہے، جو نورالدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ نے اس نیت سے بنائی تھی کہ جب بیت المقدس عیسائیوں کے قبضے سے آزاد ہوگا تو یہ محراب مسجد اقصیٰ لے جائی جائے گی۔ بیت المقدس کی آزادی نورالدینؒ کے ہاتھوں مقدر نہ تھی۔ یہ سعادت سلطان صلاح الدین ایوبی کو حاصل ہوئی انہوں نے منبر تو وہاں پہنچادیا، لیکن نامعلوم وجہ کی بناء پر محراب وہاں نہ لے جائی جاسکی۔ چنانچہ یہ خوبصورت محراب جس پر لکڑی کا بڑا دلکش کام ہے، آج تک یہیں رکھی ہوئی ہے۔ ہم نے نماز عصر اسی مسجد میں ادا کی۔

مسجد کے ساتھ ہی حلب کا قدیم بازار ہے جس میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ صدیوں سے یہ اپنی وضع پر قائم ہے۔ قدیم عربی کتابوں میں بازاروں کے ساتھ ''خانات'' کا ذکر ہمیشہ پڑھتے چلے آئے۔ یہ تاجروں کے مسافر خانے ہوتے تھے جن میں وہ سامان کی برآمد کیلئے قیام کیا کرتے تھے۔ حریثانی صاحب نے بتایا کہ اس بازار میں پچاس سے زیادہ ''خانات'' ہیں۔ ان میں سے ایک نمونے کے طور پر انہوں نے ہمیں دکھایا۔ یہ ایک کشادہ چوک کے اردگرد بنے ہوئے ہوٹل نما کمرے تھے، بیرونی تاجر اپنا سامان چوک میں لاکر اتارتے اور قریب کسی مسافر خانے میں قیام کرتے جس میں اس دور کے لحاظ سے راحت کے انتظامات ہوا کرتے تھے۔

موئے مبارک

رات کو عشاء کے بعد ہم شیخ سعید بازنجکی کی کھانے کی دعوت قبول کر چکے تھے، بعد میں معلوم ہوا کہ اس رات کی یہ دعوت دراصل ادیب بازنجکی صاحب کی طرف سے تھی، مگر شیخ سعید بازنجکی کے مکان پر ادیب بازنجکی صاحب کو یہ سعادت حاصل ہے کہ ان کے پاس حضور ﷺ کا ایک موئے مبارک محفوظ ہے۔ عثمانی خلیفہ سلطان عبدالحمید تک اس کی سندِ متصل بھی وہ بیان کرتے ہیں، سلطان عبدالحمید کے بارے میں یہ بات معروف ہے کہ

انہیں حضور سرور کونین ﷺ کے تبرکات جمع کرنے کا خاص ذوق تھا اور پوری سند متصل تو شاید ان کے پاس بھی نہ ہو، لیکن انہوں نے جس اہتمام اور تحقیق سے یہ تبرکات جمع کیے تھے۔ اس کے پیش نظر ان کی صحت مستبعد نہیں ہے۔ یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ان کے پاس متعدد موئے مبارک تھے جن کی حفاظت اور برکت کے خیال سے انہوں نے مختلف قابل اعتماد حضرات کو دئے بھی تھے، اس طرح ان کے بعد تین واسطوں سے ایک موئے مبارک ادیب بازنجکی صاحب کے والد کے پاس پہنچا وہ ایک مخیّر اور صاحب ثروت تاجر تھے، جب ان کا انتقال ہوا تو ادیب بازنجکی صاحب نے ان کے تمام ورثاء سے یہ درخواست کی کہ موئے مبارک ان کو عطا ہو جائے، اس کے بعد وہ اپنے والد کے ترکے میں اپنے حصے سے دستبردار ہو جائیں گے اور اس طرح یہ عظیم تبرک ان کی طرف منتقل ہو گیا۔ وہ سال میں ایک مرتبہ اس کی عمومی زیارت کراتے ہیں لیکن میری درخواست پر انہوں نے یہ کرم کیا کہ شیخ سعید بازنجکی صاحب کے مکان پر ایک چھوٹا سا اجتماع کر کے موئے مبارک کی زیارت کرانے کا بھی اہتمام کیا۔ انہوں نے یہ عظیم تبرک ایک شیشی میں مشک وعنبر بھر کر رکھا ہوا ہے۔ رات کے کھانے کے بعد انہوں نے تمام حاضرین کو اس کی زیارت کرائی اور ہم سب اس نعمت سے مشرف ہوئے۔

موئے مبارک کی زیارت کی شرعی حیثیت

بات یہاں تک پہنچی تو مناسب ہے کہ موئے مبارک کی زیارت اور اس کے تبرک کی شرعی حیثیت بھی واضح کر دی جائے، کیونکہ اس معاملے میں خاصی افراط وتفریط پائی جاتی ہے۔ یہ بات صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے موئے مبارک خود صحابہ کرام میں تقسیم فرمائے اور صحابہ کرام نے ان کو محفوظ رکھنے اور ان سے برکت حاصل کرنے کا اہتمام فرمایا۔ اس سلسلے میں چند احادیث درج ذیل ہیں:

(۱)...... حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر جب نبی کریم ﷺ نے حلق فرمایا تو پہلے سر کے دائیں حصے کے بال منڈوائے، اور ایک ایک دو دو

بال لوگوں میں تقسیم فرمائے پھر بائیں حصے کے بال منڈوائے اور حضرت ابوطلحہ کو بال دے کر فرمایا:

اقسمه بين الناس.

(صحیح مسلم۔ کتاب الحج۔ ص:۴۲۱، ج:۱، طبع کراچی)

''یہ بال لوگوں میں تقسیم کر دو۔''

(۲)...... صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حلق فرمایا تو ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے آپ ﷺ کے موئے مبارک لئے۔

(صحیح بخاری۔ کتاب الوضو، باب ما یغسل بہ شعر الانسان، ص:۲۹، ج:۱)

(۳)...... حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبیدہ سلمانی رحمتہ اللہ علیہ سے کہا کہ ''ہمارے پاس نبی کریم ﷺ کے موئے مبارک ہیں جو ہمیں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ملے ہیں۔'' حضرت عبیدہؒ نے فرمایا: اگر میرے پاس ان میں سے ایک بال بھی ہو تو میرے لئے دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔''

(صحیح بخاری۔ کتاب الوضو، باب ما یغسل بہ شعر الانسان، ص:۲۹، ج:۱)

(۴)...... حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس حالت میں دیکھا کہ حلاق آپ ﷺ کے سر مبارک کا حلق کر رہا تھا، اور صحابہ آپ ﷺ کے گرد جمع تھے اور وہ چاہتے تھے کہ جب بھی آپ ﷺ کا کوئی بال گرے تو وہ کسی نہ کسی شخص کے ہاتھ میں پہنچے۔

(صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب قرب النبی ﷺ۔ ص:۳۹، ج:۲)

(۵)...... عثمان بن عبداللہ بن موہب کہتے ہیں کہ میرے گھر والوں نے مجھے حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک پیالہ دے کر بھیجا، اس لئے کہ حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس نبی کریم ﷺ کے کچھ بال تھے جو انہوں نے ایک شیشی میں رکھے ہوئے تھے، اور جب کسی شخص کو نظر لگ جاتی یا کوئی اور بیماری ہوتی تو وہ ایک برتن میں پانی بھر کر حضرت اُمِ

سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجتے تھے (تاکہ موئے مبارک کو پانی میں ڈبو کر وہ پانی مریض کو پلایا جائے) عثمان بن عبداللہ رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے اس شیشی میں جھانک کر دیکھا تو اس میں سرخ رنگ کے بال تھے۔

(صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب الشیب، ص:۸۷۵، ج:۲)

(۶)...... حضرت انس رضی اللہ عنہٗ کی والدہ حضرت اُم سلیم رضی اللہ عنہا، آنحضرت ﷺ کیلئے بستر بچھا دیتیں، آپ ﷺ قیلولہ فرماتے، جب آپ ﷺ سو جاتے تو وہ ایک شیشی میں آپ ﷺ کا پسینہ مبارک اور موئے مبارک جمع کر لیتی تھیں اور اس شیشی میں خوشبو بھی ڈالتی تھیں۔ جب حضرت انس رضی اللہ عنہٗ کی وفات کا وقت آیا تو انہوں نے وصیت کی کہ ان کے کفن کے حنوط میں یہ خوشبو بھی شامل کی جائے۔

(صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب من زار قوماً فقال عندہم۔ ص:۹۲۹، ج:۲)

مسلم کی روایت میں اس پر یہ اضافہ بھی ہے کہ ''جب حضور ﷺ بیدار ہوئے تو اُم سلیم سے پوچھا'' کیا کر رہی ہو؟'' انہوں نے جواب دیا'' ہمیں بچوں کیلئے اس کی برکت کی اُمید ہے۔'' اس پر آپ ﷺ نے فرمایا'' تم نے ٹھیک کیا۔''

(۷)...... حضرت انس رضی اللہ عنہٗ نے وفات کے وقت آنحضرت ﷺ کا موئے مبارک نکال کر اپنے شاگرد ثابت البنانی کو دکھایا اور فرمایا کہ ''یہ میری زبان کے نیچے رکھ دو، چنانچہ وہ اُن کی زبان کے نیچے رکھ دیا گیا، اسی حالت میں ان کی وفات ہوئی، اور اس کے ساتھ انہیں دفن کیا گیا۔'' (الاصابہ للحافظ ابن حجرؒ، ترجمۃ انسؓ۔ ص:۸۴، ج:۱)

ان تمام روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ کے موئے مبارک یا دوسرے مآثر سے تبرک نہ صرف جائز ہے، بلکہ عظیم سعادت ہے، جس کا صحابہ کرام نے اہتمام فرمایا اور آنحضرت ﷺ نے اس کی تصویب بھی فرمائی۔ (اس موضوع پر میں نے ''تکملہ فتح الملہم'' ج:۳، ص۳۶۳ میں مفصل بحث کی ہے، اہل علم اسے ملاحظہ فرما سکتے ہیں)۔

البتہ دو باتیں اس سلسلے میں یاد رکھنی چاہئیں، پہلی بات یہ ہے کہ آپ ﷺ کے تبرکات کو برکت کیلئے محفوظ رکھنا، اُن کا ادب کرنا اور ان کے پانی کو پینا، یہ باتیں تو جائز اور ثابت ہیں لیکن کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا جس میں شرک کی بُو آنے لگے، یعنی اس کے آگے رکوع یا سجدہ کی سی ہیئت بنالینا جائز نہیں ہے، کیونکہ سرکارِ دوعالم ﷺ کی سب سے پہلی تعلیم شرک اور اس کی مشابہت سے بیزاری کی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ صحابہ کرام یا تابعین کے دور میں مختلف بزرگوں کے پاس جو موئے مبارک محفوظ تھے، ان کے بارے میں انہیں یقین سے معلوم تھا کہ یہ واقعۃً آنحضرت ﷺ ہی کے تبرکات ہیں۔ اس کے برخلاف آج دنیا کے مختلف خطوں میں جو تبرکات بیان کئے جاتے ہیں اُن کے بارے میں یقین حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ البتہ ان کے بارے میں یہ احتمال ضروری ہے کہ واقعۃً یہ آنحضرت ﷺ کے تبرکات ہوں، اب بعض مواقع پر یہ احتمال قوی ہے اور بعض جگہ ضعیف۔ چونکہ یہ بات واضح ہے کہ صحابہ وتابعین نے تبرکات کو محفوظ رکھنے کا اہتمام فرمایا ہے، اس لئے ظاہر یہی ہے کہ یہ سلسلہ اُن کی اولادوں میں بھی باقی رہا ہوگا، چنانچہ جہاں نسلاً بعد نسل کوئی تبرک محفوظ چلا آرہا ہو تو تسامع اور شہرت کی بنیاد پر اس جگہ احتمال قوی ہوجاتا ہے اور جہاں اس قسم کا تسامع نہ ہو وہاں یہ احتمال ضعیف ہے۔

لیکن ایک صاحب ایمان ومحبت کیلئے تنہا یہ احتمال بھی کافی ہے کہ جس تبرک کی وہ زیارت کررہا ہے شاید وہ واقعی آنحضرت ﷺ کا موئے مبارک ہو یا اسے آپ ﷺ کے جسد اطہر سے متصل رہنے کا شرف حاصل ہو۔ صرف اس احتمال کی بنا پر بھی اگر اس کی زیارت کی جائے تو یہ بھی نہ صرف جائز ہے بلکہ محبت کا تقاضا ہے۔ البتہ ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھنا ضروری ہے اور جہاں یقین حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ ہو وہاں اس کو یقین کے درجے تک پہنچانا بھی درست نہیں۔

ادیب بازنجی صاحب نے ہمیں جس موئے مبارک کی زیارت کرائی، اُن کے پاس

اس کی سند سلطان عبدالحمید تک تو موجود ہے اور دوسری طرف یہ بات ثابت ہے کہ سلطان عبدالحمید نے آنحضرت ﷺ کے بہت سے موئے مبارک جمع اور محفوظ کرنے کا اہتمام کیا تھا، اس لئے اس تبرک میں اصلیت کا احتمال خاصا قوی ہے۔ اگرچہ سلطان عبدالحمید سے اوپر اس کی سند معلوم نہیں۔ بہرحال! ہم جیسوں کیلئے یہ احتمال ہی کیا کم نعمت تھی؟ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملا۔

شیخ سعید بازنجکی جن کے مکان پر ادیب صاحب نے عشائیہ اور اس اجتماع کا اہتمام کیا تھا۔ ماشاء اللہ بڑے باغ و بہار بزرگ ہیں، انہوں نے ہمارے استحقاق سے کہیں زیادہ اکرام ومحبت کا معاملہ فرمایا۔ اسی موقع پر انہوں نے کہا کہ حلب کے جو حصے آپ کی دلچسپی کے ہیں وہ میں آپ کو دکھانا چاہتا ہوں اور کل سارا دن میں آپ کے ساتھ رہوں گا، اور حلب کی اُن قدیم مساجد و مدارس کی سیر کراؤں گا جو ماضی میں بڑے بڑے علماء کا مرکز رہے ہیں۔ اس پیشکش کے ساتھ رات گئے یہ محفل برخاست ہوئی۔

حلب کے قدیم محلے

وعدے کے مطابق اگلے دن صبح ساڑھے نو بجے شیخ سعید بازنجکی اپنے بعض رفقاء کے ساتھ ہمیں ساتھ لے جانے کیلئے تشریف لے آئے، حلب کے نوجوان علماء شیخ سعید رستم اور استاذ جابر کعدان آج بھی ہمارے ساتھ چلنے کیلئے آگئے، اور اس طرح اچھا خاصا قافلہ بن گیا۔

شیخ سعید ہمیں حلب کے ایک ایسے علاقے میں لے گئے جہاں پہنچ کر واقعی یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم کئی صدیوں پہلے کے زمانے میں پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے ہمیں اس جگہ گاڑی سے اُتارا جو بابِ انطاکیہ کہلاتی ہے۔ حلب شہر کے گرد جو فصیل تھی یہ اس کا وہ دروازہ تھا جو انطاکیہ کی سمت کھلتا تھا اس لئے اسے بابِ انطاکیہ کہتے ہیں۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوعبیدہ ابن جراح اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم حلب کی فتح کے موقع پر اس دروازے سے شہر میں داخل ہوئے تھے۔ دمشق اور حمص کی طرح یہ شہر بھی محاصرے کے

بعد معاہدۂ صلح کے تحت فتح ہوا تھا اور یہ وہ جگہ تھی جہاں سے حضرات صحابہ کرام پہلی بار حلب میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ دروازے کے آثار ابھی تک باقی ہیں اور جب ہم دروازے کے اندر داخل ہوئے تو قدیم طرز کے محلوں اور پرانی سڑکوں کا ایک طویل سلسلہ سامنے تھا، بابِ انطاکیہ سے چند گز کے فاصلے پر شیخ سعید نے ہمیں ایک مسجد کے پاس لے جا کر کھڑا کیا اور بتایا کہ یہ وہ مسجد ہے جہاں صحابہ کرام نے حلب میں داخل ہونے کے بعد اپنی ڈھالیں رکھ کر آرام کیا تھا۔ حلب کی تاریخوں میں مذکور ہے کہ اسی جگہ حضراتِ صحابہ کرام نے حلب کی سب سے پہلی مسجد تعمیر کی جو ابتدا میں مسجد الغضائری کہلاتی تھی۔ شیخ ابوالحسن علی بن عبدالحمید الغضائریؒ بڑے درجے کے ولی اللہ اور حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ کے اصحاب میں سے تھے۔ بعد میں نورالدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ایک وقف مدرسہ قائم کیا اور اپنے وقت کے شافعی فقیہ اور زاہد علامہ شعیب ابن احمد اُندلسی رحمۃ اللہ علیہ کو یہاں فقہ شافعی کی تدریس کیلئے مقرر کیا، اس کے بعد سے یہ مسجد ”مسجد شعیب“ کہلانے لگی۔ (اعلام النبلاء للطباخ، ص: ۹۵، ج: ۱) اور چونکہ یہاں صحابہ کرام نے شہر میں داخل ہو کر اپنی ڈھالیں رکھی تھیں اس لئے اسے بعض اوقات ”مسجد الاتراس“ بھی کہہ دیتے ہیں جس کے معنی ہیں ”ڈھالوں والی مسجد۔“

تصور کی نگاہیں یہاں اُن اولوالعزم صحابہ کرام کا پڑاؤ دیکھ رہی تھیں جو عرب کے صحراؤں سے اللہ کا کلمہ لے کر نکلے اور رحمت کی گھٹا کی طرح یک بیک روم اور ایران کے اُفق پر چھا گئے۔ اللہ اکبر۔

شیخ سعید بڑے باذوق اور نفیس بزرگ ہیں، انہوں نے فرمایا کہ اب میں آپ کو پیدل چلا کر تھکانا چاہتا ہوں، اسلئے کہ جس علاقے میں آپ کو لے جانا چاہتا ہوں، وہاں گاڑی نہیں جاسکتی، اور آپ جیسے شخص کیلئے حلب کی سیر اس علاقے میں جائے بغیر ادھوری رہے گی۔ ہم تو پہلے ہی مشقت اُٹھانے کے مشتاق تھے۔ اُس وقت ہلکی ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی، شیخ سعید نے نہ جانے کہاں سے چھتریوں کا انتظام کرلیا اور ہم شہر کی اُن قدیم گلیوں میں

داخل ہو گئے جو صدیوں سے اسی طرح چلی آ رہی ہیں۔ شیخ سعید نے بتایا کہ یہ محلّہ ''جلوم'' کہلاتا ہے اور حلب کی تاریخوں میں اس کا جا بجا ذکر ملتا ہے۔ یہ محلّہ علماء، فقہا، محدثین، ادبا اور صوفیاء کرام کا مرکز رہا ہے اور اس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں قائم تھیں اور ان میں سے ہر ایک اسلامی علوم کے کسی نہ کسی شناور کا مستقر رہی ہے۔

یوں تو شیخ سعید وقفے وقفے سے بتاتے جاتے تھے کہ یہ فلاں مدرسہ ہے جس میں فلاں بزرگ درس دیتے رہے ہیں۔ یہ فلاں خانقاہ ہے جس میں فلاں ولی اللہ کا آشیانہ تھا، ان سب مقامات اور بزرگوں کے تذکرے کیلئے دفتر چاہئے، اور سچی بات یہ ہے کہ ان میں سے بہت سے مقامات کی تفصیل مجھے یاد بھی نہیں رہی، لیکن اس محلے کی تنگ گلیوں اور دو طرفہ بنے ہوئے مکانات کے درمیان سے گزرتے ہوئے قلب و روح کو ایک عجیب سرور حاصل ہو رہا تھا۔ گلیاں لمبی اور آج کل کے لحاظ سے تنگ ضرور تھیں، مگر نہایت صاف ستھری، مکانات پرانے طرز کے تھے، مگر کشادہ اور بارونق، نہ جانے کتنے علماء، فقہاء اور اہل اللہ کے انفاسِ قدسیہ ان فضاؤں میں بکھرے ہوئے ہیں کہ آج بھی یہاں آ کر نورانیت محسوس ہوتی ہے۔

قدیم حلب کے اس علاقے میں جو مقامات شیخ سعید نے دکھائے۔ ان میں سے تین مقامات کے تذکرے پر اکتفا کرتا ہوں۔

علامہ سبط ابن العجمیؒ کی مسجد رومی

جلوم کے محلے میں ایک کشادہ مسجد آج کل ''جامع منگلی بُغا'' کہلاتی ہے اور اسے ''مسجد رومی'' بھی کہتے ہیں۔ اس مسجد میں علامہ سبط ابن العجمی رحمتہ اللہ علیہ درس دیتے رہے ہیں۔ علامہ سبط ابن العجمی آٹھویں صدی کے اکابر محدثین میں سے ہیں۔ ان کا نام تو ابراہیم بن محمد بن خلیل البرہان تھا اور انہیں برہان حلبیؒ بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن وہ ''سبط ابن العجمیؒ'' کے لقب سے زیادہ مشہور ہیں۔ یعنی ابن العجمی کے نواسے۔ اور یہ بھی ایک لطیفہ ہے کہ ان کے وہ نانا ابو حامد عبداللہ ابن العجمیؒ جن کی نسبت سے انہیں سبط ابن العجمیؒ کہا گیا، وہ

بعد میں اتنے مشہور نہ رہے۔ اب اگر ابو حامد ابن العجمیؒ کا تعارف کرایا جائے تو انہیں سبط ابن العجمی کے نانا کہنا پڑے گا۔ یعنی ''ابن العجمی کے نواسے کے نانا۔''

علامہ سبط ابن العجمیؒ اسی محلہ جلوم میں پیدا ہوئے تھے۔ لغت میں یہ صاحب قاموس علامہ فیروز آبادیؒ کے شاگرد ہیں اور علم حدیث میں علماء شام کے علاوہ حافظ زین الدین عراقیؒ، حافظ ابن الملقنؒ، حافظ بلقینیؒ جیسے حفاظِ حدیث کے۔ جن سے علم حاصل کرنے کیلئے انہوں نے قاہرہ کا سفر کیا اور بالآخر حلب میں مقیم ہو کر تدریس و تصنیف میں مشغول ہوئے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ جب ۷۳۶ھ میں حلب تشریف لائے تو علامہ سبط ابن العجمیؒ سے ملاقات اور استفادہ کی نیت کی ہوئی تھی لیکن اُن کو آزمانے کیلئے حافظ ابن حجرؒ نے حدیث مسلسل بالأولیۃ اپنے خط میں سند سے لکھ کر ان کو دکھائی اور سند میں ایک ایسے شیخ کا اضافہ کر دیا جو اصل سند میں نہیں تھے، مقصد یہ جانچنا تھا کہ علامہ سبط ابن العجمیؒ کو تنبہ ہوتا ہے یا نہیں؟ لیکن وہ فوراً سمجھ گئے اور حافظ ابن حجرؒ کو باور کرا دیا کہ یہ اضافہ صحیح نہیں ہے اور پھر اپنے کسی شاگرد سے حافظ ابن حجرؒ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: یہ صاحب مجھ سے اس وقت ملے ہیں جب میں آدھا آدمی رہ گیا ہوں۔'' ان کا مقصد یہ تھا کہ فالج کے حملے کے بعد میری یادداشت کمزور ہو گئی ہے۔ (الضوء اللامع للسخاویؒ۔ ص:۱۴۴، ج:۱)

چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے پھر ان سے اجازت حدیث حاصل کی اُن کی شرح بخاری سے استفادہ کیا اور ان کا ذکر کرتے ہوئے ان کے علم و زہد کی بڑی تعریف کی اور فرمایا کہ وہ اس وقت ''بلادِ حلبیہ کے شیخ ہیں جن کا کوئی مقابل نہیں اور میری ان سے خط و کتابت ہے۔''

(الضوء للامع اللسخاویؒ۔ ص:۱۴۴، ج:۱)

علامہ تقی الدین بن فہدؒ جنہوں نے تذکرۃ الحفاظ کا ذیل لکھا ہے وہ ان کا تذکرہ کرتے ہوئے بڑے فخر سے فرماتے ہیں کہ جب وہ ۸۱۳ھ میں حج کیلئے مکہ مکرمہ آئے تو میں ان سے ملا، اور منیٰ میں ان سے سو حدیثیں پڑھیں اور انہوں نے مجھے حدیث کی عام اجازت دی اور پھر فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ ان کو تا دیر سلامت رکھ کر اُمت اسلامیہ کو مستفید فرمائے۔''

(لحظ الالحاظ، لابن فہدؒ، ذیول تذکرۃ الحفاظ، ص: ۳۱۴)

شیخ سبط ابن العجمیؒ نے صحیح بخاری، صحیح مسلم اور ابن ماجہ پر حواشی بھی لکھے ہیں اور ان کی کتاب ''نہایۃ السوٴل'' صحاحِ ستہ کے رجال پر شائع ہوچکی ہے اور بہت سی کتابیں نایاب ہوگئی ہیں۔

علم وفضل کے مقام بلند کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں عبادت واطاعت، زہد وتقویٰ اور حسن اخلاق کا بھی ایک نمونہ بنایا تھا۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ ان کی زبان پر اکثر تلاوت جاری رہتی تھی، بکثرت روزے رکھتے اور رات کو جاگتے۔ دولت وثروت کی کوئی حرص نہ تھی، معمولی اور سادہ معیشت کے عادی تھے۔ دو مرتبہ انہیں قضاء کا عہدہ پیش کیا گیا، مگر انہوں نے معذرت کرلی۔

تیمور لنگ نے حلب پر حملہ کیا تو یہ اپنی کتابیں لے کر قلعہ میں چلے گئے تھے، پھر جب تیمور لنگ نے شہر پر قبضہ کیا تو انہیں گرفتار کرلیا گیا اور جب تیمور دمشق روانہ ہوا اور یہ آزاد ہوکر اپنے گھر پہنچے تو گھر والے وہاں سے غائب تھے، مدت کے بعد پتہ چلا کہ انہوں نے تیمور سے بھاگ کر کسی جگہ پناہ لی تھی پھر وہ سب واپس بھی آگئے اور شیخ کی کتابیں بھی قلعہ سے مل گئیں۔

ایک اور مرتبہ کسی دشمن نے حلب کا محاصرہ کیا، لوگ خوف زدہ تھے، اسی حالت میں حلب کے ایک باشندے نے خواب میں علامہ سراج بلقینیؒ کو دیکھا کہ وہ کہہ رہے ہیں ''اہل حلب کوئی اندیشہ نہ کریں، بس تم حدیث کے خادم ابراہیم محدث (سبط ابن العجمیؒ) کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ کتاب عمدۃ الاحکام پڑھیں، تاکہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی مشکل آسان فرمائے''۔ اس شخص نے بیدار ہوکر شیخ کو خواب بتایا۔ شیخ نے جمعہ کے دن طلبہ کی ایک جماعت کے سامنے عمدۃ الاحکام پڑھی اور مسلمانوں کے لئے مشکل آسان ہونے کی دعا مانگی۔ اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ اسی دن کے آخر میں اہل حلب کو حملہ آوروں پر فتح حاصل ہوگئی۔

یہ واقعہ حافظ سخاویؒ نے نقل کیا ہے اور اگر یہ صحیح ہے تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض اوقات اپنے کسی بندے کو خواب میں دکھا کر دوسروں کو بشارت دیتے ہیں۔ بسا اوقات جس بندے کو خواب میں دکھایا جا رہا ہے اس کو پتہ بھی نہیں ہوتا، اور اس کی زبانی مستقبل کے بارے میں کوئی بات کہلا دی جاتی ہے۔ یہ رویائے صالحہ کی ایک شکل ہے۔

یہ مسجد جس میں ہم کھڑے تھے، جامع منگلی بُغا اس لئے کہلاتی ہے کہ یہ حلب کے ایک عادل گورنر منگلی بغا نے آٹھویں صدی میں تعمیر کی تھی، اور علامہ سبط ابن العجمیؒ نے یہاں درسِ حدیث کا سلسلہ جاری فرمایا۔ حافظ ابن حجرؒ بھی اُن سے ملاقات کیلئے یہیں تشریف لائے۔ مسجد اب تک مضبوط اور آباد ہے۔ جب ہم محراب کے قریب اُس جگہ پہنچے جہاں کہا جاتا ہے کہ علامہ سبط ابن العجمیؒ کا درس یہاں ہوا کرتا تھا تو ہمارے رفقاء میں سے استاذ جابر کعدان نے مجھ سے ایک عجیب فرمائش کر دی، وہ کہنے لگے کہ مجھے چونکہ یہ معلوم ہو گیا تھا کہ شیخ سعید بازنجکی آپ کو جامع منگلی بغا لے کر جائیں گے، اس لئے میں اپنے گھر سے آپ کی صحیح مسلم کی شرح ”تکملہ فتح الملہم“ ساتھ لے کر چلا تھا، تا کہ علامہ سبط ابن العجمیؒ کی جگہ بیٹھ کر آپ کے سامنے اس کا کچھ حصہ پڑھوں، انہوں نے یہ فرمائش اس انداز سے کی کہ میں انکار نہ کر سکا اور یہاں بیٹھ کر انہوں نے تکملہ فتح الملہم کا کچھ حصہ میرے سامنے پڑھا۔

جامع منگلی بغا کے بعد شیخ سعید بازنجکی کہنے لگے کہ قدیم مدارس کی ایک جھلک تو آپ نے دیکھ لی، اب میں آپ کو صوفیاء کرام کی ایک قدیم خانقاہ دکھانا چاہتا ہوں (خانقاہ کو ان علاقوں میں ”زاویہ“ کہتے ہیں) چنانچہ وہ ہمیں نقشبندی مشائخ کے ایک زاویہ میں لے گئے۔ شام کے زاویوں کا ذکر تو کتابوں میں بہت پڑھا تھا لیکن آنکھوں سے مشاہدے کا موقع پہلی بار ملا۔ یہاں مسجد کی بالائی منزل میں ذاکرین کے خلوت کدے قدیم زمانے کے بنے ہوئے ہیں جن میں سالکین چلہ کشی کیا کرتے تھے۔ اس وقت جو صاحب زاویے کے منتظم ہیں انہوں نے بڑے اکرام کا معاملہ کیا اور بتایا کہ اب بھی یہاں عوامی درس کے علاوہ ذکر و شغل کی مجلسیں ہوتی ہیں۔

مقام الخلیل

اس کے بعد شیخ سعید باز نجکی ہمیں جلوم کے محلے سے ایک اور محلے میں لے گئے یہاں ایک مسجد تھی جو قدیم زمانے سے ”مقام الخلیل“ کے نام سے مشہور ہے۔ لوگوں میں یہ روایت عام ہے کہ اس جگہ حضرات ابراہیم علیہ السلام نے قیام فرمایا تھا۔ ہم نے اس مسجد میں نمازِ ظہر ادا کی، نماز کے بعد امام صاحب نے دیوار قبلہ کے قریب بنے ہوئے گڑھے میں ایک پاؤں کا نشانہ دکھایا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں کا نشان ہے۔ پھر وہ قبلہ کی جانب بنے ہوئے ایک اور کمرے میں لے گئے جہاں ایک محراب میں ایک پتھر اُبھرا ہوا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس سے ٹیک لگا کر بیٹھتے تھے۔ ان روایات کی توثیق و تصدیق کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا شام میں قیام فرمانا تو مستند روایات سے ثابت ہے لیکن اس کی جگہ کا تعین تقریباً ناممکن ہے، یہ ضرور ہے کہ صدیوں سے یہ جگہ ”مقام الخلیل“ کے نام سے مشہور ہے اور قدیم کتابوں میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔ واللہ اعلم۔

علامہ علاؤالدین کاسانی رحمتہ اللہ علیہ

اسی مسجد کے شمال میں مشہور حنفی فقیہ علامہ علاؤالدین کاسانی رحمتہ اللہ علیہ کا مزار واقع ہے۔ علامہ کاسانی کی کتاب ”بدائع الصنائع“ اُن کتابوں میں سے ہے جن سے ہم جیسے طالب علم دن رات استفادہ کرتے رہتے ہیں، اور حسن ترتیب کے اعتبار سے یہ فقہ حنفی کی نفیس ترین کتاب ہے جسے اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی مقبولیت سے نوازا ہے۔ اس کی تالیف کا عجیب واقعہ یہ ہے کہ علامہ علاؤالدین کاسانی رحمتہ اللہ علیہ کے استاذ علامہ محمد بن احمد سمرقندی رحمتہ اللہ علیہ کی صاحبزادی فاطمہ بھی عالمہ تھیں، اور انہوں نے اپنے والد کی کتاب حفظ کرلی تھی۔ وہ حسن و جمال میں بھی بہت فائق تھیں اور بعض شہزادوں کی طرف سے ان کے رشتے آچکے تھے، لیکن ان کے والد کسی اچھے عالم سے ان کا نکاح کرنا چاہتے تھے، اسی

دوران اُن کے شاگرد علامہ کاسانی رحمتہ اللہ علیہ اُن کی خدمت میں آئے اور انہوں نے نہ صرف ان سے بہت سی کتابیں پڑھیں بلکہ ''تحفۃ الفقہاء'' کی مبسوط شرح دمج کے طریقے پر لکھی۔ یعنی اسی طرح کہ متن اور شرح یکجان ہوگئے۔ استاذ نے جب شرح دیکھی تو نہایت مسرور ہوئے اور اپنی صاحبزادی فاطمہ کا نکاح ان کے ساتھ کردیا اور اسی کتاب کو ان کا مہر مقرر کیا، یہاں تک کہ علامہ کاسانی رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں یہ فقرہ مشہور ہوگیا کہ:

شرح تحفته و تزوج ابنته

''انہوں نے اپنے استاذ کی کتاب تحفہ کی شرح لکھی اور انہی کی بیٹی سے نکاح کیا۔''

میں نے اپنے والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ سے سنا کہ اس کے بعد جب اس گھرانے سے کوئی فتویٰ جاری ہوتا تو اس پر باپ، بیٹی اور داماد تینوں کے دستخط ہوتے تھے۔

علامہ کاسانی رحمتہ اللہ علیہ کی فاضل اہلیہ پہلے وفات پاگئی تھیں اور علامہ کاسانی رحمتہ اللہ علیہ نے ہر جمعہ کی شب میں ان کی قبر پر جانا نہیں چھوڑا۔ پھر جب ان کی وفات ہوئی تو انہیں بھی اپنی اہلیہ کے ساتھ دفن کیا گیا، یہاں تک کہ اہل حلب میں یہ دونوں قبریں "قبر المرأة و زوجها'' کے نام سے مشہور تھیں اور لوگوں میں یہ بھی مشہور تھا کہ یہاں جو دعا مانگی جائے وہ قبول ہوتی ہے۔

(الفوائد البہیہ۔ ص:۵۳، ج:۱۔ و اعلام النبلاء للطباخ۔ ص:۲۸۶ تا ۲۸۸، ج:۴)۔

الحمد للہ دونوں کی قبروں پر سلام عرض کرنے اور ایصالِ ثواب کی توفیق ہوئی اور اس طرح شیخ سعید بازنجکی کی معیت میں حلب کے قدیم علاقے کی یہ سیر بڑی دلچسپ اور روح پرور ثابت ہوئی۔ دوپہر کو انہوں نے اپنے مکان پر اپنی طرف سے ظہرانہ کا اہتمام کیا ہوا تھا (کیونکہ گذشتہ شب عشائیہ ادیب بازنجکی صاحب کی طرف سے تھا) اور اس میں بعض اعیانِ بلد کو بھی مدعو کیا تھا، چنانچہ ہم ان کے مکان پر پہنچے اور مغرب کے قریب تک وہاں ایک دلچسپ اجتماع رہا۔

اگلی صبح ہم حلب سے بذریعہ طیارہ عمان کیلئے روانہ ہوئے جہاں تین دن قیام رہا۔ اردن کے مقامات کا حال میں ”جہانِ دیدہ“ میں لکھ چکا ہوں اور اس سے زیادہ بہتر اور مفصل تذکرہ برادر معظم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم کے سفرنامہ شام میں آچکا ہے جو ”انبیاء کی سرزمین میں“ کے نام سے البلاغ میں قسط وار شائع ہو چکا ہے۔

کرغیزستان کا سفر

رجب۔ ۱۴۲۷ھ

اگست 2006ء

کرغیزستان کا سفر

(رجب۔ ۱۴۲۷ھ / اگست 2006ء)

حمد وستائش اس ذات کیلئے ہے جس نے اس کارخانہ عالم کو وجود بخشا
اور
درود وسلام اس کے آخری پیغمبر ﷺ پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

وسط ایشیاء کی جو مسلم ریاستیں ستر سال سے زائد سوویت یونین کی محکوم رہیں، اور سوویت یونین کے تار تار ہونے کے بعد آزاد ہوئیں۔ وہ ازبکستان، تاجکستان، کرغیزستان، قازقستان اور ترکمانستان کے ناموں سے اب الگ الگ ملکوں کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔ یہ پورا علاقہ کسی زمانے میں ترکمانستان کہلاتا تھا اور علم وفضل کا بہت بڑا مرکز تھا جہاں سے تاریخ اسلام کی وہ جگمگاتی ہوئی شخصیات پیدا ہوئیں جن کے علم سے آج پورا عالم اسلام فیضیاب ہو رہا ہے۔ سوویت یونین کے عہد اقتدار میں ان ریاستوں کے علماء وصلحاء پر جو قیامت گذری ہے ان کے مفصل حالات شاید کبھی منظر عام پر نہ آسکیں۔ ستر سال تک ان ریاستوں کا رابطہ نہ صرف عالم اسلام، بلکہ باقی ساری دنیا سے اس طرح کٹا رہا ہے کہ نہ باہر کا کوئی شخص آسانی سے وہاں پہنچ سکتا تھا نہ وہاں کے لوگ باہر آسکتے تھے، بلکہ خط وکتابت کے ذریعے بھی ان سے رابطہ نہیں ہوسکتا تھا۔

ان ریاستوں کی آزادی کے بعد اب راستے کھلے ہیں اور وہاں آمد ورفت ممکن ہوئی ہے۔ ان ریاستوں میں سے ازبکستان وہ ریاست ہے جہاں مسلمانوں کی علمی تاریخ کے

سب سے بڑے مراکز بخارا، سمرقند، ترمذ، فرغانہ اور تاشقند واقع ہیں اور ۱۹۹۲ء میں علماء کی ایک جماعت کے ساتھ میں وہاں کا سفر کر چکا ہوں، مگر افسوس ہے کہ خواہش کے باوجود اس سفر کے حالات قلمبند نہیں کر سکا۔

الحمدللہ! ان علاقوں میں تبلیغی جماعت نے اپنا کام بڑی محنت اور حکمت کے ساتھ پھیلایا ہے۔ جماعت ہی کے ایک فعال رکن جناب جاوید ہزاروی صاحب نے اپنے بعض رفقاء کے تعاون سے کرغیزستان میں ایک دینی مدرسہ بھی قائم کیا ہے، اور تقریباً ڈیڑھ سال سے اُن کا اصرار تھا کہ میں کرغیزستان کا ایک دورہ کروں۔ وہ ان تمام ریاستوں میں بار بار سفر کر چکے ہیں اور وہاں کے حالات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انہوں نے بتایا اور بعد میں اس بات کی تصدیق بھی ہوئی کہ ان ریاستوں میں سے کرغیزستان ایسا ملک ہے جس میں دوسری ریاستوں کے مقابلے میں دین کی دعوت اور تعلیم کیلئے فضا زیادہ سازگار ہے، اس لئے یہاں مختلف جہتوں سے کام کرنے کی ضرورت بھی ہے اور اس کے بڑے فائدے کی بھی اُمید ہے۔

اس سال رجب کے آخر میں جب دارالعلوم کا تعلیمی سال ختم ہوا تو میں نے اس سفر کا ارادہ کرلیا۔ جاوید ہزاروی صاحب کے علاوہ جناب حافظ فیروزالدین صاحب بھی سفر میں ساتھ تھے۔ اگرچہ اس سے پہلے وہ وہاں نہیں گئے تھے لیکن وہاں کے دعوتی اور تعلیمی کاموں میں یہیں سے تعاون فرماتے رہے ہیں۔

کرغیزستان کا دارالحکومت بشکیک (Bishkek) کہلاتا ہے، اگر کراچی سے کوئی براہِ راست پرواز مہیا ہو تو چار ساڑھے چار گھنٹے میں وہاں تک پہنچنا ممکن ہے، لیکن ابھی تک کسی باقاعدہ ایئر لائنز نے کراچی سے کرغیزستان کیلئے کوئی فضائی سروس شروع نہیں کی، اس لئے دبئی یا استنبول کے ذریعے وہاں جانا پڑتا ہے جو بڑا طویل سفر بن جاتا ہے۔ لیکن کرغیزستان کے ایک تاجر عزیز صاحب ہفتے میں ایک مرتبہ ایک پرائیوٹ جہاز چارٹر کرکے پاکستان لاتے اور لے جاتے ہیں جس میں مسافروں کی بھی گنجائش ہوتی ہے اور کارگو کی بھی۔ پہلے

وہ کراچی آیا کرتے تھے لیکن اب اسلام آباد آ کر واپس چلے جاتے ہیں۔ بشکیک پہنچنے کیلئے ہمیں یہ راستہ آسان معلوم ہوا۔ چنانچہ ۲۷ رجب ۱۴۲۷ھ مطابق ۲۳؍ اگست ۲۰۰۶ء کی صبح ہم کراچی سے اسلام آباد پہنچے اور عزیز صاحب کے جہاز کے ذریعے مغرب کے قریب اسلام آباد سے روانہ ہوئے۔ یہ ایک قدیم طرز کا روسی جہاز تھا جس میں ایئر کنڈیشننگ کا بھی انتظام نہیں تھا، اور راستے کے بیشتر حصے میں گرمی کا احساس ہوتا رہا، لیکن عزیز صاحب نے ہمارے لئے نسبتاً بہتر سیٹیں مہیا کیں اور اُس جہاز کے دائرے میں رہتے ہوئے بڑی محنت سے ہر ممکن سہولتیں فراہم کیں۔ یہ تقریباً تین گھنٹے کا سفر تھا۔ کرغیزستان کا وقت پاکستان سے ایک گھنٹہ آگے ہے، اس لئے جب ہم بشکیک کے ہوائی اڈے پر اُترے تو وہاں رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ان ریاستوں میں مفتی ایک سرکاری عہدہ ہے، جو وزیر مذہبی اُمور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس عہدے پر فائز حضرات فتویٰ سے زیادہ مساجد کے انتظام اور دیگر مذہبی انتظامی اُمور انجام دیتے ہیں۔ کرغیزستان کے مفتی مراد علی جمانوف ہیں، انہی کے دعوت نامے پر ہمیں کرغیزستان کا ویزا ملا تھا اور انہوں نے ہمارے استقبال کے خصوصی انتظامات کئے ہوئے تھے۔ بشکیک کا ہوائی اڈہ بین الاقوامی معیار کا ہے اور ایئرپورٹ کے ذمہ دار افسران و نائب مفتی صاحب نے جہاز کی سیڑھیوں پر ہی ہمارا استقبال کیا اور وی آئی پی لاؤنج کے ذریعے امیگریشن وغیرہ کے مراحل نمٹائے۔ مفتی مراد علی صاحب اس وقت سفر پر تھے، نائب مفتی صاحب اور ان کے رفقاء نے ان کی معذرت پہنچائی۔ ایئرپورٹ سے روانہ ہوئے تو سرکاری پائلٹ آگے آگے چل رہا تھا۔ یہاں کے حضرات کا کہنا ہے کہ کرغیزستان میں یہ پہلا موقع ہے کہ دین کے کسی طالب علم کا اس درجہ اکرام کیا گیا ہو۔

مختار صاحب بشکیک کے ایک بااثر تاجر ہیں جو یہاں تبلیغی جماعت کے کاموں میں پیش پیش رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنا مکان ہمارے قیام کیلئے خالی کیا ہوا تھا۔ ان کے مکان پر پہنچے تو رات کے بارہ بج چکے تھے، لیکن مقامی علماء اور معززین کا بڑا مجمع کھانے پر ہمارا منتظر

تھا۔ ان حضرات سے دیر تک گفتگو رہی اور تقریباً ڈیڑھ بجے رات بستر تک پہنچنے کی نوبت آئی۔

اگلی صبح (۲۸ رجب کو) نو بجے بشکیک کی مرکزی مسجد میں علاقے کے علماء کا ایک اجتماع رکھا گیا تھا۔ یہ عالیشان مسجد شہر کے وسط میں واقع ہے اور اسے یہاں سنٹرلی مسجد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مسجد کے ملحق کمروں میں مفتی صاحب کے دفاتر ہیں اور یہیں سے ملک بھر کے مذہبی اُمور کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔ اس پورے نظام کو یہاں کے لوگ ''مفتیات'' کہتے ہیں۔

اس علاقے کے علماء ابتداء سے حنفی مسلک رکھتے ہیں۔ سوویت یونین کے عہد اقتدار میں اکثر راسخ العقیدہ علماء کو تو بے دردی سے شہید کر دیا گیا، بہت سوں کو سائبیریا کے برفانی علاقوں میں اس طرح بے سہارا چھوڑ دیا گیا کہ وہ وہیں پر سسک سسک کر ختم ہو گئے، لیکن جو علماء بچ رہے تھے ان کو درس و تدریس یا وعظ و تبلیغ کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن ان لوگوں نے چھپ چھپ کر ضروری دینی تعلیم کو اس طرح جاری رکھا کہ کسی عالم نے اپنے گھر کے کمرے میں رات کو تین بجے سے فجر تک طلبہ کو پڑھایا، تا کہ کسی کو پتہ نہ لگ سکے۔ کسی کو کپاس کے کھیت میں حکومت کی طرف سے کاشتکاری پر متعین کر دیا گیا تو اس نے کھیت کی خدمت کے ساتھ چپکے چپکے کھیت میں چھپ کر پڑھانا شروع کر دیا۔ طلبہ ہاتھ میں درانتی لے کر وہاں پہنچ جاتے، اور کھیت کی اوٹ میں استاذ سے درس لے کر چلے جاتے۔ اس طرح ان حضرات نے جان پر کھیل کر دین اور علم کی جتنی حفاظت کر لی، وہی قابل صد تعریف ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس ماحول میں صرف ناگزیر اور ضروری معلومات ہی شاگردوں تک منتقل کی جا سکتی تھیں، کسی وسیع و عمیق علم کو اُن تک منتقل کرنا بہت مشکل تھا۔ اس لئے اس دور میں جو طالب علم پڑھ کر نکلے، اور بعد میں مقتدا بنے، وہ اس لحاظ سے تو قابل صد مبارکباد تھے کہ انہوں نے قربانی دے کر جتنا کچھ حاصل کر لیا بسا غنیمت تھا، لیکن ان سے علم کی وسعت اور عمق کی اُمید رکھنا یقیناً زیادتی ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان حضرات میں بہت سے مسائل میں جمود

بھی پیدا ہوا۔ چھوٹے چھوٹے مسائل پر اختلافات بھی اُبھرے، اور ان ریاستوں کے آزاد ہونے کے بعد مختلف اطراف کے لوگوں نے یہاں جس طرح اپنے اپنے نظریات پھیلانے کی کوشش کی، اُس نے ان اختلافات کو مزید ہوا دی۔ اب صورت حال کچھ ایسی ہے کہ ایک طرف عام مسلمان سوویت یونین کے پھیلائے ہوئے نظریات اور کلچر سے اس درجہ متاثر ہیں کہ دین کے انتہائی بنیادی ارکان تک سے ناواقف ہیں، اور مغربی تہذیب وتمدن میں ڈوب کر اسلامی شعائر کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔ سڑکوں پر پھرتی ہوئی خواتین کے نیم عریاں لباس سے خوردبین لگا کر بھی ان کے کسی اسلامی تشخص کا پتہ نہیں لگتا، اور دوسری طرف دینی رہنماؤں میں تکرارِ جماعت، احتیاطِ ظہر اور سلفی حضرات کی آمد سے استواء علی العرش جیسے مسائل پر بھی توجہ صرف ہو رہی ہے۔

حالات کے اس پس منظر میں میری آمد کے موقع پر علماء کرام، ائمہ مساجد اور دینی رہنماؤں کے دو بڑے اجتماعات رکھے گئے۔ پہلا اجتماع صبح نو بجے تھا۔ اس اجتماع میں پہلے بندہ نے عربی میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ خطاب کیا۔ اگرچہ عربی سمجھنے والے بھی خاصی تعداد میں موجود تھے، لیکن ایک بڑی تعداد ایسی بھی تھی جنہیں عربی میں بات سمجھنے میں دشواری تھی، اس لئے مدرسہ عبداللہ بن مسعود کے استاذ مولانا مقصد صاحب نے ساتھ ساتھ اس کا کرغیزی زبان میں بھی ترجمہ کیا۔ میرے اس خطاب کا بنیادی موضوع یہ تھا کہ کرغیزستان کے موجودہ حالات میں دینی کام کو کس طرح آگے بڑھانے کی ضرورت ہے اور اس مقصد کیلئے علماء کرام اور دینی رہنماؤں کا کیا کردار ہونا چاہئے؟ اس ضمن میں حاضرین سے دردمندانہ اپیل کی کہ وہ فروعی اختلافات کی بنیاد پر بٹنے کے بجائے اسلام کے ان اجماعی مسلمات کی دعوت اور تعلیم پر اپنی توجہ مرکوز کریں جن سے عوام کی اکثریت نابلد اور غافل ہے۔

اللہ تعالی کی توفیق خاص سے یہ بیان مؤثر ثابت ہوا۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ ہم اس موقع پر چالیس سوالات لکھ کر لائے تھے جن میں سے بہت سوں کا جواب

اس بیان سے مل گیا ہے، البتہ باقی سوالات ہمیں آپ سے کرنے ہیں۔ چنانچہ آدھا گھنٹہ مزید سوال وجواب کا سلسلہ رہا اور باقی سوالات کیلئے دوسرا اجتماع علماء کرام کے ساتھ عشاء کے بعد رکھا گیا جس میں مزید سوال و جواب کا سلسلہ رہا۔ الحمدللہ اس اجتماع کے بعد حاضرین یہ کہتے ہوئے اُٹھے کہ ہمارے بعض اختلافات تو ختم ہو گئے اور جو باقی ہیں ان کے بارے میں ہم یہ تہیہ کرتے ہیں کہ انہیں مرکز توجہ بنانے کے بجائے اب اساسیاتِ دین کی دعوت اور تعلیم پر اپنی کوششیں صرف کریں گے۔

مولانا محمد علی کرغیزی ہمارے دارالعلوم کراچی سے فارغ التحصیل نوجوان عالم ہیں۔ وہ گیارہ سال مسلسل دارالعلوم میں زیر تعلیم رہے، اور دو سال پہلے یہاں سے فارغ ہو کر وطن پہنچے ہیں، یہاں پہنچ کر انہوں نے بشکیک کے ایک محلے ''کلما'' کی مسجد میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا جو اب ماشاء اللہ ایک باقاعدہ مدرسے کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ آج ظہر کی نماز اور دوپہر کا کھانا ان کے مدرسے میں تھا۔ مرکزی مسجد کے اجتماع سے فارغ ہوئے تو وہ ہمیں لے کر چلے۔ ظہر میں ابھی کچھ دیر تھی۔ اس لئے انہوں نے اس عرصہ میں بشکیک شہر کا ایک چکر لگوایا۔ یہ ایک خوبصورت شہر ہے، کشادہ سڑکیں، جدید طرز کی شاندار عمارتیں، سرسبز وشاداب ماحول، بارونق مگر پُرسکون۔ شہر کے اطراف میں اونچے اونچے پہاڑ پھیلے ہوئے ہیں جن کی چوٹیوں پر اب بھی برف پڑی ہوئی تھی، اور ان کے دامن میں شفاف پانی کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ تقریباً ایک گھنٹے کی سیر کے بعد ہم کلما مسجد پہنچے جہاں ظہر کی نماز ادا کی اور مدرسہ کا معائنہ کیا۔ اس مدرسہ میں فی الحال درسِ نظامی کے دوسرے درجے تک کی تعلیم ہے اور ہر سال ایک درجے کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اساتذہ اور طلبہ سے ملاقات ہوئی اور دیکھ کر دل خوش ہوا کہ الحمدللہ سالہا سال کے بعد اس شہر میں علم دین کی شمعیں روشن ہونے کا آغاز ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ دنیا کے بیشتر علاقوں میں جہاں کہیں جانا ہوتا ہے، اپنے دارالعلوم سے تعلیم پائے ہوئے کچھ نہ کچھ فضلاء مل جاتے ہیں، اور جب وہ دین کی خدمت میں مشغول نظر آتے ہیں تو ان سے آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ مولانا محمد علی کرغیزی

جب دارالعلوم میں پڑھتے تھے تو وہ بہت کم گو اور کم آمیز قسم کے نوجوان تھے، وہ یکسوئی کے ساتھ تعلیم میں مشغول رہے، اور وطن واپس آنے سے پہلے ضروری کتابوں کا ذخیرہ اکٹھا کرنے کیلئے کافی عرصہ دارالعلوم ہی میں ٹھہرے، اور الحمدللہ یہاں پہنچ کر مفید کاموں میں مصروف ہوگئے۔

نماز عصر کے بعد کرغیزستان میں پاکستان کے سفیر جناب عالم بروہی صاحب نے ایک عصرانہ کا اہتمام کیا تھا جس میں کرغیزستان میں مقیم کچھ معزز پاکستانی حضرات سے میری ملاقات بھی پیش نظر تھی۔ عالم بروہی صاحب سفیر پاکستان کی حیثیت سے یہاں خاصے مقبول اور ہردلعزیز ہیں۔ انہوں نے حکومت پاکستان کے خرچ پر ہزاروں کی تعداد میں قرآن کریم کے نسخے کرغیزی زبان کے ترجمے کے ساتھ تیار کرائے، یہاں کے علماء سے ان کی تصحیح کرائی اور ملک بھر میں ان کی تقسیم کا انتظام کیا۔ عام طور سے ہمارے سفارت خانوں سے یہ شکایت عام ہے کہ وہ ایسی فعالیت کا مظاہرہ نہیں کرتے جیسی دوسرے ملکوں کے سفارت خانوں سے دیکھنے میں آتی ہے لیکن جب کسی جگہ اپنے سفارت خانے کا کوئی مفید کام سامنے آتا ہے تو خوشی ہوتی ہے۔ یہاں کے لوگوں نے بتایا کہ الحمدللہ یہاں ہمارا سفارت خانہ نسبتاً زیادہ فعال اور مقبول ہے۔ اس عصرانے میں ایسے پاکستانی حضرات سے ملاقات ہوئی جو یہاں تجارت وغیرہ میں مشغول ہیں۔ مغرب کی نماز ہمیں مرکزی مسجد میں پڑھنی تھی جہاں مغرب کے بعد میرے عمومی خطاب کا اعلان ہو چکا تھا۔ ہم یہاں پہنچے تو مسجد کا ہال بھرا ہوا تھا۔ یہ عام مسلمانوں کا اجتماع تھا جو دور دور سے آئے ہوئے تھے۔ نماز مغرب کے بعد تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ میرا بیان ہوا جس کا کرغیزی ترجمہ مولانا مقصد صاحب ساتھ ساتھ کرتے گئے۔ کرغیزستان کے موجودہ حالات میں یہ بات واضح ہے کہ عام مسلمانوں کے دینی تحفظ کے لئے تبلیغی جماعت سے منسلک رہنے سے بہتر کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اس لئے یہاں کے بعض ضروری مسائل کی وضاحت کے علاوہ میں نے اپنے خطاب میں اسی بات پر زور دیا کہ تبلیغی جماعت کے نظم میں سرگرم حصہ لیں اور اس کام کو

اپنے لئے نعمت عظمیٰ سمجھ کر اختیار کریں۔ یہ بیان عشاء تک جاری رہا اور عشاء کے بعد علماء کا سوال و جواب کا دوسرا دور شروع ہوا جس کا حال میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔

اگلا دن جمعہ تھا اور صبح کو دس بجے مدرسہ عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) میں حاضری کا پروگرام تھا۔ یہ مدرسہ تبلیغی جماعت کے متعدد سر کردہ حضرات نے مل کر قائم کیا ہے۔ جن میں ہمارے رفیق سفر اور داعی جاوید ہزاری صاحب سرفہرست ہیں انہوں نے ہی بار بار یہاں کا سفر کر کے مدرسہ کے بیشتر انتظامات کئے ہیں اور یہ پہلا مدرسہ ہے جو آزادی کے بعد بشکیک میں قائم ہوا۔ مولانا مقصد صاحب جو اس سفر میں میرے بیانات کا ترجمہ کرتے رہے، اسی مدرسے کے استاذ ہیں۔ یہاں کے بیشتر اساتذہ رائے ونڈ کے مدرسہ سے فارغ التحصیل ہیں اور بڑی لگن سے یہاں خدمات انجام دے رہے ہیں، مدرسے میں ابھی درجہ ثالثہ تک کی تعلیم ہے اور ہر سال ایک درجے کا اضافہ ہو رہا ہے۔

الحمدللہ عمارت بھی کشادہ ہے اور اب اسے مزید زمین مل گئی ہے اور مدرسہ کا نظم وضبط بھی ماشاء اللہ خوب نظر آیا۔ یہاں اساتذہ کرام سے مختصر خطاب کا موقع ملا اور اس نوزائیدہ مدرسہ کو پھلتا پھولتا دیکھ کر دل خوش ہوا۔

جمعہ کی نماز مرکزی مسجد میں پڑھنی تھی جہاں جمعہ سے پہلے میرے خطاب کا اعلان تھا، چنانچہ تقریباً پینتالیس منٹ کا خطاب جمعہ سے پہلے ہوا۔ ماشاء اللہ مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان میں نوجوان بہت بڑی تعداد میں تھے۔

بشکیک سے تقریباً ستر کلومیٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا شہر کربالتا (Karabalta) کہلاتا ہے۔ پانچ بجے ہم اس شہر کیلئے روانہ ہوئے، تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کا سفر ہوا۔ اس شہر کے مضافات میں ایک گاؤں ”کالاک“ کے نام سے آباد ہے جہاں پہلی بار مسجد تعمیر ہوئی ہے۔ اس مسجد کے افتتاح کے موقع پر یہاں میرے خطاب کا اعلان تھا۔ عصر کی نماز آج کل یہاں ساڑھے چھ بجے ہو رہی تھی۔ چنانچہ عصر کی نماز ہم نے اس نئی مسجد میں پڑھی اور اس کے بعد میرا بیان ہوا۔ مولانا عبدالرحیم اس علاقے میں دعوت اور تعلیم کے کاموں میں سرگرم حصہ

لیتے ہیں، وہی اس سفر کے داعی بھی تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے چچا داملا محمد سفر صاحب ایک سن رسیدہ بزرگ ہیں جو اسی گاؤں میں مقیم ہیں اور پاؤں سے معذور ہونے کی بناء پر چلنے پر قادر نہیں، وہ اس علاقے کے سب سے برگزیدہ عالم اور متقی بزرگ ہیں، چنانچہ ہم نے ان کے مکان پر حاضری دی۔ مکان کیا تھا؟ چھپر نما حجرہ تھا جس میں وہ دنیا کی تمام نیرنگیوں سے بے نیاز مسافرت کی سی زندگی بسر کر رہے تھے اور **کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل** کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ نورانی چہرے پر خشیت اور تقویٰ کی چمک نمایاں تھی، ہماری حاضری سے وہ بہت مسرور ہوئے۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ آپ نے علم کس طرح حاصل کیا؟ تو انہوں نے بتایا کہ سوویت یونین کے انقلاب کے بعد تاجکستان چلا گیا تھا، وہاں ایک شیخ سے کپاس کے کھیت میں چھپ چھپ کر مختصر الوقایہ اور ہدایہ وغیرہ پڑھی، اور بعد میں خود بھی اسی طرح طلبہ کو پڑھاتا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان جیسے بزرگوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان حضرات نے دین کے تحفظ کے لئے کیا قربانیاں دی ہیں، ہم لوگ جنہیں ایمان کی دولت بیٹھے بٹھائے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمادی اور اس کی راہ میں کوئی کانٹا بھی پاؤں میں نہیں چبھا، انہیں ایمان کی اس حلاوت کا کیا اندازہ ہوسکتا ہے جو ان جیسے بزرگوں نے جان پر کھیل کر حاصل کی تھی۔ ان بزرگ سے چند لمحوں کی ملاقات دل پر گہرا نقش چھوڑ گئی۔

یہاں سے واپس ہوئے تو مغرب کی نماز کا وقت کربالتا شہر میں ہوگیا ہم وہاں کی مرکزی مسجد میں پہنچے اور ہمارے رفیق سفر جناب حافظ فیروز الدین صاحب نے اہل مسجد سے فرمائش کر کے وہاں اذان دی۔ یہاں لوگوں میں یہ ادب دیکھا کہ جب اذان شروع ہوگئی تو تمام لوگ جو مسجد کے باہر کھڑے ہوئے تھے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور اذان کی تکمیل تک بیٹھے رہے، معلوم ہوا کہ یہاں یہ عام طریقہ ہے کہ اذان سن کر سب لوگ بیٹھ جاتے ہیں، کوئی کھڑا نہیں رہتا اور بیٹھ کر ہی اذان کا جواب دیتے ہیں۔ اس مسجد کے امام (داملا عبدالخلیل صاحب ہیں۔ داملا یہاں بڑے علماء کا لقب ہے) وہ اس علاقے کے مفتی بھی

ہیں اور بشکیک کے علماء کے اجتماع میں ان سے ملاقات ہوچکی تھی انہوں نے بڑی محبت سے یہاں استقبال کیا، انہوں نے بتایا کہ وہ دارالعلوم کراچی بھی آئے تھے اور میرے فتاویٰ کی کتاب بھی ساتھ لائے تھے، وہ علامہ زرنوجیؒ کی کتاب تعلیم المتعلم کا کرغیزی زبان میں ترجمہ کرچکے ہیں۔

مغرب کے بعد ہم بشکیک واپس آئے۔ اب ہمارے میزبانوں نے ہماری قیام گاہ تبدیل کرکے شہر کے ایک مضافاتی تفریحی مقام کے ایک بنگلے میں منتقل کردی تھی جو ایک پہاڑ کے دامن میں واقع تھا۔ رات ہم نے یہاں گزاری، رات کے اندھیرے میں تو اس علاقے کے جوہر نہ کھلے، لیکن جب نمازِ فجر کے بعد ہم چہل قدمی کیلئے نکلے تو یہ نہایت حسین منظر تھا۔ ایک سر بفلک پہاڑ کے دامن میں پتھروں سے ٹکراتی ہوئی ایک پرشور ندی بہہ رہی تھی اور اس کے کنارے دور تک پھلوں کے باغات چلے گئے تھے جن کے درخت سیب، ناشپاتی اور آلوچوں سے لدے ہوئے تھے۔ مرکزی ندی سے کئی چھوٹی شاخیں اطراف میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کا پانی بہت ٹھنڈا، میٹھا، شفاف اور نشاط انگیز تھا۔ کرغیزستان کا اسّی فیصد سے زائد علاقہ پہاڑوں سے بھرا ہوا ہے، اور انہوں نے ملک کے قدرتی حسن کو دوبالا کردیا ہے۔ یہاں کے تمام پھل نہایت شیریں اور لذیذ ہیں۔ یہاں ہر دسترخوان پر جو گرما نظر آیا وہ اتنا رسیلا اور شیریں تھا کہ میں نے کہیں اور ایسا گرما نہیں دیکھا۔ اس کے علاوہ تربوز، ناشپاتی، انجیر اور شفتالو بھی غیر معمولی طور پر لذیذ اور رسیلے ہیں اور یہاں رواج یہ ہے کہ ہر کھانے کا آغاز پھلوں سے کیا جاتا ہے۔ بادام، پستہ اور کاجو بھی وافر مقدار میں پایا جاتا ہے اور ان میں سے ہر چیز اعلیٰ نسل کی ہے۔

شہر اوش میں

آج ہفتہ کا دن تھا اور پروگرام کے مطابق ہمیں کرغیزستان کے دوسرے بڑے شہر اوش جانا تھا جو بشکیک سے تقریباً ایک ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ چنانچہ ناشتہ کے بعد ہم ایئرپورٹ روانہ ہوگئے۔ جہاں سے تقریباً دس بجے کرغیز ایئر کا فوکر جہاز ہمیں لے کر روانہ

ہوا اور ایک گھنٹے کی پرواز کے بعد جو راستے میں سر بفلک پہاڑوں کی چوٹیوں سے تقریباً چھوتی ہوئی گزری...... ہم گیارہ بجے کے قریب اوش کے ہوائی اڈے پر اُترے۔

اوش کرغیزستان کا بڑا قدیم اور تاریخی شہر ہے۔ جس میں بڑے بڑے علماء وفضلاء پیدا ہوئے۔ علامہ حمویؒ نے معجم البلدان (ص: ۲۸۱، ج: ۱) میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ شہر فرغانہ کے قریب واقع ہے اور بڑا زرخیز ہے اور بہت سی معروف شخصیات اس شہر کی طرف منسوب ہیں۔ یہاں سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر ازبکستان کی سرحد شروع ہو جاتی ہے اور اندجان اور فرغانہ (جو صاحب ہدایہ کا مسکن تھا) اس کے قریبی شہر ہیں۔ نیز اوش سے تقریباً ستر میل کے فاصلے پر کرغیزستان ہی کا شہر اوزجند واقع ہے جو علامہ قاضی خانؒ (صاحب فتاویٰ) کا وطن تھا اور جہاں شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے قید خانے میں اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''المبسوط'' تالیف فرمائی تھی۔

اوش کے ہوائی اڈے پر اس علاقے کے قاضی سین صاحب اور شہر کے متعدد معززین نے استقبال کیا۔ مولانا عبید اللہ جو شہر کی ایک مسجد کے امام ہیں اور عربی بول لیتے ہیں ہمیں اپنی گاڑی میں لے کر چلے۔ راستے میں ایک پہاڑی کے پاس انہوں نے گاڑی روکی اور بتایا کہ یہ بڑا تاریخی پہاڑ ہے جسے جبل سلیمان علیہ السلام کہا جاتا ہے اور اس علاقے میں یہ روایت مشہور ہے کہ کسی وقت حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس پہاڑ پر قیام فرمایا تھا۔ اسی پہاڑ پر ایک قدیم گھر بنا ہوا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بادشاہ ظہیر الدین بابر کا گھر ہے۔ جو اس نے ہندوستان پر حملہ کرنے سے پہلے بنایا تھا۔ اسی پہاڑ کے ایک سرنگ نما غار میں حکومت نے میوزیم بنایا ہوا ہے جس میں شہر کے تین ہزار سالہ آثار محفوظ ہیں۔

نمازِ ظہر ہم نے شہر کی ایک مسجد برات میں ادا کی، وہاں ظہر کے بعد میری تقریر کا اعلان تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ تقریر ہوئی، اسی دوران ملک کے مفتی مراد علی جمانوف کافی دور سے سفر کر کے پہنچے اور انہوں نے بتایا کہ وہ تاجکستان کی سرحد سے صرف ملاقات کیلئے آئے ہیں اور ابھی انہیں واپس جانا ہے۔

اسی جلسہ میں اس علاقے کے سب سے بڑے عالم داملا شیخ عبدالستار صاحب بھی تشریف لائے تھے، یہ اس وقت ملک کے سب سے بڑے عالم سمجھے جاتے ہیں۔ سوویت یونین کے عہد اقتدار میں انہوں نے تاجکستان جا کر وہاں کے ایک عالم شیخ رشید سے چھپ چھپ کر اسلامی علوم کی تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے بتایا کہ شیخ رشید صاحب کے مکان کے ایک حجرے میں ہماری تعلیم رات تین بجے شروع ہوتی تھی اور فجر سے پہلے پہلے ختم ہو جاتی تھی اور اس طرح کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہاں دین کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں کسی مفصل تعلیم کا امکان نہیں تھا۔ اس لئے ہدایہ کے بعد حدیث میں صرف مشکوٰۃ شریف پڑھائی جاتی تھی۔ شیخ عبدالستار صاحب نے بھی مشکوٰۃ شریف تک ہی تعلیم پائی اور صحاحِ ستہ براہِ راست نہیں پڑھ سکے۔ بعد میں انہوں نے خود اسی طرز کا مدرسہ چھپ کر قائم کیا، اور آج علاقے کے تمام ائمہ اور علماء ان کے براہِ راست یا بالواسطہ شاگرد ہیں۔ کرغیزستان کی آزادی کے بعد انہوں نے اوش شہر سے کچھ فاصلے پر باقاعدہ اعلانیہ مدرسہ قائم کیا ہوا ہے جہاں مشکوٰۃ تک تعلیم ہوتی ہے اور ستر طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ ہمارے رفیق سفر جاوید ہزاروی صاحب نے جب اُن سے کہا کہ اب تو وہاں دورۂ حدیث کی تعلیم بھی ہو سکتی ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے خود صحاحِ ستہ نہیں پڑھی ہیں تو میں کیسے پڑھاؤں؟ اس پر جاوید صاحب نے کہا کہ ہم یہ کوشش کریں گے کہ پاکستان کے مدارس سے فارغ التحصیل کچھ علماء کو وہاں بھیج دیا جائے جو کم از کم کچھ عرصہ ان کے یہاں درسِ حدیث کی خدمات انجام دیں۔

شام تک علاقے کے اہل علم اور معززین سے ملاقاتوں اور مشوروں کا سلسلہ جاری رہا اور مغرب سے کچھ دیر پہلے ہم واپس ہوائی جہاز کے ذریعے بشکیک کیلئے روانہ ہوئے اور مغرب کی نماز بشکیک میں اُتر کر ایک قریبی مسجد میں ادا کی۔

ابتداء میں ہم نے سفر کی جو ترتیب رکھی تھی، اس میں کرغیزستان کا سفر آج مکمل ہو جانا تھا، اور اس کے بعد دو دن قازقستان میں گزارنے کا پروگرام تھا۔ قازقستان کا دارالحکومت

الماتے یہاں سے کار کے ذریعہ ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ وہاں کے نائب مفتی شیخ محمد حسین اس سے پہلے چیچنیا میں تھے اور وہاں سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کیلئے کافی عرصہ ہمارے دارالعلوم میں مقیم رہے تھے۔ انہوں نے میرے کرغیزستان کے سفر کی خبر سنی اور بڑے اشتیاق سے یہ کوشش شروع کی کہ کم ازکم دو روز کیلئے میں قازقستان بھی آؤں اور اسی بناء پر ہم نے اپنی پاکستان واپسی کی بکنگ بھی الماتے سے ائی ہوئی تھی۔ لیکن ایک دن پہلے اطلاع ملی کہ قازقستان کا ویزا ملنے میں دیر لگ رہی ہے، اور اتنی جلدی ویزا نہ مل سکے گا۔ اس لئے ہمارا قازقستان کا سفر ملتوی ہوا تو شیخ محمد حسین خود مجھ سے ملنے کیلئے اُسی رات بشکیک پہنچ گئے۔ دوسری طرف محمد بلال صاحب نے (جو ایک پاکستانی ہیں اور کرغیزستان میں ایک ایئر لائنز کے مالک ہیں) اُس رات بشکیک کے ایک مضافاتی تفریحی مقام پر ایک ریسٹورنٹ میں عشائیہ کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ ہم کو ہوائی اڈے سے وہیں پہنچنا تھا۔ وہیں پر شیخ محمد حسین کو بھی دعوت دے دی گئی، یہ مقام اینگی تاش کہلاتا ہے اور دو پہاڑوں کے درمیان بہتے ہوئے ایک دریا کے کنارے واقع ہے۔ اس خوبصورت ماحول میں ہم نے نماز عشاء ادا کی۔ اتنے میں شیخ محمد حسین بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے قازقستان میں اپنی تعلیمی اور دعوتی سرگرمیوں کا حال سنایا۔ انہوں نے بتایا کہ وہاں انہوں نے متعدد تعلیمی ادارے قائم کیے ہیں اور مقامی زبان میں دینی معلومات پر مشتمل لٹریچر شائع کیا ہے۔ ان حالات کو سن کر خوشی ہوئی۔ اس ریسٹورنٹ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں انگیٹھیوں پر سینک کر مسلّم دنبہ تیار کیا جاتا ہے، اسی سے مہمانوں کی تواضع کی گئی، اور یہ دلچسپ مجلس رات گئے برخاست ہوئی۔

اس کے بعد دو دن ہمارے پاس خالی تھے، رفقاء نے تجویز پیش کی کہ بشکیک سے تقریباً ساڑھے تین گھنٹے کی مسافت پر اسک کول کے نام سے ایک جھیل ہے جو دنیا کی گنی چنی معروف جھیلوں میں شمار ہوتی ہے، اگلے دن وہاں کا سفر کیا جائے۔ مجھے اتنی دور کا سفر کرنے میں تأمل تھا، لیکن رفقاء کا رجحان دیکھ کر میں بھی راضی ہوگیا۔ اگلی صبح (۲۷ اگست) کو شہر بشکیک میں ایک نکاح تھا، میں قیام گاہ پر کچھ کام کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اپنے رفیق سفر

جناب حافظ فیروزالدین صاحب سے درخواست کی کہ وہ نکاح پڑھادیں۔ چنانچہ وہ وہاں تشریف لے گئے، اور میں قیام گاہ پر رہا، لیکن اس دوران اوش کے علماء کی ایک جماعت میرے پاس پہنچ گئی اور انہوں نے بہت سے مسائل پر گفتگو کی اور دوپہر کے بعد ہم اسک کول کیلئے روانہ ہوسکے۔ عصر کی نماز راستے میں ایک شہر بالک چے کی مسجد میں ادا کی، اور مغرب کے وقت اسک کول پہنچے۔ یہاں جھیل کے کنارے ایک ہوٹل میں رات گزاری اور فجر کے بعد جھیل کی سیر کی۔ یہ جھیل تین سوکلومیٹر لمبی اور اَسّی کلومیٹر چوڑی ہے اور اس کا پانی نہ تو عام جھیلوں کی طرح میٹھا ہے نہ سمندر کے پانی کی طرح کڑوا۔ کھارا مگر ہلکا پانی ہے، اور کہا جاتا ہے کہ اس میں غسل کرنا صحت کیلئے بہت مفید ہے، چنانچہ متعدد رفقاء اس میں غسل سے لطف اندوز ہوئے۔ جھیل کے ساتھ ساتھ پہاڑوں کے منظر نے اس کے حسن میں بہت اضافہ کردیا ہے، ناشتے کے بعد وہاں سے واپسی ہوئی اور ظہر کی نماز واپس بشکیک آکر پڑھی اور اُسی روز عصر کے بعد ہم ازبکستان ایئرلائنز کے ذریعے پہلے تاشقند پہنچے جہاں تین گھنٹے انتظار کے بعد ہمیں لاہور کیلئے دوسرا طیارہ ملا۔ رات ساڑھے بارہ بجے لاہور پہنچے اور پھر ڈھائی بجے رات ایئربلیو کے طیارے سے کراچی کیلئے روانہ ہوکر طلوعِ فجر کے قریب کراچی واپس پہنچے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ محمد و علی آلہٖ واصحابہٖ اجمعین

البانیہ میں چند دن

شعبان ۱۴۲۷ھ

ستمبر 2006ء

البانیہ میں چند دن

(شعبان ۱۴۲۷ھ / ستمبر 2006ء)

حمد و ستائش اس ذات کیلئے ہے جس نے اس کارخانہ عالم کو وجود بخشا

اور

درود و سلام اس کے آخری پیغمبر ﷺ پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ و کفی، وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، امابعد!

کرغیزستان کے سفر کے بعد شعبان کے مہینے میں مجھے چند روز البانیہ کا دورہ کرنے کا موقع ملا اور اس ملک کو بچشم خود دیکھ کر مجھے اس کے حالات بڑے سبق آموز معلوم ہوئے، جن میں حسرت و افسوس اور عبرت کا بھی سامان ہے۔ اور اُمید افزا عزائم کا بھی۔ اس سفر کے حالات بیان کرنے سے پہلے البانیہ کا مختصر تعارف اور اسکی تھوڑی سی تاریخ بیان کرنا ضروری ہے۔

البانیہ مشرقی یورپ کے ان جزیرہ نماؤں کا ایک حصہ ہے جنہیں بلقان کہا جاتا ہے۔ بلقان ترکی زبان میں پہاڑوں کو کہتے ہیں اور چونکہ یہ سارا علاقہ اونچے اونچے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے اس لئے خلافت عثمانیہ کے عہد اقتدار میں اس کا نام بلقان رکھ دیا گیا تھا۔ بلقان کا علاقہ کئی ملکوں پر مشتمل ہے جن میں البانیہ کے علاوہ یوگوسلاویہ، یونان، بلغاریہ اور رومانیہ شامل ہیں۔ اب یوگوسلاویہ بھی کئی خودمختار ملکوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ چنانچہ مقدونیہ، کوسوو، بوسنیا وغیرہ جو کمیونسٹ عہد اقتدار میں یوگوسلاویہ کے حصے تھے، اب مستقل ملک بن

چکے ہیں اور یہ سب بلقان کے علاقے میں ہیں۔

البانیہ بلقان کی ریاستوں میں سب سے چھوٹا ملک ہے جو بحر متوسط کی ایک شاخ بحیرۂ ایڈریاٹک (Adriatic) کے کنارے پر واقع ہے اور ۲۸۷۴۸ مربع کلومیٹر میں پھیلا ہوا ہے۔ یہاں بسنے والی قوم قدیم زمانے سے الیرین (Illyrian) کہلاتی تھی اور اس علاقے کا پرانا نام بھی الیریا تھا اور آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ اس قوم کی تاریخ ایک ہزار سال قبل مسیح تک پہنچتی ہے۔ شروع میں یہاں مختلف بادشاہوں کی حکومت رہی۔ لیکن تقریباً ۱۶۸ ق۔م میں سلطنت روما نے اسے فتح کر کے اپنا ایک صوبہ بنالیا تھا۔ اس کے بعد کئی صدیوں تک یہاں روم کے بادشاہوں کا تسلط رہا۔ اگرچہ تازہ ترین تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف تاجروں کے ذریعے اس علاقے میں اسلام اپنی تاریخ کی ابتدائی صدیوں ہی میں آچکا تھا، اور یہاں مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی، لیکن چودھویں صدی عیسوی میں ترکی کی خلافت عثمانیہ نے بلقان کی دوسری ریاستوں کی طرح اس ریاست کو بھی فتح کرلیا اور اس کے بعد یہاں کی اکثر آبادی مسلمان ہوگئی۔ ترکوں کا ایک طریقہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے مفتوحہ علاقوں سے کچھ بچوں کو تعلیم و تربیت کیلئے استنبول لے جاتے تھے اور وہاں ان کو مختلف علوم پڑھنے کے علاوہ اعلیٰ فوجی تربیت بھی دیتے تھے۔ ایک ایسا ہی بچہ سکندر بیگ تھا جو ذہانت اور بہادری میں اپنی مثال آپ سمجھا جاتا تھا۔ جب وہ فوجی تربیت سے مزین ہو کر جوان ہوا اور اُسے معلوم ہوا کہ وہ اصلاً البانیہ کا باشندہ ہے تو وہ کسی بہانے سے اجازت لے کر البانیہ چلا گیا، اور وہاں کے لوگوں کو جمع کر کے ترکی کی خلافت کے خلاف ۱۴۴۳ھ میں باقاعدہ بغاوت کردی اور البانیہ کو ترکی کی خلافت سے آزاد کرا کر خود اس کا حکمران بن بیٹھا، اور اس طرح البانیہ تقریباً نصف صدی تک خلافت عثمانیہ سے الگ ہوگیا، لیکن سکندر بیگ کی موت کے بعد ترکوں نے دوبارہ البانیہ کو فتح کرلیا اور وہ پھر خلافت عثمانیہ کا حصہ بن گیا۔

اُنیسویں صدی عیسوی میں مغربی طاقتوں نے خلافت عثمانیہ کو پارہ پارہ کرنے کی جو

سازشیں کیں، اس کے نتیجے میں البانیہ کی آزادی کی تحریک چلی اور وہ خلافت عثمانیہ سے الگ ہوگیا۔ پہلی جنگ عظیم کے موقع پر بڑی مغربی طاقتوں نے کمزور ملکوں کی جس طرح بندر بانٹ کی۔ (ان واقعات کی تفصیل حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''نقش حیات'' میں موجود ہے) اس میں یہ ملک اٹلی کے زیر اثر آ گیا اور ۱۹۳۹ء میں مسولینی نے اس پر باقاعدہ حملہ کردیا۔ ملک میں اس کے خلاف مزاحمت کی تحریکیں چلیں اور بالآخر ۱۹۴۴ء میں البانیہ ہی کے ایک لیڈر انور ہوجا (Anwar Hoxha) نے البانیہ کا اقتدار سنبھال لیا۔ ہوجا البانی زبان میں دینی عالم یا پیشوا کو کہتے ہیں، اور یہ شخص ایک دینی پیشوا کا بیٹا تھا، لیکن خود اس نے فرانس میں تعلیم پائی تو وہ کٹر کمیونسٹ بن گیا، اور اس نے البانیہ کو ایسی کمیونسٹ ریاست میں تبدیل کردیا جس کا جبر واستبداد دوسری کمیونسٹ ریاستوں سے بھی بازی لے گیا۔ انور ہوجا نے البانیہ کے باقاعدہ ملحد ریاست ہونے کا اعلان کیا، اور یہ دعویٰ کیا کہ کمیونزم اپنی صحیح اور اصلی صورت میں دنیا بھر میں صرف البانیہ میں نافذ کیا جارہا ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ پورے یورپ میں البانیہ واحد ملک ہے جس کی اکثر آبادی مسلمان ہے۔ (۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق البانیہ کی کل آبادی ۳۲۵۵۸۹۱ افراد پر مشتمل تھی جس میں سے ۲۵۰۶۳۸۱ افراد مسلمان تھے، اس طرح ملک کی تقریباً ستتر (۷۷) فیصد آبادی مسلمان تھی) لیکن انور ہوجا کی حکومت نے انتہائی جبر واستبداد کے ساتھ اسلام کی ایک ایک نشانی کو فنا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ تمام مسجدیں بند کردی گئیں، بہت سی مساجد کو شہید کیا گیا، بعض مساجد کو میوزیم میں، بعض کو سینما گھروں اور بعض کو بیت الخلاء میں تبدیل کردیا گیا۔ دینی تعلیم بالکلیہ ممنوع قرار دیدی گئی۔ دینی شعائر پر عمل کرنے کو عملاً جرم بنادیا گیا، ایسے واقعات بھی پیش آئے کہ کسی کے بارے میں پتہ چلا کہ اس نے روزہ رکھا ہے تو زبردستی شراب پلا کر یا خنزیر کھلا کر اس کا روزہ تڑوایا گیا، اس دور میں جو لوگ چھپ کر روزہ رکھتے، وہ اندھیرے میں سحری کھاتے، کیونکہ اس وقت اگر گھر

میں روشنی ہوتی تو پولیس گھر والوں کو روزہ رکھنے کے جرم میں پکڑ کر لے جاتی تھی، ایسے افراد تیار کئے گئے جو اماموں کے بھیس میں لوگوں کے پاس جا کر ان سے یہ کہتے کہ اب تک ہم دین کے بارے میں جو باتیں تمہیں بتاتے رہے ہیں وہ دراصل ہم نے تمہیں دھوکہ دینے کیلئے کہی تھیں، حقیقت یہ ہے کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی آنے والی نہیں ہے، نہ شراب اور خنزیر حرام ہے تم اپنی مرضی سے جس طرح چاہو، زندگی گزار سکتے ہو۔

دوسری طرف البانیہ کے باشندوں کو باہر کی دنیا سے مکمل طور پر بے خبر رکھنے کیلئے پورے ملک کو ایسا جزیرہ بنا دیا گیا جو ساری دنیا سے کٹا ہوا تھا، یہاں سے کوئی شخص باہر جا سکتا تھا، نہ باہر سے اندر کوئی آ سکتا تھا، یہاں تک کہ بیرونی ریڈیو سننے پر بھی پابندی عائد تھی۔ بیرونِ ملک آزادی سے خط و کتابت بھی ممکن نہیں تھی۔

البانیہ میں علماء دین کی ویسے بھی کمی تھی، اور جو تھے انہیں یا شہید کر دیا گیا یا مستقل طور پر جیل خانوں کی نذر کر دیا گیا۔ لہٰذا تقریباً چالیس سال اس ملک پر ایسے گذرے جن میں یہاں کے مسلمانوں کے پاس نہ دین پر عمل کرنے کا کوئی راستہ تھا، نہ دین کی معلومات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ۔

جبر واستبداد کا یہ بدترین دور ۱۹۹۰ء میں ختم ہوا۔ چالیس سال سے زائد کی اس مدت میں چونکہ ایک ایسی نسل پروان چڑھ چکی تھی جو نسبی طور پر مسلمان ضرور تھی، لیکن اسے دین کی بنیادی باتوں تک کا کوئی پتہ نہیں تھا، اس لئے اسلامی شعائر کو بحال کرنے میں قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی ہو گئیں، جس ملک میں کبھی دو ہزار مسجدیں تھیں، اب چند مساجد کو چھوڑ کر سب کمیونسٹ بربریت کا شکار ہو کر منہدم ہو چکی تھیں، اور جو باقی تھیں وہ اتنی خستہ حالت میں کہ قابل استعمال نہیں رہی تھیں، مدرسوں کا تو سوال ہی کیا ہے، دین کی کوئی بات بتانے والے نایاب تھے۔ کمیونزم کے قید خانے سے آزادی ملتے ہی لوگوں نے مغربی دنیا کے طور طریقے اختیار کرنے شروع کر دیے، فحاشی اور عریانی کا سیلاب اُمڈ آیا، اور دوسری طرف عیسائی مشنریوں نے اس علاقے کو اپنی شکارگاہ بنا لیا، اور لوگوں کی ناواقفیت سے فائدہ

اُٹھا کر وہاں اپنی تبلیغی سرگرمیاں تیز کردیں۔

ان حالات میں البانیہ کو اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ عالم اسلام کے تبلیغی اور سماجی ادارے وہاں اپنا کردار سرگرمی سے ادا کریں۔ لیکن عالم اسلام سے کٹا ہوا یہ خطہ اوّل تو اسلامی دنیا کی توجہات سے محروم رہا، دوسرے کمیونزم کے بعد جو سیکولر حکومت قائم ہوئی، اگرچہ اس نے فی الجملہ لوگوں کو مذہبی آزادی دی، لیکن یہ خوف اُسے بھی دامن گیر رہا کہ اسلامی جماعتیں کسی وقت اس کے اقتدار کیلئے خطرہ نہ بن جائیں۔ چنانچہ اسلامی سرگرمیوں کے بارے میں اس کا ذہن مختلف تحفظات کا شکار رہا اور امریکہ میں ۱۱ ستمبر کے حادثے کے بعد یہ تحفظات اور زیادہ بڑھ گئے ہیں۔

حالات کے اس پس منظر میں برطانیہ کے کچھ علماء اور مسلمان نوجوانوں کی ایک تنظیم ''مسلم ویلفیئر انسٹیٹیوٹ'' نے ۱۹۹۳ء میں البانیہ میں اپنی سماجی، تعلیمی اور تبلیغی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ انہوں نے ہی البانیہ کے مفتی اعظم شیخ صبری کوچی کو برطانیہ آنے کی دعوت دی جہاں انہوں نے دس روزہ دورے کے ذریعے برطانیہ کے مسلمانوں کو البانیہ کی حالت زار سے آگاہ کیا۔ مفتی صبری کوچی رحمۃ اللہ علیہ ایک عمر رسیدہ عالم تھے، جنہوں نے کمیونسٹ حکومت سے پہلے اسلامی علوم کی تکمیل کرکے البانیہ کے شہر شکودرا میں دینی خدمات انجام دینی شروع کی تھیں، کمیونسٹ حکومت کے بعد بھی انہوں نے اپنی خدمات جاری رکھیں جن کی پاداش میں انہیں ۲۳ سال قید کا حکم سنایا گیا۔ وہ بیس سال جیل میں رہے اور اس کے بعد انہیں جیل سے تو رہائی مل گئی لیکن ان کے بڑھاپے کے باوجود انہیں شدید جسمانی مشقت کے کام پر مجبور کیا گیا، اسی دوران کمیونسٹ اقتدار ختم ہوگیا تو شکودرا کی قدیم مسجد پلمبٹ کا پہلی بار افتتاح انہوں نے قرآنِ کریم کی تلاوت کرکے کیا۔

شیخ صبریؒ کے دورہ برطانیہ کے بعد مسلم ویلفیئر انسٹیٹیوٹ (MWI) نے البانیہ میں اپنی کوششیں مزید تیز کردیں اور الحمدللہ وہ بڑی سرگرمی سے وہاں کام کررہی ہے۔

اس تنظیم کے ذمہ دار مولانا حنیف صاحب برطانیہ کے دارالعلوم بری کے فارغ التحصیل

ہیں، انہوں نے ہی مجھے برطانیہ سے خط لکھ کر اس بات کی دعوت دی کہ میں اُن کے ساتھ البانیہ کا سفر کروں۔ اس سفر کا مقصد ان کے خیال میں یہ تھا کہ البانیہ کے حالات کا بچشم خود معائنہ کر کے اولاً ان کی تنظیم کو مشورہ دوں کہ وہاں کس طرح کام کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ دوسرے وہاں کے حالات سے باہر کے مسلمانوں کو باخبر کر کے انہیں اس خطے کی مختلف النوع ضروریات کی طرف متوجہ کروں، اور تیسرے ان کا خیال یہ تھا کہ وہاں کے بااثر حضرات سے میری ملاقات وہاں کام کرنے کیلئے فضا ہموار کرنے میں مدد دے گی، اور ضمناً کچھ اصلاحی نوعیت کے بیانات بھی ہوسکیں گے۔ چنانچہ ۸ر شعبان ۱۴۲۷ھ مطابق (۴ر ستمبر ۲۰۰۶ء) کو میں لندن کے گیٹ وک ایئرپورٹ سے مولانا محمد حنیف صاحب اور مولانا شفیق عبدالرحمٰن کے ساتھ پونے چار بجے شام روانہ ہوکر رات پونے آٹھ بجے البانیہ کے دارالحکومت ترانا ایئرپورٹ پر اُترا اور تین روزہ قیام میں البانیہ کے کئی شہروں ترانا، کردیا، شکودرا، درّوس، کوایا، بیلش، البسان، بوگرادیس اور کورچے کا دورہ کیا۔

ترانا (Tirana)

ترانا (Tirana) اس وقت البانیہ کا دارالحکومت ہے، یہاں ایئرپورٹ پر اُترتے ہی ہم شہر کے ایک مضافاتی محلے لیکناس (Lacnas) میں مسجد الباقر پہنچے جہاں نمازِ عشاء ادا کی۔ یہ مسجد شہر میں تبلیغی جماعت کا مرکز ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں جانا ہوتا ہے ماشاءاللہ تبلیغی جماعت کا کام ممتاز نظر آتا ہے، اور اس کے فوائد واضح طور پر محسوس ہوتے ہیں، الحمدللہ البانیہ میں بھی تبلیغی جماعت کا کام ہورہا ہے لیکن دوسرے مقامات کے مقابلے میں کئی وجوہ سے ابھی یہاں جماعت کی سرگرمیاں محدود اور کمزور ہیں اور ان کے اسباب کے ازالے کی کوشش ہورہی ہے۔ میری آمد کے موقع پر جماعت سے وابستہ حضرات کا ایک مجمع مسجد الباقر میں جمع تھا۔ عشاء کے بعد میں نے یہاں اردو میں خطاب کیا۔ جماعت کے ایک سرگرم رکن مولانا محمد اسماعیل صاحب البانیہ کے باشندے ہیں، اور انہوں نے رائے ونڈ کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی ہے، اس لئے روانی سے اردو بولتے ہیں، اور ماشاءاللہ بڑے

معاملہ فہم اور زیرک عالم ہیں۔ اس موقع پر اور اس کے بعد میرے پورے سفر میں ترجمانی کے فرائض انہوں نے ہی انجام دیئے۔ چونکہ البانی زبان میں اس وقت دینی لٹریچر کا فقدان ہے، اس لئے میں نے انہیں آمادہ کیا کہ وہ بنیادی دینی معلومات کی کتابوں کا البانی زبان میں ترجمہ کریں، ان کی اشاعت ہمارے ذمے ہوگی، چنانچہ الحمدللہ انہوں نے اس پر آمادگی ظاہر کردی اور اس سلسلے کا آغاز میری تجویز کے مطابق ''تعلیم الاسلام'' کے ترجمے سے کیا جارہا ہے۔

کمیونزم سے آزادی ملنے کے بعد شیخ صبری کوچیؒ نے (جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے) المشیخۃ الاسلامیہ (Albanian Muslim Community) کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا جس کا مقصد ملک میں احیائے اسلام کی خدمات انجام دینا تھا، اب یہ ادارہ حکومت کی طرف سے بھی مسلمانوں کا نمائندہ ادارہ سمجھا جاتا ہے، اور نسبتاً بڑے پیمانے پر دینی خدمات کی انجام دہی کیلئے ملک میں یہ واحد تنظیم ہے۔ اس ادارے کا مرکزی دفتر اس وقت ترانا میں ہے، اور اگلے دن صبح اس ادارے کے حضرات سے ملاقات میرے پروگرام میں شامل تھی۔ چنانچہ میں اپنے رفقاء کے ساتھ اس ادارے میں حاضر ہوا۔ یہاں ترانا کے مفتی شعبان صلیجو صاحب نے بڑی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ انہوں نے بتایا کہ ''المشیخۃ الاسلامیہ'' کا یہ ادارہ کمیونزم کے دور سے پہلے البانیہ کے علماء پر مشتمل ایک فعال ادارہ تھا۔ کمیونزم کے دور میں اسے معطل کردیا گیا۔ ۱۹۹۱ء میں شیخ صبری کوچیؒ نے اس کی تجدید کی، اور اس کے تحت ملک میں اعدادی اور ثانوی سطح کے کئی مدارس کھولے گئے ہیں جن میں اب تک ۱۹۰۰ طلبہ اور طالبات پڑھ رہے ہیں۔ مشیخہ کے پاس پندرہ ہزار ایکڑ زمین کے اوقاف ہیں، اور انہیں ادارے کی مختلف سرگرمیوں میں استعمال کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، جن میں ایک جامعہ اسلامیہ کا قیام، ایک ریڈیو اسٹیشن کا قیام اور ایک اسلامی مجلّہ کا اجرا شامل ہے۔

مفتی شعبان صلیجو نے اس موقع پر البانیہ کے ایک مؤرخ علی پاشا صاحب کو بھی مدعو کیا

ہوا تھا جنہوں نے ہمارے سامنے البانیہ کی مختصر تاریخ بیان کی۔ انہوں نے ہی یہ تحقیق کی ہے کہ خلافت عثمانیہ سے بہت پہلے البانیہ میں اسلام آچکا تھا، اوران کی رائے یہ تھی کہ خلافت عثمانیہ نے اس علاقے کو فتح کرنے کے بعد یہاں اسلام کی تعلیم وتبلیغ کیلئے کوئی دیرپا کام نہیں کیا، اور دوسری طرف کچھ ایسے سیاسی اقدامات کیے جن کی وجہ سے وہ البانیہ کے باشندوں کی نگاہ میں کوئی مقبول حکومت نہیں تھی۔ اسی بناء پر بعد میں یہاں پہلے سیکولر حکومت قائم ہوئی، اوراس کے بعد کمیونسٹ حکومت نے اپنا قبضہ جمالیا۔

مفتی شعبان صلیجو سے ملاقات کے دوران اس بات پر بھی اتفاق ہوا کہ البانین اسلامک کمیونٹی اور مسلم ویلفیئر انسٹیٹیوٹ ملک میں دینی اور رفاہی خدمات کیلئے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے۔

ترانا شہر کے سب سے بارونق وسطی علاقے میں ایک قدیم مسجد ہے جو مرکزی مسجد کہلاتی ہے۔ کمیونسٹ حکومت کے زمانے میں یہ شہر کی واحد مسجد تھی جسے اس کی خوبصورت تعمیر کی وجہ سے شہید نہیں کیا گیا۔ لیکن اس میں نمازیں بند کردی گئی تھیں، اوراسے ایک میوزیم میں تبدیل کردیا گیا تھا۔ مفتی شعبان صلیجو کا بیان ہے کہ آزادی کے بعد ۱۹۹۱ء میں اس مسجد کو دوبارہ کھولا گیا، اور افتتاح کے موقع پر ایک بڑا مجمع مسجد میں جمع ہوا۔ مفتی شعبان نے تلاوتِ قرآنِ کریم سے مسجد کا افتتاح کیا تو حاضرین میں سے بہت سے افراد کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ایک روز ہم نے ظہر کی نماز اس مسجد میں ادا کی تو الحمدللہ یہاں نمازیوں کی ایک بڑی تعداد نظر آئی جس میں البانی نژاد لوگ بھی تھے، لیکن ایک بڑی تعداد دوسروں ملکوں کے مسلمانوں کی تھی جو معاشی مشغلے کیلئے یہاں مقیم ہیں۔

شہر کے ایک اور علاقے میں وہ جگہ بھی میزبانوں نے دکھائی جہاں کمیونسٹ دور میں انور ہوجا کا مجسمہ نصب تھا، اور آزادی کے بعد عوام نے اسے گرادیا۔

شکودرا

البانیہ کا دوسرا بڑا اور اہم شہر شکودرا (Shkodra) ہے۔ یہ شہر کسی زمانے میں البانیہ کا

ترانا (البانیہ) کا ایک منظر

شکودرا (البانیہ) کی ایک مسجد

دارالحکومت بھی رہا ہے۔ یہاں سے بہت سے علماء بھی پیدا ہوئے اور دوسروں میدانوں کی نامور شخصیتیں بھی۔ شیخ ناصر الدین البانی مرحوم بھی اسی شہر میں پیدا ہوئے تھے اور عالمی شہرت یافتہ خاتون مدر ٹریسا بھی یہیں کی تھیں۔ جنہوں نے آزادی کے بعد یہاں عیسائیت کی تبلیغ کیلئے ایک بڑا مرکز قائم کیا۔ اس شہر کی قدیم ترین مسجد پلمبٹ ہے جسے آثار قدیمہ کے طور پر باقی رکھا گیا تھا مگر نمازیں بند تھیں، آزادی کے بعد شیخ صبری کوچیؒ نے اس مسجد کو کھول کر تلاوت قرآنِ کریم سے مسجد کا افتتاح کیا تھا۔ یہ مسجد اب بھی شہر کے کنارے خستہ حالت میں موجود ہے۔ البتہ شہر میں آزادی کے بعد دوسری مسجدیں تعمیر ہوئی ہیں۔ پاردِتس کے محلے میں ایک نئی مسجد دیکھی جس کے بارے میں معلوم ہوا کہ ایک البانی مسلمان نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی تھی کہ جب بھی اسلام دشمن حکومت سے آزادی ملے تو وہ اُن کے ایصال ثواب کیلئے کوئی مسجد ضرور تعمیر کریں۔ اُن کا انتقال ہوگیا اور ان کے دو بیٹوں نے جو بااثر تاجر تھے آزادی ملنے کے بعد یہ مسجد تعمیر کی۔ ایک اور عالیشان مسجد جامع ابوبکر کے نام سے معروف ہے جو کویت کی کسی تاجر فیملی نے تعمیر کی ہے۔

شکودرا کے کچھ باشندوں سے ملاقات ہوئی، یہیں کے ایک مسلمان تاجر نے اپنے گھر کے پائیں باغ میں دوپہر کا کھانا کھلایا جس پر انجیر کے درختوں نے سایہ کیا ہوا تھا، ان سے معلوم ہوا کہ الحمدللہ شہر میں رفتہ رفتہ مساجد کی تعمیر اور تبلیغی سرگرمیوں میں اضافہ ہو رہا ہے، لیکن نئی نسل دین سے اتنی دور چلی گئی ہے کہ انہیں واپس لانے کیلئے بڑی جدوجہد کی ضرورت ہے۔

شکودرا جاتے ہوئے ہمارے رفقاء نے راستے میں کرویا (Kruya) نامی قلعہ بھی دکھایا جو ایک پہاڑ پر واقع ہے۔ یہ قلعہ عثمانی دور کا ہے، لیکن سکندر بیگ کی جس بغاوت کا ذکر میں نے شروع میں کیا ہے، اس کے نتیجے میں پچیس سال تک یہ قلعہ سکندر بیگ کے تصرف میں رہا۔ اس کے انتقال کے بعد اسے دوبارہ عثمانی خلافت کے زیرنگیں لایا گیا۔ اب اس قلعے میں پرانی یادگاروں کا ایک عجائب گھر بنا دیا گیا ہے۔

دِرّوس اور کوایا

دروس البانیہ کی اہم بندرگاہ اور ایک خوبصورت سیاحتی مقام ہے جو بحر ایڈریاٹک کے کنارے واقع ہے، یہیں سے کچھ فاصلے پر کوایا کے نام سے ایک چھوٹا سا شہر ہے اور کسی نامعلوم وجہ سے اس شہر میں دیندار حضرات کا تناسب شاید دوسرے تمام شہروں سے زیادہ ہے۔ یہاں ایک مسجد میں مولانا شبیر صاحب امامت اور تدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں جو جامعہ امدادیہ فیصل آباد کے فارغ التحصیل عالم ہیں۔ پروگرام کے مطابق ہمیں نماز مغرب یہاں پڑھنی تھی، اور مغرب کے بعد یہاں میرا خطاب بھی ہونا تھا۔ لیکن طویل سفر کی وجہ سے ہمیں پہنچنے میں کچھ تاخیر ہوگئی، اور جب ہم پہنچے تو ایک بڑا مجمع نماز پڑھ کر مسجد سے نکل رہا تھا۔ ہمیں مسجد کے باہر اپنی جماعت کرنی پڑی۔ یہ بات ہر جگہ نظر آئی کہ یہاں کے لوگوں میں ابھی تقریریں سننے کا مزاج نہیں ہے۔ اگر کوئی خطاب کرنا ہو تو نماز کے فوراً بعد مختصر خطاب کیا جاسکتا ہے۔ اُس کے بعد نہیں۔ چنانچہ جتنی دیر میں ہم نماز سے فارغ ہوئے، مجمع منتشر ہوچکا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ماشاء اللہ مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی، اور لوگوں نے بتایا کہ بفضلہٖ تعالیٰ اس شہر میں نمازیوں کا اوسط اور جگہوں سے زیادہ ہے۔ مولانا شبیر صاحب ماشاء اللہ نوجوان عالم ہیں اور وہ یہاں حکمت کے ساتھ اپنی تبلیغی اور تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں اور ایک ابتدائی مدرسہ بھی چلا رہے ہیں۔ جو مقامی حضرات ان سے تعاون کرتے ہیں ان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ایک حلال ساحلی مطعم میں عشائیہ کا بھی اہتمام کیا تھا جس کے بعد ہم نے وہ رات دروس شہر میں واپس آکر بحیرۂ ایڈریاٹک کے ساحل پر گذاری۔

بیلیش اور اس کا مدرسہ

دروس سے ہم ایک اور چھوٹے سے شہر بیلیش (Belesh) پہنچے۔ یہ شہر پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی ایک جھیل کے کنارے واقع ہے اور یہاں مسلم ویلفیئر انسٹیٹیوٹ نے

ایک دار العلوم کی بنیاد ڈال کر بڑا قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ دار العلوم ایک پرانی مسجد کی تجدید کر کے اس میں قائم کیا گیا ہے۔ کمیونزم کے زمانے میں یہ مسجد ایک کھنڈر میں تبدیل ہوگئی تھی اور اس میں کوڑے کرکٹ اور گندگی کے ڈھیر جمع ہو گئے تھے۔ مسلم ویلفیئر انسٹیٹیوٹ نے اس کی صفائی کر کے اسے آباد کیا۔ کویت کے کچھ مسلمانوں کے تعاون سے مسجد دوبارہ تعمیر ہوئی، اور اس طرح تعمیر ہوئی کہ اس میں ایک رہائشی مدرسے کی بھی گنجائش پیدا ہوگئی۔ چنانچہ ان حضرات نے یہاں مدرسہ جاری کرنے کا انتظام کیا۔ محل وقوع کے لحاظ سے یہ جگہ تعلیمی کام کیلئے نہایت موزوں ہے۔ جھیل کے کنارے پُر فضا مقام پر واقع ہے اور بڑے شہروں کے شور وشغب سے دور۔ یہاں مدرسہ قائم کرنے کیلئے مناسب استاذ اور مدرسہ کے منتظم تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ لیکن ماشاء اللہ مسلم ویلفیئر انسٹیٹیوٹ کے ان نوجوان حضرات نے اس مشکل پر اس طرح قابو پایا کہ ہندوستان سے تین علماء مولانا نذیر، مولانا سراج اور مولانا مقصود صاحبان کو یہاں کام کرنے کی دعوت دی۔ ان تینوں نوجوان علماء نے بڑے مشکل حالات میں یہاں کام شروع کیا، مقامی زبان سیکھی اور بڑی مشکلات کے بعد اپنے گھر والوں کو یہاں بلایا، برصغیر کے باشندوں کے لئے البانیہ کا طرز بودوباش بہت مختلف ہے۔ لہٰذا ان حضرات کیلئے خود اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس طرز بودوباش سے مانوس کرنا آسان نہیں تھا، لیکن انہوں نے بڑی محنت سے اپنے آپ کو یہاں بسایا، ان کی زبان اور نفسیات سے واقفیت حاصل کی، اور الحمدللہ اب ان کے زیر انتظام البانیہ کے مختلف علاقوں میں کئی مدرسے چل رہے ہیں اور ان کی خدمت کے برگ وبار ظاہر ہورہے ہیں۔ جو مدرسہ ہم نے بیلیش میں دیکھا اس میں طلبہ کی اچھی خاصی تعداد ہاسٹل میں رہتی ہے اور ان کے تمام اخراجات کی کفالت مدرسہ کررہا ہے، طلبہ سے تلاوت سنی تو دل خوش ہوگیا، اور اندازہ ہوا کہ اساتذہ بڑی محنت سے طلبہ کو پڑھارہے ہیں۔ اس مدرسے کے علاوہ بھی مسلم ویلفیئر انسٹیٹیوٹ نے دوسرے مقامات پر مدرسے قائم کئے ہوئے ہیں جن کی کفالت مسلم ویلفیئر انسٹیٹیوٹ کرتا ہے۔

شیخ صبری کوچی جب برطانیہ آئے تھے تو انہوں نے بتایا تھا کہ البانیہ کا شہر لیکسووک یونان کی سرحد پر واقع ہے، اور یونان کی طرف سے عیسائی تبلیغ بڑے شدومد سے جاری ہے۔ دوسری طرف یہاں کوئی مسجد نہیں ہے۔ انہوں نے برطانوی مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ وہ اپنے خرچ پر وہاں مسجد تعمیر کرادیں۔ الحمدللہ مسلم ویلفیئر انسٹیٹیوٹ نے یہ منصوبہ اپنے ذمے لیا اور اصحابِ خیر کے تعاون سے جامع النور کے نام سے وہاں مسجد تعمیر کی۔ جس کا ۲۰۰۲ء میں افتتاح ہوا۔ مساجد کی تعمیر اور مدارس کے قیام کے علاوہ اس مسلم ویلفیئر انسٹیٹیوٹ نے بہت سے رفاہی کام بھی البانیہ میں شروع کیے۔ سردی کے موسم میں کمبلوں وغیرہ کی تقسیم، غریب علاقوں میں غذا کی فراہمی، بعض پسماندہ خطوں میں پائپ لائن بچھانا، بعض جگہ دواؤں کا انتظام، رمضان کے زمانے میں افطاری کا اہتمام، غرض علاقے کی مختلف ضروریات کے پیش نظر انہوں نے مختلف النوع خدمات انجام دی ہیں۔

البسان

ترآنا اور شکودرہ کے بعد ملک کا تیسرا بڑا شہر البسان (Elbasan) ہے جو ملک کے وسط میں واقع ہے۔ بیلیش سے ہم اس شہر میں پہنچے۔ یہاں کی مسجد پاشا عثمانی دور کی مسجد تھی، مگر کمیونزم کے دور میں منہدم ہوگئی تھی، اب اُسے از سرِ نو تعمیر کیا گیا ہے، ہم نے نمازِ ظہر اس مسجد میں ادا کی، یہاں کے مفتی جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے فاضل ہیں، انہوں نے بڑی محبت سے استقبال کیا، نمازِ ظہر کے بعد یہاں میرا خطاب ہوا جس کا ترجمہ حسب معمول مولانا اسماعیل صاحب نے کیا۔

پوگرادیس اور کورچے

البسان سے روانہ ہوئے تو بڑے خوبصورت پہاڑی مناظر سے گذرتے ہوئے ہم پوگرادیس (Pogrades) کے علاقے میں پہنچے۔ یہ علاقہ اوہرد (Ohird) نامی خوبصورت جھیل کے کنارے واقع ہے، جس کے پس منظر میں مقدونیہ کے پہاڑ نظر آتے

ہیں۔ یہ سرحدی علاقہ ایک طرف مقدونیہ اور دوسری طرف یونان سے ملتا ہے۔ اسی علاقے میں ایک چھوٹا سا شہر کورچے (Korche) کہلاتا ہے، مغرب کے وقت ہم اس شہر کی قدیم مسجد میں پہنچے جو پانچ سو دس سال پہلے تعمیر ہوئی تھی، وہاں کے مفتی چازم (یہ قاسم کی بگڑی ہوئی شکل ہے) نے بتایا کہ یہ شہر علماء کا مرکز رہا ہے۔ کمیونزم کے دور میں یہاں نماز بند کردی گئی تھی، لیکن مسجد کو منہدم نہیں کیا گیا۔ اب آزادی کے بعد یہاں نماز شروع ہوئی ہے۔ لیکن مغرب کی اذان ہوئی تو مسجد میں ہمارے علاوہ چار پانچ آدمی تھے اور نماز ختم ہونے تک ایک صف مکمل ہوئی۔ نماز کے بعد یہاں بھی میرا مختصر خطاب ہوا اور حسرت کے ساتھ یہاں سے واپسی ہوئی کہ چالیس پچاس ہزار کے اس شہر میں مسجد کی ایک صف بمشکل پوری ہوسکی تھی۔ جماعت کے بیشتر افراد چونکہ مسجد کے منتظمین میں سے تھے، اس لئے میں نے ان سے یہ درخواست کی کہ وہ روزانہ کچھ وقت لوگوں سے انفرادی ملاقاتیں کرکے انہیں مسجد میں آنے کی دعوت دیا کریں اور اپنے شہر میں تبلیغی جماعت کے کام کو فروغ دیں۔

یہ البانیہ میں ہمارے قیام کی آخری رات تھی جو ہم نے اوھرد جھیل کے کنارے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں گزاری اور اگلے دن ترانا سے واپس لندن کیلئے روانگی ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس ملک کو قدرتی مناظر کے حسن سے مالامال کیا ہے۔ انسانوں میں بھی ظاہری حسن کے علاوہ خوش اخلاقی اور نرم خوئی نمایاں محسوس ہوتی ہے، لیکن ماضی میں اس خطے پر حکمرانی کرنے والوں نے ملک اور اس کی آبادی پر ناقابل بیان ستم روا رکھے ہیں۔ سارے ملک سے اسلام کا ہر نشان مٹانے کی کوشش کے علاوہ معاشی طور پر بھی یہاں کے لوگوں کو اس درجہ محروم رکھا ہے کہ آج البانیہ یورپ کا سب سے زیادہ پسماندہ ملک ہے۔ اگرچہ آزادی کے بعد ملک نے کسی قدر ترقی کی ہے لیکن اب بھی اس کا مقابلہ یورپ کے دوسرے ملکوں سے کیا جائے تو وہ دیہات معلوم ہوتا ہے۔ تقریباً نصف صدی تک یہاں اسلام کو دبانے اور مٹانے کی جو کوششیں کی گئی ہیں، ان کے پیش نظر یہ بات بھی غنیمت ہے کہ یہاں کے باشندے ابھی تک اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، لیکن ملک کی اکثریت دین کی بنیادی

باتوں تک سے نابلد ہے۔ شراب اور خنزیر کی کثرت ہے، عریانی اپنی انتہاء کو پہنچی ہوئی ہے، بہت سے لوگ کلمہ طیبہ تک سے ناآشنا ہیں۔

ان حالات میں یقیناً یہ خطہ اس بات کا مستحق ہے کہ عالم اسلام کی دینی اور سماجی تنظیمیں ہنگامی بنیادوں پر یہاں اپنا زور صرف کریں۔ البانیہ کے مختصر قیام کے دوران میں اس نتیجے پر پہنچا کہ فی الحال یہاں ایک تو تبلیغی جماعت کے کام کو مضبوط بنانے کی ضرورت ہے اور دوسرے مسلم ویلفیئر انسٹیٹیوٹ نے جو خدمات یہاں شروع کری ہیں، ان کے ساتھ تعاون کر کے اس ملک کی مختلف النوع ضروریات پوری کی جاسکتی ہیں۔ جو حضرات اس کارِ خیر میں اس کے ساتھ تعاون کرنا چاہیں، ان کیلئے انسٹیٹیوٹ کا مکمل پتہ یہ ہے:

Muslim Welfare Institute
35, Wellington Street (St. Johns)
Blockburn, Lancashire BB18AF
U.K. England.

اس کے علاوہ مولانا حنیف صاحب سے برطانیہ میں اس ٹیلیفون نمبر پر بھی رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

Phone: 0044-7753354810

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

نو دن رُوس میں

شوال ۱۴۲۷ھ

نومبر 2006ء

نو دن رُوس میں

(شوال ۱۴۲۷ھ / نومبر 2006ء)

حمد و ستائش اس ذات کیلئے ہے جس نے اس کارخانہ عالم کو وجود بخشا

اور

درود و سلام اس کے آخری پیغمبر ﷺ پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

اب سے تقریباً چھ ماہ پہلے ماسکو کے ایک مسلمان تاجر عبدالسلام صاحب تبلیغی جماعت کے سلسلے میں پاکستان آئے، اس دوران انہوں نے مجھ سے ملاقات کی اور بتایا کہ روس میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد آباد ہے، لیکن علماء نہ ہونے کے برابر ہیں، اب جبکہ روسی مسلمانوں کو کسی قدر مذہبی آزادی ملی ہے، دینی مسائل میں انہیں رہنمائی کی ضرورت ہے، ان کے بہت سے مسائل ہیں جن کا اندازہ برسرِ زمین ہی ہوسکتا ہے۔ اس لئے ہماری فرمائش ہے کہ آپ کچھ دنوں کے لئے روس آئیں، وہاں کے حالات کا مشاہدہ کریں اور اصلاحی خطبات کے علاوہ نہ صرف ان مسائل کے سلسلے میں لوگوں کو مشورے دیں بلکہ کوئی ایسا مستقل انتظام بھی سوچیں جس کے ذریعے مسلمانوں کی یہ ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ عبدالسلام صاحب میرے پاس تبلیغی جماعت کے سرگرم کارکن جناب عرفان جان صاحب کے ساتھ آئے تھے، وہ اس سے پہلے جماعت کیساتھ روس میں کافی وقت گزار چکے تھے، انہوں نے بھی عبدالسلام صاحب کی تائید کی، اور یہ عندیہ ظاہر کیا کہ اگر میں اس سفر کیلئے تیار ہوں تو وہ بھی میرے ساتھ چلیں گے۔

میں نے یہ دعوت قبول تو کرلی لیکن عملاً اس سفر کی نوبت اس سال عیدالفطر کے چھ دن بعد یکم نومبر ۲۰۰۶ء کو آئی۔ تبلیغی جماعت کے دوسرے فعال رہنما جناب جاوید ہزاروی جن کے ساتھ میں کرغیزستان کا سفر کرچکا تھا وہ بھی ساتھ جانے پر آمادہ ہوگئے۔ دبئی میں ایک میٹنگ سے فارغ ہونے کے بعد جناب جاوید ہزاروی صاحب اور جناب عرفان جان صاحب کے ہمراہ میں یکم نومبر کی صبح کو ماسکو کیلئے روانہ ہوا اور پانچ گھنٹے کی پرواز کے بعد ماسکو کے ایئرپورٹ پر اُترا۔ عبدالسلام صاحب اوران کے رفقاء استقبال کیلئے موجود تھے، اور انہوں نے وی آئی پی لاؤنج کی سہولت کا انتظام کررکھا تھا، ماسکو میں ہلکی برف باری شروع ہوچکی تھی، دن بہت چھوٹا ہورہا تھا، اور ہم ظہر کے بالکل آخر وقت میں ایئرپورٹ کی کارروائیوں سے فارغ ہوئے۔ چنانچہ پہلے ظہر اور پھر عصر کی نماز وی آئی پی لاؤنج ہی میں ادا کی، اور پھر قیام گاہ پہنچے تو مغرب ہوچکی تھی اور وہ رات یہاں کے احباب سے ملاقات اور سفر کے پروگرام کو آخری شکل دینے میں گزرگئی۔ عبدالسلام صاحب نے بتایا کہ روس کے ہر صوبے میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ صرف ماسکو میں تقریباً بارہ سے پندرہ لاکھ کے درمیان مسلمان رہتے ہیں، جن میں بہت بڑی تعداد چیچنیا اور تاتارستان کے لوگوں کی ہے اور پھر ایران، افغانستان اور ہندوپاک سے آنے والوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ البتہ روس کے دو صوبے ایسے ہیں جن میں مسلمان سب سے زیادہ ہیں، ایک داغستان جہاں کی کم از کم نوّے فیصد آبادی مسلمان ہے، اور دوسرے تاتارستان جہاں مسلمانوں کا تناسب باون فیصد ہے۔ چنانچہ باہمی مشورے سے یہ طے پایا کہ اس دورے میں دو راتیں ماسکو میں گزارنے کے بعد پہلے داغستان کا سفر کیا جائے اور اس کے بعد تاتارستان کا اور یہاں سے واپسی کے بعد ماسکو میں مزید دو روز صرف کئے جائیں۔

ماسکو میں فی الحال پانچ بڑی مسجدیں ہیں، اور ان کے علاوہ مختلف علاقوں میں مسلمانوں نے نماز پڑھنے کیلئے چھوٹے چھوٹے مصلّے بھی بنائے ہوئے ہیں۔ ان چار بڑی مسجدوں میں ایک مسجد پراسپکٹ میرا کے محلے میں ہے۔ پراسپکٹ روسی زبان میں بڑی سڑک کو کہا

جاتا ہے، اور یہ مسجد اسی سڑک کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ ۲؍ نومبر کو مغرب کے بعد اس مسجد میں میرا خطاب تھا۔ یہی مسجد روس کے "الادارۃ الدینیہ" کا مرکز ہے، جس میں روس کے مفتی اعظم کا سیکریٹریٹ بھی ہے، اور جیسا کہ میں نے کرغیزستان کے سفرنامے میں لکھا ہے جو ممالک کمیونسٹ روس کے ماتحت رہے ہیں، ان میں اگرچہ دینی سرگرمیوں پر بحیثیت مجموعی پابندی تھی، لیکن کسی مصلحت سے انہوں نے بخارا میں ایک مدرسہ سرکاری انتظام میں باقی رکھا تھا، جس میں اپنے معتمد افراد کو عربی اور اسلامی علوم سے فی الجملہ آشنا کر کے انہیں مفتی کے منصب پر فائز کر دیتے تھے۔ کمیونزم کے زمانے میں اس منصب کی حیثیت زیادہ تر نمائشی قسم کی تھی، لیکن کمیونزم کے بعد جب مذہبی آزادی دی گئی تو اس منصب کو باقی رکھا گیا، اور اب یہ ادارہ واقعۃً دینی کام کر رہا ہے، اور اس کی حیثیت کچھ ایسی ہو گئی ہے جیسے اسلامی ممالک میں وزارتِ مذہبی اُمور کی ہوتی ہے۔ ان کے ادارے کو "الادارۃ الدینیہ" کہا جاتا ہے اور اس کے سربراہ کو مفتی۔ یہ ادارہ مساجد کے انتظام اور مسلمانوں کے نکاح وطلاق اور دوسرے مسائل میں ان کی مدد کرتا ہے، اور ملک بھر میں دینی سرگرمیاں اسی ادارے کے تحت انجام پاتی ہیں۔ اگرچہ اب روس میں مذہبی آزادی ہے، لیکن اس وقت دنیا بھر میں دیندار مسلمانوں کے سلسلے میں جو شکوک وشبہات پیدا کر دیئے گئے ہیں، ان کی بناء پر جو سرگرمی اس ادارے کے تعاون کے بغیر ہو، اُسے شک وشبہ سے دیکھا جاتا ہے، اور ایسے لوگوں کو جو اس ادارے سے کوئی نسبت رکھے بغیر اس قسم کا کام کریں سخت قسم کی تفتیش کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بعض اوقات ان شبہات کی وجہ سے لوگوں کو قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑتی ہیں، ملک بھر کی سطح پر اس ادارے کے سربراہ مفتی عین الدین صاحب ہیں (یہاں روس میں ع کا تلفظ عام طور سے غ کی طرح کیا جاتا ہے، اس لئے لوگ انہیں غین الدین کہتے ہیں) ہمارے میزبانوں نے اُن سے میرا تعارف کرا کر ہمارے لئے روس کا ویزا انہی کے ذریعے جاری کروایا تھا۔ روس میں ویزا کی ایک خاص قسم مذہبی ویزا کہلاتی ہے، مفتی صاحب کے ذریعے ہمارے لئے اسی قسم کا ویزا جاری کیا گیا تھا، اس میں سہولت یہ تھی کہ ہم اس کے

ذریعے ہر قسم کا دینی کام کر سکتے تھے، جس میں عوامی دینی تقریریں بھی شامل تھیں، مفتی صاحب نے ایک خط بھی ہمارے لئے لکھ کر دیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ''الادارۃ الدینیہ'' کے مہمان ہیں، اور انہیں ہر قسم کی سہولیات بہم پہنچائی جائیں۔ مفتی صاحب کا پورا سیکریٹریٹ اسی پراسپکٹ میرا کی مسجد کے ساتھ ایک عمارت میں قائم ہے۔ مفتی صاحب اگرچہ بذاتِ خود اس وقت سفر پر تھے، لیکن ان کے نائبین نے ہمارا اکرام کیا اور بتایا کہ آپ کے دورے کے آخر میں وہ واپس آجائیں گے۔ ہمیں بتایا گیا کہ کمیونزم کے دور میں بہت سے مسلمانوں نے اس کو بندش سے بچانے کیلئے اس مسجد کے دروازے پر جامِ شہادت نوش کیا۔ مغرب کی نماز کے بعد اسی مسجد میں عربی زبان میں میرا بیان ہوا جس کا روسی ترجمہ سائبیریا کے ایک عالم شیخ ذاکر نے کیا۔ جو تیونس کی جامعہ زیتونہ سے پڑھے ہوئے ہیں، اور ماسکو اور قازان میں میری ترجمانی کیلئے میرے ہم سفر رہے۔ مجمع ماسکو کے لحاظ سے خاصا تھا اور لوگوں نے بڑی توجہ اور دلچسپی سے گھنٹے بھر کی یہ تقریر سنی۔ جس میں میں نے انہیں وہاں کے حالات کے مناسب دینی زندگی گزارنے کیلئے مشورے پیش کئے تھے، ماسکو کے باقی حالات میں انشاءاللہ آگے ذکر کروں گا۔

داغستان میں

قرارداد کے مطابق ۳؍نومبر کو دوپہر ایک بجے ہم ماسکو سے سائبیرین ایئرلائنز کے طیارے کے ذریعے داغستان کیلئے روانہ ہوئے اور ڈھائی گھنٹے کی پرواز کے بعد صوبہ داغستان کے دارالحکومت مخشکلہ کے ایئرپورٹ پر اُترے۔

داغستان ماسکو سے جنوب میں بحرِ خزر (Caspian Sea) اور کوہِ قاف کے سلسلے کے درمیان ایک وسیع وعریض خطہ ہے۔ جیسا کہ میں انشاءاللہ آگے ذکر کروں گا، اس خطے کا بیشتر علاقہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی کے دور میں فتح ہو کر مسلمانوں کے زیرِ نگیں آچکا تھا اور اس کے بعد تقریباً ایک ہزار سال تک اس پر مختلف مسلمان بادشاہوں کی حکومت رہی اور آخر میں وہ خلافت عثمانیہ کے ماتحت رہا اور کچھ عرصہ اس پر صفویوں اور قاچاریوں کی بھی حکومت رہی۔

اس کے بعد روس کے بادشاہوں نے بار بار اس پر حملے کئے اور کئی مرتبہ اس پر قبضہ کیا۔ بالآخر تیرہویں صدی ہجری میں امام شامل آفندی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں اپنی حکومت قائم کی۔ امام شامل ؒ داغستان ہی کے باشندے تھے اور بڑے عالم اور نقشبندی سلسلے کے شیخ بھی تھے۔ حکومت کے دوران انہوں نے یہاں اسلامی شریعت کے مطابق عدل وانصاف قائم کیا، لیکن زار روس کی فوجیں مستقل ان کا تعاقب کرتی رہیں، اور ان کے پچیس سال روس کی فوجوں سے بڑی حکمت اور بہادری سے ساتھ لڑتے ہوئے گزرے۔ یہاں تک کہ ۱۲۷۶ء میں انہوں نے دیکھا کہ روسی فوجیں چاروں طرف سے ان کا محاصرہ کر چکی ہیں، اور ان کے رفقاء میں سے کل تین سو افراد باقی رہ گئے ہیں، جبکہ روسی فوجوں کی تعداد تقریباً بیس ہزار تھی، اس موقع پر روسی فوجیوں نے ان سے امن وامان کی شرط پر ہتھیار ڈالنے کی اپیل کی، اور امام شامل ؒ نے اس کو قبول کر لیا۔ یہ زارِ روس کی حکومت کی شرافت تھی کہ اس نے امام شامل ؒ کا بڑا اکرام کیا اور انہیں معزز مہمان کے طور پر اپنے پاس رکھا۔ امام شامل ؒ نے حج بیت اللہ کی خواہش ظاہر کی تو روسی حکومت نے انہیں اجازت دی، وہ پہلے استنبول پہنچے جہاں سلطان عبدالعزیز نے ان کا بڑا اکرام کیا، اور اس کے بعد وہ حجازِ مقدس چلے گئے اور بالآخر مدینہ منورہ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں مدفون ہیں۔

ان کے ہتھیار ڈالنے کے بعد یہ پورا علاقہ زار روس کے کنٹرول میں آگیا، اور جب کمیونسٹوں کا بالشویک انقلاب رونما ہوا تو اسی داغستان کے ایک، اور سرفروش مجاہد شیخ نجم الدین آفندی ؒ نے اس کا راستہ روکنے کیلئے سر دھڑ کی بازی لگائی۔ شیخ نجم الدین آفندی ؒ داغستان کے بڑے عالم تھے، اور انہوں نے اپنی بصیرت سے یہ محسوس کر لیا تھا کہ کمیونسٹوں کی حکومت زارِ روس کی حکومت سے بہت مختلف ہوگی، اور زار کے عہد حکومت میں انہیں دین پر عمل کے جو مواقع میسر ہیں وہ یکسر ختم ہو جائیں گے، اس لئے انہوں نے اپنے جانباز ساتھیوں کی ایک جماعت بنا کر مدتِ دراز تک داغستان میں کمیونسٹوں کے داخلے کو روکا۔ کمیونسٹوں نے داغستان کے بعض مشائخ کو یہ سبز باغ دکھایا کہ ہم برسرِ اقتدار آنے کے

بعد آپ لوگوں کو وہی آزادی دیں گے جو آج آپ کو میسر ہے، چنانچہ انہوں نے شیخ نجم الدین کو مزاحمت سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن شیخ نجم الدین نے اُن سے کہا کہ میں ان لوگوں کے ارادوں سے باخبر ہوں، یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں محض دھوکہ ہے، اس لئے میں آخر دم تک ان کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں، چنانچہ وہ مدت تک کمیونسٹ حملہ آوروں سے برسرپیکار رہے۔ لیکن بالآخر کمیونسٹ غالب آئے، انہیں گرفتار کرلیا گیا اور گرفتاری کے بعد کسی کو ان کا حال معلوم نہ ہوسکا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا، مختلف روایتیں مشہور ہیں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان کو کسی طیارے سے نیچے پھینک دیا گیا تھا اور کسی کا بیان ہے کہ انہیں سمندر میں ڈبودیا گیا تھا۔ لیکن یقینی بات اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ ورضی عنہٗ وارضاہ۔

داغستان علماء دین کا مرکز تھا، اور کمیونسٹ حکومت کے شدید جبر و استبداد کے باوجود یہاں کے علماء نے علمِ دین کا اپنی جانوں پر کھیل کر تحفظ کیا۔ اگرچہ کمیونسٹ حکومت کے سامنے علم دین کا پڑھنا پڑھانا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا، لیکن یہاں کے علماء نے اپنے اپنے گھروں میں خفیہ حجرے بنا بنا کر اُن میں علم دین کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ چنانچہ آج بھی یہاں نوے فیصد سے زیادہ آبادی مسلمان ہے، اور انہی حجروں کے پڑھے ہوئے علماء بڑی تعداد میں آج بھی موجود ہیں۔

ہم مخشکلہ کے ہوائی اڈے پر اُترے تو یہاں کے علماء کی ایک بڑی جمعیت استقبال کیلئے موجود تھی۔ شیخ یحیٰی یہاں کے ایک بااثر عالم ہیں وہ انٹرنیٹ پر میرے متعدد فتاویٰ اور مضامین پڑھنے کی بناء پر مجھ سے واقف تھے، انہوں نے ہی علاقے کے علماء کو میرے بارے میں بتایا تھا، اور یہ سب حضرات استقبال کیلئے جمع ہوگئے تھے۔ شیخ یحیٰی نے مجھے بتایا کہ ان میں سے بعض حضرات سوسو کلومیٹر کے فاصلے سے یہاں پہنچے ہیں، اس لئے آگے بڑھنے سے پہلے مناسب یہ ہے کہ ایئرپورٹ کی مسجد میں جمع ہوکر آپ ان سے خطاب کریں۔ ان میں سے بیشتر حضرات عالم تھے، لیکن ہر عالم کے ساتھ کچھ عام مسلمان بھی

آ گئے تھے، اس لئے مسجد میں اچھا خاصا اجتماع ہو گیا اور نمازِ عصر کے بعد میں نے عربی زبان میں خطاب کیا جو معروف حدیث **من أحيا سنة أميتت بعدي فله أجر مائة شهيد** کی تشریح پر مشتمل تھا۔ بعد میں سوال و جواب کا سلسلہ بھی شروع ہوا، لیکن شیخ یحییٰ نے یہ کہہ کر مداخلت کی کہ انشاء اللہ کل رات اور پرسوں صبح بگ دیل کے مقام پر علماء کا بہت بڑا اجتماع ہونے والا ہے، باقی سوالات وہاں کیلئے مؤخر کر دیئے جائیں۔ کیونکہ ابھی مہمان کو ایک اور لمبا سفر کرنا ہے۔ اس طرح یہ مجلس مغرب سے ذرا پہلے برخاست ہوئی، اور ہم نے مغرب کی نماز راستے کی ایک اور مسجد میں پڑھی۔

داغستان میں ہمارے قیام کا پورا انتظام شیخ یحییٰ نے ترتیب دیا تھا جس کے مطابق یہ رات ہمیں شیخ یحییٰ کے شہر حسیوت میں گزارنی تھی، جو مخشکلہ سے تقریباً سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ راستے میں شیخ یحییٰ ہمیں داغستان کی تاریخ، یہاں کے علماء، یہاں کے رسوم و رواج اور کمیونزم کے دور کے مظالم کے بارے میں بہت کچھ بتاتے رہے۔ انہوں نے بتایا کہ میرے نانا بڑے عالم تھے اور انہوں نے مختلف علوم کی کتابیں بڑی محنت سے اپنے گھر میں جمع کی تھیں، جب کمیونسٹوں نے اس علاقے پر قبضہ کیا تو انہوں نے اپنا کتب خانہ ان کی دست برد سے بچانے کیلئے تہہ خانے میں چھپا دیا تھا۔ ایک عرصہ کے بعد انہیں خیال آیا کہ تہہ خانے میں رکھی ہوئی ان نادر کتابوں کو کہیں دیمک نہ چاٹ جائے، اس لئے وہ چپکے سے تہہ خانے میں گئے اور کتابیں صاف کرنے لگے۔ کسی جاسوس نے (جو بظاہر مسلمانوں ہی میں سے تھا) کمیونسٹ پولیس کو مخبری کر دی، چنانچہ پولیس نے گھر کا محاصرہ کر کے کتب خانہ پر چھاپہ مارا، کتابوں کو پھاڑ کر انہیں قدموں سے روندا، ساری کتابوں کو آگ لگا دی، اور میرے نانا کو گرفتار کر کے لے گئے۔ میری والدہ اس وقت کمسن بچی تھیں، وہ اور میری نانی جو اس وقت نوجوان تھیں بے بسی سے آنسو بہاتی رہ گئیں اور ہزار جتن کرنے کے بعد بھی پھر کبھی میرے نانا کو نہ دیکھ سکیں۔ آج تک کسی کو یقین سے معلوم نہیں کہ ان کا انجام کیا ہوا۔

کمیونزم کا عہد اس قسم کے واقعات سے بھرا پڑا ہے اور جو مظالم اس زمانے میں ہوئے ہیں

میرے خیال میں ان کی صحیح اور مستند تاریخ کبھی مرتب نہیں کی جا سکے گی۔

شیخ یحیٰ نے یہ بھی بتایا کہ موجودہ حکومت میں بڑی حد تک مذہبی آزادی ہے، اور ملک کے نئے آئین میں ہر مذہب کے لوگوں کو اپنے مذہب پر عمل اور اس کی تعلیم وتبلیغ کی چھوٹ دی گئی ہے، چنانچہ کمیونزم کے زمانے میں پورے صوبہ داغستان میں جو مساجد اور مدارس کا مرکز تھا، صرف چوبیس مسجدیں باقی رہ گئی تھیں اور وہ بھی غیر آباد۔ لیکن کمیونزم کے بعد سے اب تک صوبے کے طول وعرض میں انتہائی تیز رفتاری سے مسجدیں تعمیر ہو رہی ہیں اور اب داغستان میں مسجدوں کی تعداد ڈھائی ہزار سے زیادہ ہے۔

باتیں کرتے کرتے ہم شہر حسیوت میں داخل ہوگئے۔ یہ صوبہ داغستان کا سرحدی شہر ہے، اور اس سے صرف دس کلومیٹر کے فاصلے پر چیچنیا کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے جس کا مرکزی شہر گروزنی یہاں سے ستر کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ہم شہر میں داخل ہوئے تو عشاء کا وقت قریب تھا، اس لئے ہم سیدھے ایک بڑی مسجد میں پہنچے۔ جماعت میں نمازیوں کی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔ یہ سب لوگ ایک دور دراز سے آئے ہوئے طالب علم سے مل کر نہایت مسرور تھے، اور زبان کے حجاب کے باوجود اُن کے چہرے پر ہمارے لئے نہ جانے کتنے بے زبان پیغام تھے۔

شیخ یحیٰ ہمیں اپنے بھائی کے حویلی نما مکان میں لے گئے جہاں اُن کے بھائی نے ہمارا بڑا پُر تپاک استقبال کیا، اسی حویلی کے ایک ہال میں دیکھتے ہی دیکھتے معززین شہر کا اچھا خاصا اجتماع ہوگیا، ان میں سے کئی علماء تھے، جن سے عربی میں گفتگو کی جا سکتی تھی، اور وہی دوسرے حضرات سے ہماری ترجمانی کرتے رہے، سوال وجواب کی محفل ہی کے دوران عشائیہ کا بھی اہتمام ہوا اور رات گئے تک یہ محفل جاری رہی۔

ہمیں بتایا گیا تھا کہ داغستان کا صوبہ اس وقت پورے روس میں علماء کا سب سے بڑا مرکز ہے، اور یہاں تقریباً تین سو علماء اس وقت بھی موجود ہیں، ان میں جو عمر رسیدہ حضرات ہیں انہوں نے کمیونزم کے دور میں خفیہ طور پر حجروں میں تعلیم حاصل کی ہے اور جو نوجوان

ہیں وہ آزادی کے بعد شام، مصر یا سعودی عرب سے تعلیم حاصل کر کے آئے ہیں۔ چنانچہ اگلی صبح اطراف سے علماء کی آمد کا سلسلہ جاری رہا، ان میں علاقے کے سب سے بزرگ عالم شیخ محمد رمضان سماخی تھے جنہیں پورے صوبے میں استاذ الاساتذہ اور نقشبندی سلسلے کا بزرگ ترین شیخ سمجھا جاتا ہے۔ وہ بڑی محبت سے میلوں کا سفر طے کر کے تشریف لائے تھے اور اُن کا پُر نور سراپا ان کی عبادت وتقویٰ کی گواہی دے رہا تھا۔ ان سے کافی دیر مختلف علمی اور علاقائی مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔

اس کے بعد شیخ یحییٰ ہمیں اپنے مدرسے میں لے گئے جو انہوں نے ”جامعۃ الامام ابی الحسن الاشعری“ کے نام سے قائم کیا ہوا ہے اور علاقے کا سب سے بڑا مدرسہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ مدرسہ علاقے کے ایک بڑے عالم شیخ محمد السید نے ۱۹۹۲ء میں ایک چھوٹی سی عمارت میں قائم کیا تھا، اور ۲۰۰۲ء میں اس کی شاندار نئی عمارت بنائی گئی۔ اب اس کے ذمہ دار شیخ یحییٰ ہیں اور اس میں دس سالہ نصاب پڑھایا جا رہا ہے جو روسی زبان اور دیگر عصری علوم کے تعارف کے ساتھ ساتھ تفسیر، حدیث اور فقہ کی معیاری کتابوں پر مشتمل ہے، مدرسہ میں تقریباً تین سو طلبہ زیرِ تعلیم ہیں، طالبات کا مدرسہ اس کے علاوہ ہے جو ایک الگ عمارت میں قائم ہے۔ اساتذہ اور طلبہ سے عربی میں بات کرنے کا موقع ملا، اور اندازہ ہوا کہ بفضلہٖ تعالیٰ تعلیم کا معیار خاصا اطمینان بخش ہے۔ اس مدرسے کی کچھ اور شاخیں بھی داغستان کے دوسرے شہروں اور قصبوں میں کام کر رہی ہیں۔

در بند کا سفر

میں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ میں داغستان کے دورے میں دربند کا تاریخی شہر بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ وہی دربند ہے جسے باب الابواب بھی کہا جاتا ہے۔ اسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فتح کیا تھا اور وہاں تقریباً چالیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قبریں بھی ہیں۔ شیخ یحییٰ نے اس سفر کا بڑے ذوق وشوق سے انتظام کیا۔ چونکہ چیچنیا کا علاقہ یہاں سے قریب ہے، اور وہاں آزادی کی تحریک چل رہی ہے، اس لئے داغستان میں جگہ جگہ پولیس کی طرف

سے چیکنگ ہوتی ہے، شیخ یحیٰی نے داغستان کی اسمبلی کے ایک رکن کو میرے بارے میں بتایا تو وہ بڑی محبت سے اپنی شاندار گاڑی خود چلا کر ہمیں وہاں لے جانے کیلئے تیار ہو گئے۔ مخشکلہ اور بگ دیل کے علماء کو پتہ چلا تو انہوں نے بھی خواہش ظاہر کی کہ وہ اس سفر میں ہمارے ساتھ ہوں۔ چنانچہ آٹھ دس گاڑیوں پر مشتمل ہمارا قافلہ دربند کے لئے روانہ ہو گیا اور تقریباً ساڑھے تین گھنٹے کے سفر کے بعد دربند شہر میں داخل ہوا۔ یہاں ایک مسجد کے ساتھ قدیم طرز کا ایک مدرسہ بنا ہوا ہے جس کی سربراہی علاقے کی ایک بااثر شخصیت شیخ سراج الدین کے پاس ہے۔

ہم یہاں نمازِ ظہر کے وقت پہنچے اور نماز اسی مسجد میں ادا کی اور اس کے بعد دربند کے قدیم شہر کی طرف روانہ ہوئے جو ایک پہاڑ کے دامن میں واقع ہے اور پہاڑ کے اوپر دربند کا مشہور تاریخی قلعہ ہے جو صدیاں گزر جانے کے باوجود اب بھی شان وشکوہ کی تصویر ہے۔ قلعے کے برج سے گردو پیش کا دلآویز منظر ناقابلِ فراموش تھا۔ پہاڑ کے دامن میں دور تک پھیلا ہوا دربند شہر اس کے پیچھے اُفق تک بحر خزر (Caspian Sea) کا نیلگوں پانی اور قلعے کے دائیں بائیں سرسبز پہاڑ اور وادیاں! دیر تک ہمارے تمام رفقاء اس منظر سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

سدِّ ذوالقرنین

ایک خاص وجہ جس کی بناء پر میں دربند دیکھنا چاہتا تھا، یہ تھی کہ بعض معاصر علماء نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قرآنِ کریم نے حضرت ذوالقرنین کی تعمیر کی ہوئی جس دیوار کا ذکر فرمایا ہے اور جو "یاجوج وماجوج" کی قتل وغارت گری سے بچاؤ کیلئے تعمیر کی گئی تھی، وہ دربند میں واقع تھی، اور ان حضرات کا کہنا یہ بھی ہے کہ اس دیوار کے کچھ آثار اب بھی باقی ہیں۔ چنانچہ میں نے اس قلعے کے برج پر پہنچنے کے بعد علاقے کے علماء سے دربند کی اس دیوار کے بارے میں معلومات کیں تو انہوں نے ایک شکستہ فصیل کی طرف اشارہ کیا جو اس قلعے کے دامن میں نظر آ رہی تھی لیکن اس دیوار کے سدِّ ذوالقرنین ہونے کا قرینہ دور دور تک محسوس نہیں ہوتا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ دیوار پہاڑ کے دامن سے شروع ہوئی ہے اور دربند شہر

کے میدانی علاقے سے گزرتی ہوئی سمندر تک پہنچی ہے اور یہ پہاڑوں کے درمیان نہیں ہے۔ حالانکہ قرآنِ کریم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین نے جو دیوار تعمیر کی تھی وہ دو پہاڑوں کے درمیانی درّے کو بند کرنے کیلئے بنائی تھی۔ قلعے کے جس برج پر ہم کھڑے تھے وہ ایک پہاڑ کے سرے پر واقع ہے اور اس سے کچھ فاصلے پر ایک اور پہاڑ ہے اور دونوں پہاڑوں کے درمیان ایک درّہ بھی ہے، لیکن اوّل تو اس درّے میں کسی دیوار کا کوئی سراغ نہیں ملتا، دوسرے یہ پہاڑ اتنے اونچے نہیں ہیں کہ وہ یاجوج ماجوج جیسی مخلوق کیلئے ناقابل عبور ہوں۔ اس لئے اس درّے میں اگر کوئی دیوار تعمیر بھی کی جاتی تو اس سے یاجوج ماجوج کا راستہ روکنا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ تیسرے دربند کی وہ دیوار جو پہاڑوں سے سمندر تک میدانی علاقے میں بنائی گئی تھی، اس کے بارے میں تاریخ میں یہ مذکور ہے کہ وہ نوشیرواں نے دوسری طرف کے حملہ آوروں سے بچنے کیلئے تعمیر کی تھی، اس لئے یہاں پہنچنے کے بعد اس بات کا تقریباً یقین ہو جاتا ہے کہ دربند کی اس دیوار کو سدِ ذوالقرنین قرار دینا کسی طرح درست نہیں ہے۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی محققانہ کتاب قصص القرآن میں بھی دربند حصار کی دیوار کو سدِ ذوالقرنین قرار دینے کی جس دلائل سے تردید کی ہے، یہاں پہنچنے کے بعد ان کی پوری پوری تصدیق ہو جاتی ہے، البتہ کوہِ قفقاز کا یہی پہاڑی سلسلہ جس پر دربند کا قلعہ واقع ہے، مغرب میں مزید آگے بڑھ کر بلند ہوتا گیا ہے اور انہی بلند پہاڑوں کے درمیان ایک درّہ داریال کہلاتا ہے اور یہاں ایک لوہے اور پگھلے ہوئے تانبے کی ایک دیوار کے آثار ملے ہیں۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی صاحب کا خیال یہ ہے کہ "سدِ ذوالقرنین" اس درّے کو بند کرنے کیلئے تعمیر کی گئی تھی۔

(قصص القرآن۔ ص: ۲۱۸، ۲۱۹۔ ج: ۳)

بہرکیف! کچھ دیر دربند حصار کی سیر کے بعد ہمارا قافلہ پہاڑ سے نیچے اُتر کر دربند شہر میں داخل ہوا۔ یہاں ایک بڑے قبرستان کے درمیان ایک چھوٹی سی چار دیواری میں ایک

چھوٹا سا قبرستان بنا ہوا ہے، جس کے بارے میں یہ بات تواتر سے مشہور ہے کہ یہ چالیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قبروں پر مشتمل ہے۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس علاقے میں حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت ہی میں پہنچ چکے تھے۔ اس بات پر تو مؤرخین متفق ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آرمینیا اور آذربائیجان کی فتح کے بعد اس علاقے کی طرف متوجہ ہوئے۔ پھر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دربند حضرت سراقہ ابن عمرو رضی اللہ عنہ کی قیادت میں صلحاً فتح ہوا اور بعض روایات میں دربند کا فاتح حضرت سلمان بن ربیعہ باھلی رضی اللہ عنہ کو قرار دیا گیا ہے۔ دربند تو آسانی سے فتح ہو گیا تھا لیکن یہاں خزر کے نام سے جو قوم آباد تھی، اُس نے بلنجر کو اپنا مرکز قرار دے کر مسلمانوں سے کافی عرصہ تک لڑائی جاری رکھی، اور اسی میں حضرت سلمان بن ربیعہ رضی اللہ عنہ اور ان کے متعدد رفقاء شہید ہوئے۔

اس چھوٹے سے قبرستان میں چالیس پرانے طرز کی قبریں بنی ہوئی ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قبریں ہیں، اور ان میں سے ایک قبر کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ حضرت سلمان بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔ حضرت سلمان بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کو بہت سے محدثین نے تو صحابہ میں شمار کیا ہے اور متعدد حضرات انہیں تابعی قرار دیتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کوفہ کا قاضی بھی مقرر فرمایا تھا، اور صحیح مسلم میں ان کی ایک حدیث بھی مروی ہے اور ان کے بارے میں یہ روایت ہے کہ وہ ہر سال حج کیا کرتے تھے۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

(الاصابہ۔ ص: ۶۱، ج: ۲۔ و تہذیب التہذیب۔ ص: ۱۳۶، ج: ۴)

بحمد للہ! ان حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قبروں پر سلام عرض کرنے کی توفیق ہوئی۔

اس چھوٹی سی چار دیواری کے باہر طویل وعریض قبرستان پھیلا ہوا ہے اور یہاں بہت سی قبروں پر یہ "جدت" دیکھی ہے کہ ان کے سنگ مرمر سے بنے ہوئے کتبوں پر صاحبِ قبر کی تصویریں بھی بنی ہوئی ہیں۔ ایسی قبریں میں نے اس سے پہلے کہیں اور نہیں دیکھیں اور

یہاں کے لوگوں نے بتایا کہ لوگ قبروں کے یہ کتبے بنانے پر لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ و اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

قبرستان کے بعد ہم شہر دربند کی قدیم ترین جامع مسجد میں پہنچے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے کی بنی ہوئی ہے، اور اس پر لگے ہوئے ایک کتبے سے بھی کچھ ایسا ہی اندازہ ہوتا ہے۔ اسی مسجد میں ایک بہت پرانا طویل و عریض درخت ہے اور اس کے بارے میں علاقے کے لوگوں میں یہ شہرت ہے کہ یہاں کسی زمانے میں حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے قیام فرمایا تھا۔ واللہ اعلم۔

یہاں سے روانہ ہوئے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا، اور جس مسجد میں ہم نے نمازِ ظہر ادا کی تھی، وہاں شیخ سراج الدین ہمارے منتظر تھے۔ وہاں پہنچ کر نمازِ عصر ادا کی اور اس کے بعد شیخ سراج الدین نے بہت پُرتکلف کھانے کا انتظام کیا ہوا تھا۔ شیخ سراج الدین علاقے میں ایک روایتی پیر کی حیثیت سے مشہور ہیں اور اپنے علم سے زیادہ اپنی خوش طبعی اور خدمت خلق کے حوالے سے لوگوں میں مقبول ہیں۔ مسجد کے ساتھ جو ابتدائی مدرسہ انہوں نے قائم کیا ہے اس کے انداز و ادا میں ہمارے صوبہ سرحد کے دیہاتی مدارس کی کافی شباہت ہے۔

کوہِ قاف پر ایک رات

کھانے کے بعد ہم یہاں سے روانہ ہوئے، ابھی ایک خاصا طویل سفر درپیش تھا۔ یہاں سے تقریباً سو کلومیٹر کے فاصلے پر ایک قصبہ بگ دیل کے نام سے مشہور ہے، اور آج کی رات وہاں دور دور کے علماء کا ایک بڑا اجتماع رکھا گیا تھا، اور ہمیں رات بھی وہیں گزارنی تھی۔ راستے کی ایک مسجد میں نمازِ مغرب ادا کر کے سفر دوبارہ شروع کیا۔ داغستان کا پورا علاقہ مغربی سمت میں کوہِ قاف کے سلسلے سے گھرا ہوا ہے۔ اس پہاڑی سلسلے کو کوہِ قفقاز بھی کہا جاتا ہے اور اسی کا مختصر نام کوہِ قاف ہے۔ اسی سلسلے کے ایک پہاڑ کی بالکل چوٹی پر بگ دیل نامی قصبہ واقع ہے۔ کوہِ قاف کے بارے میں برصغیر پاک و ہند میں طرح طرح کی طلسماتی کہانیاں منسوب ہیں۔ خاص طور پر بچوں میں اس کا تصور ایک ایسے مافوق الفطرت

علاقے کا ہے جو جنات اور پریوں سے آباد ہے اور نہ جانے کس بنا پر داستان طرازوں نے کوہِ قاف کو اپنی تصوراتی کہانیوں کیلئے منتخب کیا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کوہِ قاف کا یہ سلسلہ اپنے قدرتی حسن کے لحاظ سے بھی بڑا نمایاں ہے اور انسانی حسن کے لحاظ سے بھی۔

بگ دیل جس پہاڑ پر آباد ہے جب ہم اس کے دامن میں پہنچے تو تیرھویں رات کا چاند اپنی آب و تاب پر آچکا تھا، پہاڑ اور وادی پر چاندنی کی سیمیں چادر بچھی ہوئی تھی، ہماری کار پہاڑ پر چڑھتی گئی، اور بالآخر چوٹی پر پہنچ کر ایک عالیشان مسجد کے کنارے رُک گئی، جہاں عشاء کی نماز تیار تھی۔

دن بھر کے سفر کی وجہ سے جسم تھک کر چور ہو چکا تھا اور اس وقت کسی اجتماع سے خطاب کی سکت معلوم نہیں ہو رہی تھی، میزبانوں نے اس بات کا خیال کر کے یہ طے بھی کر لیا کہ مجوزہ اجتماع رات کے بجائے صبح کو رکھا جائے۔ لیکن نماز کے بعد ایک بہت بڑا مجمع مسجد میں جم کر بیٹھ گیا اور میزبانوں نے فرمائش کی کہ کسی خطاب کے بغیر کچھ دیر ان حضرات سے عام بات چیت کر لی جائے۔ چنانچہ میں مجمع کے درمیان پہنچا تو دیکھا کہ علماء کی بہت بڑی تعداد منبر کے پاس بڑی محبت اور اشتیاق کے جذبات لئے بیٹھی ہے، اور ان کے گرد عام مسلمانوں کا بہت بڑا مجمع ہے، علماء کرام نے بڑی محبت اور تپاک سے استقبال کیا۔ بعض علماء وہ کتابیں لے کر آئے تھے جو ان کے آباؤ اجداد نے کمیونزم کے دور میں جان پر کھیل کر محفوظ رکھیں۔ ان میں کچھ قلمی نسخے بھی تھے۔ ان حضرات نے بتایا کہ یہ بگ دیل کا قصبہ شروع سے علم اور اہل علم کا مرکز رہا ہے اور کمیونزم کے دور میں بھی یہاں خفیہ طور پر ہی سہی مگر درس و تدریس کا سلسلہ کبھی بند نہیں ہوا۔ داغستان میں مسلمانوں کی اکثریت شافعی مسلک سے تعلق رکھتی ہے، چنانچہ ان کے یہاں جن کتابوں کے درس و تدریس کا سلسلہ رہا وہ شافعی فقہ کی کتابیں ہیں۔ یہ سب حضرات خاصی بے تکلفی سے عربی زبان میں بات کر رہے تھے ان سے کچھ ہی دیر گفتگو کر کے اندازہ ہوا کہ ماشاء اللہ ان کی علمی استعداد اور مطالعہ بڑا مضبوط ہے، اور پھر ایک ہی ملاقات میں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ہم مدت سے ایک دوسرے کو

جانتے ہیں۔ اسی گفتگو کے دوران یہاں کے سب سے بااثر عالم شیخ محی الدین نے مجھ سے کہا کہ اس وقت عام مسلمانوں کا بھی بڑا مجمع دیر سے آپ کا منتظر ہے، اس لئے مختصر ہی سہی ان سے کچھ خطاب ہو جائے تو اچھا ہے۔

ان حضرات کی محبت، خلوص اور دینی جذبے کی برکت تھی کہ اُس وقت تک تھکن کا احساس کافور ہو چکا تھا اور میں نے بات شروع کی تو یہ خطاب تقریباً ایک گھنٹے جاری رہا۔ مجھے ایک افسوس ناک اطلاع یہ ملی تھی کہ روس کے مختلف حصوں سے کچھ نوجوان جو سعودی عرب میں مکمل یا نامکمل تعلیم حاصل کر کے آئے ہیں، انتہاء پسند اور جوشیلے ''سلفی'' بن کر لوٹے ہیں، چونکہ داغستان میں اکثریت شافعی علماء کی ہے، اور ان میں زمانۂ دراز سے تصوف کے سلسلے چلے آتے ہیں، شافعی مسلک میں بدعات کے سلسلے میں بھی کچھ توسع پایا جاتا ہے۔ اس لئے ان نوجوانوں نے یہاں آ کر بڑا تشدد آمیز رویہ اختیار کیا ہے۔ امام شافعیؒ کی تقلید اور تصوف کی شدت سے مخالفت شروع کر دی ہے، اور بعض نے تو یہاں کے قدیم علماء کو مشرک تک کہنا شروع کر دیا ہے اور اس کی بناء پر یہاں کے مسلمانوں میں خاصا انتشار پیدا ہو رہا ہے۔

اس پس منظر میں میرے خطاب کا مرکزی موضوع یہ تھا کہ کمیونزم کے جبر و استبداد سے آزاد ہونے کے بعد روس کے مسلمانوں کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے؟ اس ضمن میں میں نے عرض کیا کہ آج اگر روس کے مسلمانوں میں اسلام اور اسلامی شعائر کا کوئی نشان باقی ہے تو وہ ان علماء کی بدولت ہی ہے، جنہوں نے کمیونسٹ اقتدار کی تاریک رات میں اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر علمِ دین کی شمع روشن رکھی، اور اپنے معاشی مفادات اور راحت و آرام کو قربان کر کے آنے والی نسلوں کے دین و ایمان کا تحفظ کیا۔ لہٰذا نوجوان مسلمانوں کو اپنے ان اکابر کی قدر پہچاننی چاہئے اور یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ دین میں فروعی اختلافات ہر دور میں رہے ہیں، لیکن ان کی بنیاد پر ایک دوسرے کے خلاف کفر و شرک کے فتوے صادر کرنے کا فائدہ دشمنانِ اسلام کے سوا کسی کو نہیں پہنچ سکتا۔ آج روس کی صورتحال

یہ ہے کہ تقریباً پچھتر سال تک اسلام اور اسلامی شعائر کو کچلنے کی جو کوششیں جاری رہیں، ان کے نتیجے میں عام مسلمان دین کی بنیادی تعلیمات سے ہی بے بہرہ ہو چکے ہیں۔ اُن کو اس وقت دین کے مبادی کا علم پہنچانے کی ضرورت ہے، اس فضاء میں اگر استواء علی العرش اور تقلید و عدمِ تقلید کے مسائل کھڑے کر کے یہاں اختلاف کا بیج بویا جائے گا تو دین کو نقصان پہنچانے کا اس سے بڑھ کر کوئی اور فتنہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا عام مسلمانوں کیلئے سلامتی کا واحد راستہ یہ ہے کہ وہ اپنے اکابر علماء سے وابستہ رہیں اور اگر کوئی شک و شبہ ہو بھی تو اُسے باہمی جنگ و جدل کے بجائے افہام و تفہیم کی فضاء میں حل کریں۔

الحمدللہ! یہ گذارشات توجہ سے سنی گئیں، بعد میں لوگوں نے بتایا کہ اس خطاب کا نوجوانوں پر بھی اثر ہوا اور علماء کرام نے بھی اطمینان کا اظہار کیا کہ الحمدللہ یہ بات بڑی برمحل اور مفید ثابت ہوئی۔

اگلی صبح تگ دیل اور گرد و نواح کے چند با اثر علماء قیام گاہ پر تشریف لائے اور شیخ محمد رمضان سنماخی بھی۔ جن سے حسیوت میں ملاقات ہو چکی تھی، طویل سفر کر کے یہاں پہنچے۔ ان علماء میں شیخ یحییٰ کے سوا کسی کو مجھ سے مفصل واقفیت نہیں تھی۔ دوسری طرف آج کی فضاء میں جن بہت سے غیر معتدل خیالات کا چرچا ہے ان کے پیشِ نظر ان کے دل میں یہ خطرہ پیدا ہونا ایک فطری بات تھی کہ یہ شخص ہماری صفوں میں کوئی گمراہی لے کر تو نہیں آ گیا۔ اس اطمینان کے حصول کیلئے انہوں نے بڑی شائستگی سے مؤدب انداز میں عقیدے اور طرزِ فکر سے متعلق بہت سے سوالات اس انداز میں کئے جیسے وہ ان مسائل کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں، لیکن میرا اندازہ یہ ہے کہ ان سوالات کا مقصد میرے عقیدہ و مسلک کو ٹٹولنا تھا اور جب ان سوالات کا جواب انہیں اطمینان بخش حد تک مل گیا تو اُن کی مسرت اور وارفتگی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

اس موقع پر میں نے ایک بڑی مضر غلط فہمی کا ازالہ ضروری سمجھا۔ روس جیسے ممالک جن حالات سے گذر رہے ہیں، خاص طور پر ان ملکوں میں، میرے نزدیک تبلیغی جماعت کا کام

سب سے زیادہ مفید ہے، مگر اس علاقے کے علماء میں کچھ عرصے سے تبلیغی جماعت کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوگئی تھی جن کی وجہ سے یہاں جماعت کے کام میں سخت رکاوٹیں پیدا ہوگئیں۔ بلکہ بعض جگہوں پر کام بالکل بند ہوگیا۔ وہ یہ تھی کہ، جیسا میں نے پہلے عرض کیا، یہاں شافعی مسلک کی اکثریت ہے، اور نقشبندی سلسلۂ تصوف سے بھی علماء اور عوام صدیوں سے مانوس چلے آتے ہیں۔ کچھ جوشیلے سلفی نوجوانوں نے یہاں تقلید، تصوف اور بہت سی رائج رسوم کے خلاف نہایت متشددانہ رویہ اختیار کیا، اور یہاں کے علماء پر گمراہی بلکہ شرک تک کے فتوے لگائے۔ انہی میں سے بعض نوجوان تبلیغی جماعت کے نام پر بھی کام کرنے لگے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان علماء نے تبلیغی جماعت کو بھی انہی متشددانہ نظریات کا حامل سمجھ کر اس کی مخالفت شروع کردی۔

اس مجلس میں میں نے تبلیغی جماعت کے بنیادی اصول اور اس کے طریقۂ کار کو واضح کیا اور بتایا کہ اگر چند افراد نے ان معاملات میں کوئی تشدد برتا ہے تو یہ ان کا ذاتی فعل ہے، اور اُسے کسی بھی طرح جماعت کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ جماعت کا بنیادی اُصول ہی یہ ہے کہ دین کی بنیادی تعلیمات کو عام کیا جائے۔ مجمع علیہ امور کی تبلیغ دعوت کو اپنے کام کا محور بنایا جائے اور اس قسم کی پُر تشدد کاروائیاں جماعت کے بنیادی اصولوں ہی کے خلاف ہیں، الحمدللہ اِن اُمور کی وضاحت کے بعد اُن کا ذہن صاف ہوا، اور انہوں نے آئندہ جماعت کے ساتھ تعاون کا ارادہ ظاہر کیا۔

میں نے اپنے اس سفر کے دوران بعض امور ایسے دیکھے تھے جن کے بارے میں مشورہ دینا چاہتا تھا۔ مثلاً پورے علاقے میں رواج یہ ہے کہ جماعت کھڑی ہونے کے وقت امام بلند آواز سے قل اعوذ برب الناس کہتا ہے، پھر جماعت کے بعد بھی دیر تک مختلف قسم کے اذکار کا اہتمام کیا جاتا ہے اور حاضرین میں سے کوئی شخص قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے، پھر اجتماعی دعا ہوتی ہے، اس وقت تک پوری جماعت بیٹھی رہتی ہے۔ تمام مساجد میں ان تمام باتوں کا مکمل التزام کیا جاتا ہے۔ وہاں کے علماء نے بتایا کہ ان میں سے بعض امور کو

شافعی مسلک میں مستحب قرار دیا گیا ہے۔ میں نے ان حضرات علماء سے عرض کیا کہ یہ تمام اذکار جن کا آپ حضرات اہتمام کرتے ہیں، اپنی اپنی جگہ بڑے بابرکت ہیں، لیکن ہر نماز کے آگے پیچھے ان کے اہتمام والتزام سے آدمی کو یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ سب اُمور نماز کا لازمی حصہ ہیں، اور کسی مستحب عمل کا بھی اس درجہ التزام واہتمام جس سے اس کے واجب یا لازمی ہونے کا شبہ ہونے لگے، شرعاً جائز نہیں ہے، اس لئے آپ حضرات اس اہتمام والتزام کو ترک کرنے پر غور فرمائیں۔ میری اس بات کو تمام موجود علماء نے بڑی خندہ پیشانی سے قبول کیا اور کہا کہ واقعۃً یہ پہلو قابلِ توجہ ہے، کم از کم ایسا ضرور ہونا چاہئے کہ کبھی کبھی ان کو ترک کیا جائے اور عوام پر یہ بات واضح کی جائے کہ یہ نماز کا لازمی حصہ نہیں ہے۔

یہ ایک محدود مجلس تھی جس میں صرف وہ علماء ومشائخ شریک ہوئے جنہیں نوجوان علماء کے مقتدا ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ علاقے کے تمام علماء کا بڑا اجتماع ابھی باقی تھا۔ لیکن چونکہ اسی شام ہمیں ہوائی جہاز سے ماسکو جانا تھا۔ اس لئے سفر کے منتظمین نے یہ مناسب سمجھا کہ یہ اجتماع ہوائی اڈے کے قریب کسی مقام پر ہو۔ چنانچہ اس کے لئے انہوں نے کیس پسک نامی شہر کی ایک مسجد میں یہ اجتماع رکھا تھا جو مخشکلہ کے ہوائی اڈے سے تقریباً دس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

لیکن بگ دیل سے روانہ ہونے سے قبل شیخ محی الدین صاحب اپنے ایک مدرسے میں لے گئے جو مدرسۃ الامام النوویؒ کے نام سے موسوم ہے، اور اس میں کم وبیش وہی نصاب پڑھایا جاتا ہے جو حسیوت میں شیخ یحیٰ کے جامعہ الامام ابی الحسن الاشعریؒ کا نصاب ہے۔ یہاں اساتذہ وطلبہ کو درس وتدریس میں مشغول دیکھ کر دل خوش ہوا۔ بگ دیل کے قصبہ میں چلتے پھرتے واضح طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ باعمل مسلمانوں کا شہر ہے لوگوں کے چہرے مہرے پر اسلامی شعائر نمایاں ہیں، خواتین میں بڑی حد تک حجاب کی پابندی نظر آتی ہے اور یہ سب کچھ ان علماء کی قربانیوں کا نتیجہ ہے جنہوں نے طرح طرح کے خطرات کا سامنا کرکے دین اور علم کی جان سے زیادہ حفاظت کی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ واجزل لھم اجراً.

یہاں سے تقریباً دو گھنٹے کا سفر طے کر کے ہم کیس پسک (Kespisk) شہر میں داخل ہوئے، اُس کی عالیشان مرکزی مسجد میں علماء کا ایک بڑا اجتماع ہمارا منتظر تھا، یہاں کسی باضابطہ خطاب کے بجائے منتظمین نے صرف سوال وجواب کی نشست رکھی تھی۔ اطراف کے علماء جمع تھے اور انہوں نے ملک میں پیش آنے والے بہت سے مسائل کے بارے میں زیادہ تر فقہی نوعیت کے سوالات کیے اور یہ سلسلہ تقریباً دو گھنٹے جاری رہا، اور ظہر کی نماز پر ختم ہوا۔ نماز ظہر کے بعد میزبان ہمیں ایک قریبی مکان میں لے گئے جہاں ٹھہرانے کا انتظام تھا، شیخ محی الدین نے بتایا کہ کمیونزم کے زمانے میں یہ مکان ایک بڑے شیخ کی قیام گاہ تھی اور اس میں ان کے درس کا سلسلہ خفیہ طور پر جاری رہتا تھا، اور خود انہوں نے بھی اسی مکان میں ان سے درس لیا ہے۔

کیس پسک ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر ہے جو بحیرۂ کیسپین (Caspean) کے کنارے واقع ہے، نماز عصر کے بعد ہوائی اڈے کیلئے روانہ ہونے سے پہلے ہمارے میزبان ہمیں سمندر کے ایک پُر فضا ساحل پر لے گئے۔ سامنے بحیرۂ کیسپین کی نیلگوں موجیں ساحل سے کھیل رہی تھیں۔ اس سمندر کو قدیم تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں میں کبھی بحر خزر کہا گیا ہے اور کبھی بحر قزوین اور عصر حاضر میں وہ بحیرۂ کیسپین کے نام سے مشہور ہے اور بعید نہیں کہ کیسپین قزوین ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہو۔ یہ اُن سمندروں میں سے ہے جو زمین کے درمیان اسی طرح واقع ہیں کہ ان کا رابطہ کسی بڑے سمندر سے نہیں ہے، اور جن کو جغرافیہ کی اصطلاح میں زمین کے اندرونی سمندر (Inland Seas) کہا جاتا ہے، اور اس قسم کے سمندروں میں یہ دنیا کا سب سے بڑا سمندر ہے جس کا طاس شمالاً جنوباً بارہ سو کلو میٹر میں پھیلا ہوا ہے، اس کی اوسط چوڑائی تین سو بیس کلو میٹر ہے، اس کا مجموعی رقبہ تین لاکھ اکہتر ہزار مربع کلو میٹر ہے۔ اس سمندر کا تقریباً اسی فیصد حصہ روس میں ہے، اور یورپ کے جنوب مشرقی کنارے پر واقع ہے، اور باقی حصہ ایران میں پھیلا ہوا ہے قزوین ایران ہی کا شہر ہے، اور اسی کے کنارے آباد ہے جس کی وجہ سے اسے بحر قزوین بھی کہا جاتا ہے۔ روس

کا مشہور دریائے وولگا بھی اسی سمندر میں گرتا ہے کیس پسک شہر کا نام بھی دراصل اسی سمندر کے روسی نام پر رکھا گیا ہے۔

سمندر کے کنارے سیر کے لیے ایک پارک بنا ہوا ہے، اور وہاں سے سمندر کا منظر بڑا خوبصورت ہے، جس وقت ہم وہاں پہنچے تو برفانی ہواؤں نے ہمارا استقبال کیا اور ابر آلود آسمان سے بوندا باندی بھی شروع ہوگئی، اس لئے ہمارا قافلہ زیادہ دیر اس منظر سے لطف اندوز نہ ہوسکا، اور ہم ایئرپورٹ روانہ ہوگئے۔ بگ دیل اور گردونواح کے علماء کی بڑی تعداد الوداع کہنے کیلئے ایئرپورٹ تک آئی اور جب تک جہاز پر سوار ہونے کا اعلان نہیں ہوگیا، مختلف مسائل پر گفتگو بھی جاری رہی اور ایک ایک فرد کی طرف سے اظہارِ محبت کے نت نئے اسلوب سامنے آتے رہے۔ جن حضرات سے صرف دو تین مرتبہ ملاقات رہی، ان کے بارے میں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے برسوں ان سے محبت کا تعلق رہا ہے، اور بالآخر ان کی محبت کا گہرا نقش لئے ہم جہاز پر سوار ہوگئے۔

تاتارستان کا سفر

سفر کا جو نظم طے ہوا تھا، اُس کے مطابق ہماری اگلی منزل روس کا دوسرا اہم صوبہ تاتارستان تھی۔ لیکن داغستان سے براہِ راست تاتارستان کی کوئی پرواز میسر نہیں تھی، اس لئے ماسکو واپس جانا ضروری تھا۔ چنانچہ ہم مخشکلہ ایئرپورٹ سے سوار ہوکر ڈھائی گھنٹے میں ماسکو پہنچے اور طے یہ کیا تھا کہ اس رات ٹرین کے ذریعے ہم تاتارستان کیلئے روانہ ہوجائیں، اور رات بھر کا سفر ٹرین سے طے کرکے صبح تاتارستان کے دارالحکومت قازان پہنچ جائیں، چنانچہ ماسکو ایئرپورٹ پر اُترنے کے بعد ہم سیدھے ریلوے اسٹیشن پہنچے جہاں ایک بہت لمبی ٹرین قازان جانے کیلئے تیار تھی۔ ماسکو میں برف پڑی تھی، اور درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے تین درجے نیچے گرا ہوا تھا۔ ہم نے پلیٹ فارم پر ہی اذان اور اقامت کے ساتھ عشاء کی نماز باجماعت ادا کی، اور ٹرین میں سوار ہوگئے یہ ایک چاندنی رات تھی، اور چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر تھا۔ جب ٹرین ماسکو کے مضافات سے نکل کر جنگلوں میں داخل

ہوئی تو زمین پر حد نظر تک سفید براق برف کی چادر ڈھکی ہوئی تھی اور چودھویں کا چاند اس پر اپنی سیمیں کرنیں نچھاور کر رہا تھا۔ ریلوے لائن کے دونوں اطراف کبھی کبھی اونچے اونچے درختوں کی قطاریں آتیں تو وہ بھی سر سے پاؤں تک برف میں ڈھکی ہوئی نظر آتیں اور یوں محسوس ہوتا کہ پورے ماحول پر برف کی حکمرانی ہے۔ اس برفانی ماحول میں ٹرین اپنا سفر طے کرتی رہی۔

عرفان جان صاحب اور ماسکو کے عبدالسلام صاحب کے علاوہ اس سفر میں سائبیریا کے ایک نوجوان عالم شیخ ذاکر بھی میری ترجمانی کیلئے ماسکو سے ساتھ ہو گئے تھے اور چار برتھوں والے ایک ڈبے میں ہم چاروں محوِ سفر تھے۔ ذاکر صاحب نے اپنے وطن سائبیریا کے حالات سنانا شروع کر دیئے۔ سائبیریا درحقیقت متعدد صوبوں پر مشتمل بڑا وسیع وعریض علاقہ ہے جو روس کا انتہائی شمالی حصہ ہے، لیکن شرقاً غرباً وہ یورپ سے جاپان تک پھیلا ہوا ہے۔ ذاکر صاحب نے بتایا کہ سائبیریا کے ہر صوبے میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد آباد ہے۔ لیکن اتنے طویل عریض علاقے میں کوئی ایک بھی عالم دین نہیں ہے، ذاکر صاحب کو علمِ دین حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا تو انہوں نے تیونس کا سفر کیا، اور وہاں جامع زیتونہ میں مختلف اساتذہ سے علم حاصل کیا، اور اسی وجہ سے وہ ماشاء اللہ عربی خوب بولتے ہیں، لیکن یہ ایک غیر مرتب قسم کی تعلیم تھی، اور اب ان کی خواہش ہے کہ وہ ہمارے دارالعلوم آ کر علومِ معروفہ میں زیادہ وسعت و گہرائی سے مہارت پیدا کریں، اور اس غرض سے وہ ویزا کے حصول کیلئے کوشاں ہیں۔ ان کی زبانی سائبیریا کے حالات سن کر دل پر بڑا اثر ہوا کہ یہ وسیع وعریض علاقہ دین کی تعلیمی اور تبلیغی خدمات کا کتنا حاجتمند ہے، اور ہم اس سے کتنے بے خبر!

ٹرین میں چاروں کے سونے کا مناسب انتظام تھا اور کچھ دیر ہم سو گئے، صبح اٹھ کر فجر کی نماز ٹرین ہی میں ادا کی تو ٹرین تاتارستان کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ تاتارستان روس کا بڑا صوبہ ہے اور یہاں کے مسلمانوں کی آبادی باون فیصد ہے اور یہ سب حنفی مسلک رکھتے ہیں، یہاں بسنے والوں کو تاتاری کہتے ہیں، اس نام سے مغالطہ یہ لگتا ہے کہ شاید یہ چنگیز خان

اور ہلاکو خان کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس معنی میں تا تاری نہیں ہیں، بلکہ یہ قوم اصلاً بلغاری قوم ہے، اور ان کا مرکزی شہر بُلغار تھا، جس کا قدرے مفصل تعارف میں نے اپنے ناروے کے سفرنامے (آدھی رات کا سورج) میں کرایا ہے اور فتنۂ تا تار کے دور میں جس طرح چنگیز خان اور اس کی افواج نے بہت سے مسلم ممالک کو تاخت و تاراج کیا، اُسی طرح یہ بُلغار کے لوگ بھی اس کا نشانہ بنے، لیکن فتنۂ تا تار کے خاتمے اور منگولیوں کے زوال کے بعد ان پر روس نے حملہ کیا، جس کی وجہ سے مدتوں ان کے اور روسی حکومت کے درمیان جنگ جاری رہی۔ ''تا تار'' کے معنی ان کی زبان میں ''وحشی'' ہوتے تھے اور روسیوں نے اس قوم کو بدنام کرنے کیلئے انہیں ''تا تار'' یعنی وحشی قرار دیا۔ شروع میں یہ لوگ اس نام کو اپنے لئے بالکل ناپسند کرتے تھے، لیکن روسیوں نے اس شدت اور تواتر کے ساتھ انہیں تا تار قرار دیا کہ رفتہ رفتہ وہ اسی نام سے مشہور ہو گئے اور اب خود وہ بھی اپنے آپ کو تا تاری ہی کہتے ہیں اور اپنے صوبے کو تا تارستان۔

قازان میں

صبح آٹھ بجے کے قریب ہماری ٹرین تا تارستان کے دارالحکومت قازان پہنچی جو ماسکو اور سینٹ پیٹرس برگ (سابق لینن گراڈ) کے بعد روس کا تیسرا بڑا شہر ہے۔ قازان سے کچھ ہی فاصلے پر قدیم تاریخی شہر بُلغار واقع ہے جہاں مسلمانوں کی سلطنت قائم تھی، فتنۂ تا تار کے موقع پر تا تاریوں نے اسے تباہ کیا اور اس کی جگہ شہر قازان آباد کیا۔ بلغار کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد بھی یہاں منتقل ہو گئی، پھر تا تاریوں کو زوال آیا۔ اور اصل بُلغاری مسلمانوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کی جس پر زارِ روس بار بار حملے کرتا رہا اور بالآخر ۱۵۵۲ء میں اس نے اس پر مکمل قبضہ کر کے اسے روس کا حصہ بنالیا۔ جناب جاوید ہزاروی بعض وجوہ سے ہمارے ساتھ داغستان جانے کے بجائے ماسکو سے سیدھے قازان آ گئے تھے اور ہم سے پہلے پہنچ کر انہوں نے قازان میں ہمارے دو روزہ قیام کا پروگرام ترتیب دے لیا تھا۔ وہ متعدد مقامی میزبانوں کے ساتھ ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے۔ قیام کا انتظام

شہر کے ایک پُر فضا مقام پر ایک ایسے صاف ستھرے مکان میں تھا جو میزبانوں نے ہمارے لئے خالی کیا ہوا تھا۔ یہاں کچھ دیر ستانے کے بعد دس بجے تاتارستان کے مفتی شیخ عثمان صاحب سے اُن کے دفتر میں ملاقات کا وقت طے تھا۔ چنانچہ ہم اس ملاقات کیلئے روانہ ہوگئے۔ اُن کا دفتر تاریخی شہر کی ایک تاریخی مسجد کے احاطے میں واقع ہے جو مسجد مرجانی کہلاتی ہے اور یہ مسجد تیرہویں صدی ہجری کے ایک جلیل القدر فقیہ علامہ شہاب الدین ہارون المرجانی رحمۃ اللہ علیہ کا مستقر ہونے کی وجہ سے اُن کے نام سے منسوب ہے۔ علامہ مرجانیؒ قازان ہی کے باشندے تھے اور فقہ میں ان کی متعدد تصانیف اہل علم سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ جن میں اُصولِ فقہ کی معروف درسی کتاب توضیح پر اُن کا حاشیہ ہے۔ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر ترمذی میں اُس کے حوالے آئے ہیں۔ نیز جن علاقوں میں گرمی کے موسم میں شفق غائب نہیں ہوتی (اور قازان بھی اس میں داخل ہے) اُس میں عشاء کی فرضیت پر اُن کی شاندار کتاب ''ناظورۃ الحق'' اہل علم میں مشہور ہے اور میں نے تکملہ فتح الملہم کی آخری جلد میں اُس سے بڑا استفادہ کیا ہے۔ یہ بزرگ اسی مسجد کو اپنے افادات کا مرکز بنائے ہوئے تھے۔ ان کی ولادت ۱۲۳۳ھ میں اور وفات ۱۳۰۶ھ میں ہوئی تھی۔ (دیکھئے الاعلام للزرکلی۔ ص:۳۹، ج:۹۔ اور معجم المؤلفین، عمر رضا کحالہ، ص:۱۲۸، ج:۱۳) کمیونزم کے دور میں یہ مسجد بوسیدہ ہوگئی تھی، اب آزادی کے بعد اسے ازسرِ نو تعمیر کیا گیا ہے۔

مسجد کے احاطے میں تاتارستان کے مفتی صاحب کا دفتر ہے۔ آج کل شیخ عثمان اس منصب پر فائز ہیں، جو عربی بہت روانی سے بولتے ہیں، اور علمی ذہن کے ساتھ بڑی شگفتہ اور باغ و بہار طبیعت کے مالک ہیں۔ انہوں نے بڑے تپاک اور محبت سے استقبال کیا اور بتایا کہ الحمد للہ! آزادی کے بعد تاتارستان میں بڑی تیزی سے دین اور علمِ دین کی طرف مسلمانوں کی واپسی شروع ہوئی ہے۔ کمیونزم کے عہد میں پورے صوبے میں صرف سولہ مسجدیں رہ گئی تھیں، اور وہ بھی غیر آباد اور اب ماشاء اللہ مساجد کی تعداد تیرہ سو سے متجاوز

ہو چکی ہے اور کوئی ہفتہ خالی نہیں جاتا جس میں مجھے کسی نہ کسی مسجد کے افتتاح کیلئے جانا نہ پڑتا ہو، مدارس بھی قائم ہو رہے ہیں، اور اب خود مفتی عثمان صاحب کے زیر انتظام مرجانی مسجد سے ملحق ایک مدرسہ قائم ہے جس میں اسلامی علوم کی تعلیم کا انتظام ہے۔ مفتی صاحب نے مدرسہ کا دورہ کرا کر وہاں کے اساتذہ وطلبہ سے ملاقات بھی کرائی اور اندازہ ہوا کہ دستیاب حالات میں یہ مدرسہ اپنی استطاعت کی حد تک مسلمان نوجوانوں کی تعلیم وتربیت کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔

مفتی عثمان صاحب نے فرمایا کہ یہاں کے مسلمان سودی بینکوں سے معاملات کرنے میں بُری طرح پھنسے ہوئے ہیں، اور ان کی خواہش اور کوشش ہے کہ کوئی ایسی سبیل نکلے جس کے ذریعے مسلمانوں کو سود کی لعنت سے نجات دلائی جا سکے۔ اس سلسلے میں ان کے نائبین بعض تجار سے بات چیت کر رہے ہیں لیکن ان کو اس بارے میں رہنمائی کی ضرورت ہے۔ انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ میری ایک ملاقات ان اصحابِ معاملہ سے ہو جائے جس میں کام کے ابتدائی خطوط طے ہو سکیں۔ جناب جاوید ہزاروی صاحب نے اگلے دن کیلئے میرا پروگرام قازان سے تقریباً سو کلومیٹر کے فاصلے پر ایک اور شہر میں طے کیا ہوا تھا، لیکن مفتی صاحب کی اس خواہش کے پیشِ نظر وہ اس پروگرام کو منسوخ کرنے پر راضی ہو گئے اور اگلے دن دس بجے صبح اسی دفتر میں ان حضرات سے ایک مجلس مشاورت طے ہو گئی۔

قازان شہر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں جامعہ اسلامیہ کے نام سے باقاعدہ حکومت کے انتظام میں ایک یونیورسٹی قائم ہے۔ وہاں کے وائس چانسلر صاحب کی خواہش پر جاوید ہزاروی صاحب نے ظہر کی نماز کے بعد یونیورسٹی ہال میں اساتذہ وطلبہ سے میرا خطاب طے کیا ہوا تھا۔ چنانچہ یہاں تقریباً ایک گھنٹہ عربی زبان میں میری تقریر ہوئی جس کا ترجمہ شیخ ذاکر صاحب نے کیا۔ چونکہ عام طور سے سرکاری یونیورسٹیوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ اسلامی علوم کی تعلیم بھی محض ایک فلسفے کی سی صورت اختیار کر جاتی ہے اور عملی زندگی پر اُس کا انعکاس بہت کم ہوتا ہے بالخصوص اتباعِ سنت کا جو اہتمام مطلوب ہے، اس میں بہت کمی نظر آتی

ہے۔ اس لئے میری تقریر کا موضوع یہی تھا کہ علم دین کیا چیز ہے؟ اور اس کے حصول کے کیا تقاضے اور کیا مطالبات ہیں؟ الحمدللہ یہ خطاب توجہ سے سنا گیا اور اس کے بعد وائس چانسلر صاحب نے یونیورسٹی کے مختلف شعبے دکھائے۔ پہلے یہ یونیورسٹی مفتی عثمان صاحب کے زیر اہتمام کام کر رہی تھی، لیکن اب کچھ عرصے سے اس کا انتظام موجودہ وائس چانسلر کے سپرد کر دیا گیا ہے، جن کا اختصاص اسلامی علوم کے بجائے بعض دوسرے عصری علوم میں ہے، اس نئے انتظام سے ناخوش ہو کر یونیورسٹی کے تقریباً بارہ قابل اساتذہ نے استعفیٰ دے دیا ہے اور اس وجہ سے یونیورسٹی ایک بحران میں مبتلا ہے، اور آج کل اس میں اسلامی علوم کی تعلیم بڑی حد تک تعطل کا شکار ہے۔ میں نے وائس چانسلر صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ باہمی افہام و تفہیم سے اس مسئلے کا حل نکالیں اور اساتذہ کی ناراضگی کے اسباب کو دور کر کے یونیورسٹی کو معمول پر لائیں۔

اُسی روز مغرب کی نماز ہمیں شہر قازان کی مشہور اور تاریخی مسجد قل شریف میں پڑھنی تھی اور وہیں قازان کے ضلعی قاضی شیخ رستم اور ان کے رفقاء سے ملاقات طے تھی۔ چنانچہ ہم مغرب سے کچھ پہلے اس مسجد کیلئے روانہ ہوئے۔

قازان ایک بڑا خوبصورت شہر ہے، کھلا کھلا اور کشادہ، سڑکیں چوڑیں اور صاف ستھری، عمارتوں میں نفاست نمایاں نظر آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے قدرتی حسن بھی عطا فرمایا ہے وہ روس کے مشہور دریا وولگا کے کنارے واقع ہے اور شہر کے مختلف حصوں میں قدرتی جھیلوں اور اونچے اونچے خودرو درختوں نے اُس کو ایک منفرد انداز بخشا ہے۔ صنعتی اعتبار سے بھی وہ روس کا اہم شہر ہے جس میں آئل ریفائنری سے لے کر چمڑے، صابن اور غذائی اشیاء کی بڑی بڑی فیکٹریاں قائم ہیں۔ یہاں کی سرکاری یونیورسٹی پورے روس میں اپنے تعلیمی معیار کے لحاظ سے مشہور ہے۔ جس میں ٹالسٹائی اور لینن جیسے لوگوں نے تعلیم حاصل کی ہے (اگرچہ لینن کو طلباء میں شورش پیدا کرنے کی بناء پر یونیورسٹی سے نکال دیا گیا تھا)۔

شہر کے مختلف علاقوں سے گزرتے ہوئے ہم اُس قلعے تک پہنچ گئے جس کے احاطے میں

مسجد قل شریف واقع ہے۔ یہ قلعہ ایک پہاڑی کی بلندی پر واقع ہے اور یہاں سے پورے شہر کا طائرانہ نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ یہی قلعہ تھا جس کے دفاع میں مسلمانوں نے سالہا سال گزارے اور بالآخر ۱۵۵۲ء میں روس کا قبضہ مکمل ہوا۔ ہم قلعے کے احاطے میں داخل ہوئے تو مسجد قل شریف ہمارے سامنے تھی اور اس کے لاؤڈ اسپیکر سے مغرب کی بڑی دلکش اذان بلند ہو رہی تھی۔ قل شریف مسلمانوں کے اس سپہ سالار کا نام تھا جس نے بڑی جانبازی سے روسیوں کا مقابلہ کیا تھا، اُسی کے نام پر یہاں ایک قدیم مسجد تھی، آزادی کے بعد اب اُسے مسمار کر کے اس کے نام پر ایک نئی مسجد تعمیر کی گئی ہے، جو اپنے حسن، اپنی نفاست اور اپنے ڈیزائن کے اعتبار سے واقعۃً دنیا کی منفرد مساجد میں سے ایک ہے۔ چار مینار والی یہ مسجد دور ہی سے اتنی حسین ہے کہ پہلی بار دیکھنے کے بعد نظر اُس پر جم کر رہ جاتی ہے، اندر داخل ہوں تو قدم قدم پر اُس کے بنانے والے کے حسن ذوق کی داد دینی پڑتی ہے۔ نمازِ مغرب ہم نے اس مسجد میں ادا کی، یہاں کے امام بھی قازان کے نوجوان مفتی اور قاضی رستم صاحب ہیں، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں پڑھے ہیں اور اسی بناء پر مجھ سے واقف بھی تھے، وہ بڑی محبت اور اکرام سے اپنے آراستہ و پیراستہ دفتر میں لے گئے جس کی شیشے کی طویل و عریض کھڑکیوں سے گہرائی میں پھیلا ہوا شہر جگمگ کرتا نظر آ رہا تھا۔

مفتی رستم صاحب نے کچھ مزید علماء کو بھی جمع کیا ہوا تھا۔ ان حضرات سے باہمی تعاون کے مختلف طریقوں پر مشورہ ہوا اور متعدد مقامی مسائل پر مفید گفتگو ہوئی، اور عشاء سے کچھ پہلے ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔

عشاء کی نماز ہمیں شہر کی ایک اور مسجد بلو نانی میں پڑھنی تھی اور وہیں میرے عوامی خطاب کا بھی اعلان تھا۔ چنانچہ عشاء کے بعد یہاں میرا تقریباً ایک گھنٹے عربی میں خطاب ہوا۔ قازان کے ایک نوجوان جن کا نام بھی رستم تھا، ریلوے اسٹیشن سے میرے ساتھ تھے، انہوں نے مقامی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس مسجد میں بفضلہ تعالیٰ تبلیغی جماعت کا مرکز ہے اور الحمدللہ اچھے انداز میں کام ہو رہا ہے، میں نے خطاب کے دوران عام مسلمانوں کو جماعت کے کام

میں شریک ہونے کا مشورہ دیا۔ بعد میں بعض حضرات نے اس پر اپنے کچھ اشکالات پیش کئے جن کا جواب پا کر بحمداللہ وہ مطمئن ہوگئے اور اس طرح قازان میں پہلے دن کی مصروفیات اختتام کو پہنچیں جس کے بعد صفر درجے تک پہنچی ہوئی سردی کی وہ خوشگوار رات ہم نے اپنی قیام گاہ پر بسر کی۔

فجر کے بعد مجھے آدھے گھنٹے تیز قدم سے چلنے کی عادت ہے۔ داغستان کے قیام اور گذشتہ رات ریل کے سفر میں مجھے اس کا موقع نہیں ملا تھا۔ قازان میں ہماری قیام گاہ ایک پرفضا مقام پر تھی، اور سڑک کے اُس پار چیڑ کے لمبے لمبے درختوں کا گھنا جنگل تھا، جس کے درمیان پیدل چلنے کے منظم راستے بنے ہوئے تھے۔ فجر کے بعد ہم باہر نکلے تو درجۂ حرارت صفر سے کئی درجے نیچے گرا ہوا تھا اور جنگل کی زمین رات کو پڑی ہوئی برف سے سفید پوش تھی۔ گرم کپڑوں کے ساتھ اس برفانی فضاء میں آدھے گھنٹے کی چہل قدمی سے تمام رفقاء محظوظ ہوئے۔

دس بجے صبح وعدے کے مطابق ہم دوبارہ مرجانی مسجد جانے کیلئے نکلے جہاں غیر سودی تمویل کے موضوع پر مجلس مشاورت طے ہوئی تھی۔ اس وقت برفباری شروع ہو چکی تھی، اور فضاء روئی کے چھوٹے چھوٹے ذرّات کی شکل میں گرتی ہوئی برف سے بھر چکی تھی۔ جب ہم منزل پر پہنچ کر گاڑی سے اُترے تو اس پر برف نے سفید چادر ڈھک دی تھی۔

مفتی عثمان صاحب کے دفتر میں یہ مجلس مشاورت تقریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ ملک میں غیر سودی تمویل کا آغاز کرنے کیلئے جو مختلف طریقے ممکن ہیں، اُن پر غور ہوا۔ روس کے قانونی ڈھانچے میں جو طریقہ میرے نزدیک بہتر اور آسان تر ہو سکتا تھا۔ میں نے اس کی تفصیلات بتائیں۔ اس مجلس میں علماء کے علاوہ فنی ماہرین بھی موجود تھے۔ انہوں نے بہت سے سوالات تیار کر رکھے تھے۔ میں نے ایک ایک کر کے اُن کا جواب دیا اور بالآخر ایک طریق کار طے ہوا جس پر فنی ماہرین نے کام کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ تمام حاضرین اس مجلس کی گفتگو سے بہت مسرور اور مطمئن اُٹھے کہ جس کام کو وہ ایک عرصے سے سوچ رہے تھے

اس کا ایک نہج متعین ہو گیا۔

ظہر کی نماز کے بعد مفتی عثمان صاحب نے مرجانی مسجد کی پشت پر بنے ہوئے ایک حلال ریسٹورنٹ میں ہمارے اعزاز میں ایک ظہرانے کا اہتمام کیا تھا جس میں معززین شہر کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ تاتارستان کے خصوصی کھانوں کی انواع واقسام جمع تھیں اور خاص طور پر دُنبے کا گوشت تیار کرنے کے نت نئے اسلوب وہاں متعارف کرائے گئے جو یادگار حد تک لذیذ تھے۔ کھانے پر بھی مختلف مقامی مسائل پر گفتگو ہوتی رہی اور خاص طور سے غیر سودی تمویل کے بارے میں جو طریقِ کار طے ہوا تھا۔ اس سے حاضرین کو متعارف کرایا گیا اور اس کے مختلف پہلوؤں پر مزید تبادلۂ خیال ہوا۔ اس زمانے میں وہاں عصر کی نماز ڈھائی بجے ہو رہی تھی، چنانچہ کھانے کے بعد نمازِ عصر ادا کر کے ہم قیام گاہ واپس پہنچے۔ اس دوران برف نے پورے شہر کو ڈھانپ لیا تھا۔ میزبانوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ آج کیلئے ہم نے تقریباً سو کلومیٹر دور جس شہر میں پروگرام رکھا تھا، وہ منسوخ ہو گیا، ورنہ برف باری کی وجہ سے یہ سفر سخت دشوار ہو جاتا۔ لیکن قیام گاہ پر پہنچنے کے بعد دروازے پر گھنٹی بجی تو معلوم ہوا کہ اس شہر سے ایک صاحب ملاقات کیلئے آئے ہیں جو میرے پروگرام کی منسوخی کی خبر سن کر وہاں سے چل پڑے تھے اور پانچ گھنٹے کا دشوار سفر طے کر کے یہاں پہنچے ہیں، اُن صاحب کی دینی طلب کی بڑی قدر ہوئی، اُن کا حق تھا کہ کچھ وقت ان کے ساتھ گزارا جائے، دین کی عمومی باتوں کے علاوہ ان کے دل میں کچھ سوالات تھے جو انہوں نے پوچھے اور الحمدللہ مطمئن اور مسرور ہو کر واپس لوٹے۔ مگر مجھے یہ خیال لگا رہا کہ برف باری کی اس رات میں وہ شاید پانچ گھنٹے سے بھی زائد کا سفر کر کے اپنے گھر پہنچ پائیں گے۔

اُسی رات دس بجے ہمیں ٹرین کے ذریعے واپس ماسکو جانا تھا، چند گھنٹے قیام گاہ پر مل گئے جن کو میں نے قرآنِ کریم کے زیر تالیف ترجمہ وحواشی کے کام میں استعمال کیا اور پھر رات دس بجے ہم اسٹیشن پہنچ کر اسی تاتارستان ایکسپریس میں سوار ہوئے جس کے ذریعے ماسکو سے آئے تھے۔

دوبارہ ماسکو میں

اگلی صبح نمازِ فجر ہم نے ٹرین ہی میں پڑھی، اور ابھی سورج نہیں نکلا تھا کہ ٹرین ماسکو ریلوے اسٹیشن میں داخل ہوگئی۔ جناب ہارون صاحب مظفر نگر کے باشندے ہیں جو برسوں سے اپنی تجارت کے سلسلے میں ماسکو میں آباد ہیں اور تبلیغی جماعتوں کی نصرت میں پیش پیش رہتے ہیں۔ انہی کے مکان پر پہلے بھی ہمارا قیام ہوا تھا اور اب بھی ہم اسٹیشن سے انہی کے مکان پر پہنچے جو دیسی طرز کا شاندار ناشتہ لئے ہمارے منتظر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اور اُن کے گھر والوں کو یہ توفیق بخشی ہے کہ وہ بڑے ذوق وشوق کے ساتھ نہ صرف ذاتی مہمانوں بلکہ دین کے حوالے سے آنے والے تمام مسافروں کی دل و جان سے خاطر داری کرتے ہیں۔ روس کے مرکزی مفتی عین الدین صاحب جن کے ذریعے ہمارے ویزوں وغیرہ کا انتظام کرایا گیا تھا اس پورے عرصے میں سفر پر تھے ایک دوروز پہلے واپس آئے تھے اور آج تین بجے شام اُن سے اُن کے دفتر میں ملاقات طے ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کا وقت ہمارے پاس خالی تھا، اس لئے میزبانوں نے ماسکو کے کچھ خاص مقامات دکھانے کا پروگرام بنایا اور سب سے پہلے ہم ماسکو کے قدیم تاریخی اور پُر شکوہ علاقے کریملن کیلئے روانہ ہوگئے۔

ماسکو بڑا طویل وعریض شہر ہے۔ جس کی آبادی تقریباً ڈیڑھ کروڑ بتائی جاتی ہے۔ اتنی بڑی آبادی کے باوجود وہ کھلا کھلا اور کشادہ نظر آتا ہے۔ سڑکیں بہت چوڑی ہیں اور کئی سڑکوں کو میں نے دیکھا کہ اس میں دونوں طرف چھ چھ ٹریک ہیں اور اس طرح سڑک بارہ ٹریکوں پر مشتمل ہے۔ عمارتیں بھی خاصی پُر شکوہ اور خوبصورت ہیں، تاہم کمیونزم کے زمانے میں اس کی مجموعی فضا سادہ تھی جس کے بازاروں میں سرمایہ دار ممالک کی سی رونق نہیں تھی لیکن کمیونزم کے سقوط کے بعد وہ یورپ کے دوسرے سرمایہ دار شہروں کی ساری اچھی بری ادائیں سیکھ چکا ہے۔ وہ تمام ملٹی نیشنل کمپنیز جو کبھی ماسکو کا رُخ نہیں کرسکتی تھیں، اب یہاں پوری آب وتاب کے ساتھ اپنے تجارتی اڈے جما چکی ہیں، جہاں کبھی پرائیوٹ تجارت اور اس کی تشہیر کا کوئی تصور نہیں تھا، آج وہاں قدم قدم پر بڑے بڑے نیون سائن جگمگا رہے

ہیں۔ ہم شہر کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے بالآخر کریملن پہنچ گئے۔

کریملن روس کی اصطلاح میں کسی شہر کے اس قدیم اور تاریخی حصے کو کہا جاتا ہے جو قلعے میں محصور ہو۔ چنانچہ روس کے تمام بڑے شہروں میں اس قسم کے علاقے کو کریملن ہی کہا جاتا ہے۔ اور ماسکو کا کریملن اس بنا پر سب سے ممتاز ہے کہ وہ اس وسیع و عریض ملک کے دارالحکومت کا کریملن ہے۔ یہاں قدیم زمانے کا نہایت پُرشکوہ قلعہ بنا ہوا ہے، جو کبھی بادشاہوں کا مسکن ہوا کرتا تھا، یہ قلعہ بھی سرخ رنگ کا ہے اور اس کے آس پاس عمارتیں بھی اور اسکے پہلو میں ایک بڑا وسیع پختہ میدان ہے جو سرخ چوک یا ریڈ اسکوائر کے نام سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں لینن اور اسٹالن لاکھوں کے مجمع سے خطاب کیا کرتے تھے۔ اسی ریڈ اسکوائر کی ایک سرخ عمارت میں لینن کی لاش ممی بنا کر ایک شوکیس میں محفوظ رکھی ہوئی ہے۔ کمیونزم کے دور میں اُس کا ایک عبادت گاہ کا سا احترام ہوتا تھا، اُسے خاص خاص مواقع پر توپوں کی سلامی دی جاتی تھی، اب اس کا وہ اعزاز تو باقی نہیں رہا، ایک یادگار کے طور پر اب بھی اس کی حفاظت تو ہو رہی ہے۔ لیکن یہ افواہیں گشت کرتی رہتی ہیں کہ موجودہ حکومت لینن کی لاش کسی میوزیم کو قیمتاً دینا چاہتی ہے۔ یہ افواہیں درست ہوں یا نہ ہوں، لیکن یہ ایک عبرت گاہ ضرور ہے، جس شخص نے کروڑوں انسانوں پر پورے جبر و استبداد کے ساتھ حکومت کی، آج اس کی لاش بدلتی ہوئی حکومتوں کے رحم و کرم پر ہے اور اب اُس کے محکوموں کی اکثریت اُسے اچھے نام سے یاد نہیں کرتی، اور جس شہر کو لینن گراڈ قرار دے کر اُس کے نام سے منسوب کیا گیا تھا، بعد کے لوگوں نے اس نام کو بھی مٹا دیا ہے۔ اور مرنے کے بعد کی جس زندگی کو اُس نے افسانہ سمجھا تھا، آج اُس زندگی میں اُس کا کیا حال بنا ہوگا۔ اُسے اللہ تعالیٰ کے سوا کون جان سکتا ہے؟

لینن کی اس عمارت کے پیچھے اور قلعہ کی دیوار کے سائے میں اسٹالن اور دوسرے بہت سے کمیونسٹ لیڈروں کی قبریں بھی بنی ہوئی ہیں، اور قلعہ کا ایک حصہ عجائب گھر میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ریڈ اسکوائر کے دوسری طرف بڑی آراستہ پیراستہ دکانیں ہیں اور یہ سارا

ماسکو ریڈ اسکوائر کا ایک منظر

ماسکو کی سیون سسٹرز میں سے ایک عمارت

علاقہ سیاحوں سے بھرا ہوا ہے۔

ہمیں ظہر کی نماز اس مسجد میں پڑھنی تھی جو یہاں تاریخی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ چنانچہ عبدالسلام صاحب کی رہنمائی میں یہاں کے قریبی اسٹیشن سے ہم زیر زمین ٹرین میں سوار ہوئے۔ ماسکو میں زیر زمین ٹرینوں کا نظام بڑا مستحکم اور وسیع ہے۔ ایک ایک اسٹیشن میں تہہ بر تہہ کئی کئی پلیٹ فارم بنے ہوئے ہیں، اور اُن کی کشادگی اور صفائی ستھرائی بھی دوسرے بہت سے شہروں کے مقابلے میں بہتر ہے، ٹرین نے دس پندرہ منٹ میں ہمیں منزل تک پہنچادیا اور ہم ماسکو کی سب سے قدیم مسجد میں داخل ہوگئے جو ۱۷۸۲ء میں ابتداءً تعمیر ہوئی تھی۔ ۱۸۲۳ء میں اس کی تجدید ہوئی اور اسی وجہ سے اُسے تاریخی مسجد کہا جاتا ہے۔ ظہر کی نماز ہم نے یہاں ادا کی اور ہمارے رفقاء میں سے جناب جاوید ہزاروی اور عرفان جان صاحب نے بتایا کہ وہ کئی سال پہلے پہلی بار یہاں ایک جماعت کے ساتھ آئے تھے تو مسجد میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی، اس لئے انہوں نے سخت سردی کے باوجود مسجد کے باہر پڑے ہوئے کنٹینرز میں پچیس دن گزارے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کی محنتوں اور قربانیوں کے نتیجے میں اب جماعت کے کام کو یہاں کافی ترقی دیدی ہے اور وہ لوگوں کی دینی رہنمائی میں بڑا فعال کردار ادا کر رہی ہے۔

تین بجے چونکہ مفتی عین الدین صاحب کے دفتر میں پہنچنا تھا اس لئے ہم یہاں سے کار کے ذریعے ریسپیکٹ میرا کی اُس مسجد کیلئے روانہ ہوئے جہاں پہلے دن میری تقریر ہوئی تھی۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اسی مسجد کے احاطے میں ملک کے مرکزی ''الادارۃ الدینیۃ'' کا سیکریٹریٹ قائم ہے جس کے سربراہ مفتی عین الدین صاحب ہیں (جنہیں یہاں غین الدین کہا جاتا ہے) یہ صاحب تاشقند میں تعلیم پائے ہیں اور عربی خاصی روانی سے بولتے ہیں۔ یہ پورے ملک کے مفتی ہیں اور حکومتی سطح پر ملک بھر میں تمام دینی سرگرمیوں کے نگران ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ روس کے موجودہ صدر پوتن سے ان کے اچھے تعلقات ہیں اور اس کی بناء پر انہیں مسلمانوں کے مختلف مقاصد و مصالح حاصل کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ چونکہ

روس میں دینی سرگرمیوں کیلئے یہی واحد ادارہ ہے جسے حکومت کسی شک کی نگاہ سے نہیں دیکھتی، اس لئے ادارے کی بعض کمزوریوں کے باوجود دستیاب حالات میں یہاں کسی بھی دینی کام کیلئے اس ادارے کو اعتماد میں لینا ضروری ہے۔

مفتی عین الدین صاحب نے بہت تپاک سے ہمارا استقبال کیا۔ اپنے آراستہ وپیراستہ دفتر میں، جسے وزیروں کا سا پروٹوکول حاصل ہے، انہوں نے اس ملاقات کا خاصا اہتمام کیا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے الادارۃ الدینیہ کا تعارف کرایا، کمیونزم سے آزادی کے بعد اس کی سرگرمیوں کی تفصیل بتائی۔ اُن کا کہنا تھا کہ سوویت یونین کے عہد اقتدار میں روس جیسے طویل وعریض ملک میں صرف سو مسجدیں باقی رہ گئی تھیں اور ان میں سے اکثر غیر آباد۔ لیکن ۱۹۹۱ء میں جمہوری دور کے آغاز کے بعد مساجد کی تعمیر جس تیزی سے شروع ہوئی، اس کی بناء پر اب ملک بھر میں چھ ہزار مسجدیں بفضلہٖ تعالیٰ تعمیر اور آباد ہو چکی ہیں۔ ماسکو میں مسلمان اُس وقت سے آباد چلے آتے ہیں جب سے یہ شہر وجود میں آیا، لہٰذا مسلمانوں کی تاریخ ایک ہزار سال پرانی ہے، لیکن اب یہاں مسلمانوں کی آبادی دس لاکھ سے متجاوز ہو چکی ہے۔ شہر میں صرف پانچ مسجدیں ہیں جو مسلمانوں کی ضروریات کیلئے ناکافی ہیں، لیکن اب پرانی مساجد کی توسیع اور نئی مسجدوں کی تعمیر کے منصوبوں پر کام ہو رہا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ مردم شماری کے لحاظ سے عیسائیت کے بعد اسلام روس کا دوسرا سب سے بڑا مذہب ہے، اور اب الادارۃ الدینیہ کے زیر اہتمام ہر مسجد میں بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ عالم اسلام کے مختلف ممالک میں الادارۃ الدینیہ کے رابطے استوار ہوئے ہیں، اور سعودی عرب، کویت اور دوسرے مسلم ممالک مسلمانوں کی ضروریات پوری کرنے میں مدد دے رہے ہیں۔ ہم نے مفتی صاحب کو پیشکش کی کہ روس کے مسلمانوں کی خدمت کیلئے ہم کتابیں اور مبلغین بھیجنے کا انتظام کر سکتے ہیں، نیز قانونی ضروریات پوری کر کے یہاں سے طلبہ ہمارے یہاں تعلیم کیلئے آ سکتے ہیں، لیکن اس کیلئے ان کے سرگرم تعاون کی ضرورت ہوگی اگر وہ آنے والوں کیلئے ویزا کا انتظام اور جانے والوں کو ادارے کی

طرف سے NOC کے حصول کا انتظام کر سکیں تو یہ باہمی تعاون تیزی سے آگے بڑھ سکتا ہے۔ مفتی صاحب نے اس سلسلے میں اپنے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا اور بتایا کہ تبلیغی جماعتوں کیلئے وہ بذاتِ خود دلچسپی لے کر ویزے کا انتظام کراتے رہے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

الحمدللہ! یہ ملاقات بامعنی اور مفید رہی۔ یہاں رہنے والے ہمارے تمام احباب نے اس بات پر زور دیا تھا کہ اگر چہ یہاں کے مفتی حضرات کا طریق کار ہمارے مزاج و مذاق سے مختلف ہے، لیکن ملک میں دینی کام کو آگے بڑھانے کیلئے بحالاتِ موجودہ ان سے روابط قائم ہونا نہایت ضروری ہے اور اس کے بغیر یہاں کوئی مفید کام کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لحاظ سے یہ حضرات ان ملاقاتوں سے بہت مطمئن اور مسرور تھے۔

مغرب کی نماز ہم نے واپس قیام گاہ پہنچ کر پڑھی اور عشاء کے بعد ہمارے میزبان جناب ہارون صاحب نے رات کے کھانے پر ماسکو کے احباب کا اچھا خاصا اجتماع کر رکھا تھا، اور ماسکو کی فضاء میں یو۔ پی کے ٹکسالی کھانوں کا بہترین انتخاب دسترخوان پر سجایا ہوا تھا۔ بیشتر حضرات کے ذہن میں بہت سے سوالات تھے، جن میں سے کچھ اجتماعی طور پر پوچھے گئے اور کچھ مختلف حضرات نے تنہائی میں پوچھنے چاہے اور اس طرح فرداً فرداً ان حضرات کو جوابات دیئے گئے اور رات گئے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

اگلا دن روس میں ہمارا آخری دن تھا اور اُسی دن مغرب کے بعد ہماری واپسی طے تھی۔ دوران قبل جب میں ٹرین میں تھا، میرے پاس روس میں پاکستانی سفارت خانے کے سیکنڈ سیکریٹری جناب آفتاب حسین خان صاحب کا فون آیا تھا اور انہوں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ ماسکو کے قیام کے دوران میں کسی وقت پاکستانی سفارت خانے بھی جاؤں۔ یہ صاحب اپنا بچپن دارالعلوم کے پڑوس میں گزار چکے تھے، اس لئے میری آمد کی خبر سن کر انہوں نے بڑے اہتمام سے رابطہ قائم کیا تھا۔ روس میں آئندہ دینی کام کیلئے بھی پاکستانی سفارت خانے کی وساطت ضروری تھی، بالخصوص یہاں کے مفتی صاحبان نے ہم سے کہا تھا کہ ہم

تک کتابیں پہنچانے کا محفوظ ترین طریقہ یہ ہے کہ کتابیں سفارتخانے کے ذریعے آئیں۔ چنانچہ آج ہم نے سفارتخانے جانا طے کیا۔ لیکن ساتھیوں نے وہاں جاتے ہوئے ماسکو کے کچھ اور مقامات بھی دکھائے، مثلاً وہ جگہ جہاں روسی حکومت نے دوسری جنگ عظیم کی یادگار بنائی ہے، دوسری جنگ عظیم کے موقع پر روس کی افواج نے یہاں جرمنی کو شکست دی تھی، اس کی یادگار کے طور پر یہاں ایک بڑا طویل وعریض پارک بنایا گیا ہے جہاں علامتی طور پر ٹینک اور بم وغیرہ رکھے ہوئے ہیں، اور کمیونزم کے زوال کے بعد نئی حکومت نے اپنے سیکولر ہونے کے نشان کے طور خود اپنی طرف سے مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کیلئے الگ الگ عبادت گاہیں تعمیر کی ہیں۔ چنانچہ یہاں ایک خوبصورت مسجد بھی بنائی گئی ہے۔ اسی پارک کے سامنے روس کی سب سے بڑی یونیورسٹی کی شاندار عمارت ہے جس میں دنیا بھر کے طلبہ زیرِ تعلیم ہیں۔

روس کی سب سے طویل وعریض اور خوبصورت سڑک کوتوزویسکی پراسپکٹ سے گذرتے ہوئے بالآخر ہم پاکستانی سفارتخانے پہنچے۔ جناب آفتاب حسین خان صاحب نے محبت سے استقبال کیا اور ان سے دوسری باتوں کے علاوہ کتابوں کی ترسیل اور یہاں سے جانے والے طلبہ کے سلسلے میں بھی بات ہوئی۔ نماز ظہر بھی ہم نے سفارتخانے میں ادا کی اور یہیں سے وطن واپسی کیلئے ایئرپورٹ روانہ ہوگئے اور دبئی کے راستے اگلے دن علی الصباح کراچی واپس پہنچے۔

مجموعی تاثرات

یہ میرا روس کا پہلا دورہ تھا اور جس ملک کے حالات دور دور سے سنا کرتے تھے اسے بچشمِ خود دیکھنے کا پہلی بار موقع ملا۔ یہ سفر اگرچہ مسلسل مصروفیات کی وجہ سے ایک تھکا دینے والا سفر تھا لیکن یہ بڑا معلومات آفریں، دلچسپ اور کئی اعتبار سے مفید ثابت ہوا۔ آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو یہ یقین کرنا مشکل ہوتا کہ اس ملک میں اب بھی مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد ہے جو اپنے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے کیلئے جدوجہد کر رہی ہے۔

جب دنیا بھر میں اشتراکی نظریات کا غلغلہ برپا تھا، اُس وقت جب کہیں سے یہ آواز اُٹھتی کہ اشتراکی ممالک میں مسلمانوں پر ظلم وستم ہو رہا ہے تو ہمارے ملک کے اشتراکیت نواز حلقے اُسے امریکی پروپیگنڈہ قرار دیا کرتے تھے۔ اب جو روسی مسلمانوں کی خود اپنی زبان سے اُس دور کے حالات سنے ہیں تو اندازہ ہوا کہ ظلم وستم کی جو داستانیں اُس وقت ہم تک پہنچی تھیں، وہ حقیقت کا دسواں حصہ بھی نہیں تھیں۔

میرا یہ سفر اُس وقت ہوا جب کمیونزم یہاں ۷۴ سال تک اپنا سکہ بٹھانے کے بعد اپنے زوال کو پہنچ چکا تھا اور نئے جمہوری نظام کو قائم ہوئے بھی سترہ سال گزر چکے تھے، اس لئے دونوں زمانوں کو دیکھنے والے موجود تھے اور دونوں نظاموں کا موازنہ کر سکتے تھے۔ اُن کے مشاہدات اور تجربات ان سے براہِ راست معلوم کرنے کا موقع ملا اور نئے انقلاب کے نتیجے میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اُن کا بذاتِ خود مشاہدہ ہوا۔

کمیونزم کے دور میں اپنی تکنیکی ترقی کے باوجود روس ایک سادگی پسند ملک تھا جس میں سرمایہ دار ممالک جیسی رونق نہیں تھی، لیکن کمیونزم کے سقوط کے بعد وہ یورپ کے دوسرے سرمایہ دار شہروں کی ساری اچھی بُری ادائیں سیکھ چکا ہے۔ وہ تمام ملٹی نیشنل کمپنیاں جو کبھی ماسکو کا رُخ نہیں کر سکتی تھیں، اُن سب نے یہاں اپنے تجارتی اڈے اُسی آب وتاب کے ساتھ جما لئے ہیں جو سرمایہ دار ملکوں میں نظر آتی ہے۔ جس امریکی تہذیب کا نام کبھی یہاں گالی سمجھا جاتا تھا، آج وہ نوجوانوں کا آئیڈیل بنی ہوئی ہے، جہاں کبھی پرائیوٹ تجارت کی تشہیر کا تصور تک نہ تھا، آج وہاں قدم قدم پر بڑے بڑے نیون سائن جگمگا رہے ہیں، وحی الٰہی کی رہنمائی کے بغیر انسان افراط وتفریط کی جن انتہاؤں کے درمیان جھولتا رہتا ہے، اس کا انتہائی عبرت ناک نظارہ روس کے انقلابات میں آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ زارِ روس کے زمانے میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے غریبوں کے ساتھ جو ناانصافیاں روا رکھی ہوئی تھیں، کمیونزم اس کا ردِّ عمل تھا جو اپنے ناعاقبت اندیش جوش کے سیلاب میں شخصی آزادیوں کی ہر جائز قدر کو بھی بہا لے گیا، اور اس نے پورے ملک کو ایک وسیع قید

خانے میں تبدیل کر دیا۔ ستر سال سے زائد مدت تک لوگ مساوات کے پُر فریب نعرے سے دھوکہ کھا کر جبر و استبداد کی گھٹی ہوئی فضا میں زندگی گزارتے رہے۔ لیکن جب اس فریب کا جادو ٹوٹا اور لوگوں کو اس گھٹی ہوئی زندگی سے آزادی ملی تو وہ ایک مرتبہ پھر ساری معقول حدود کو پھلانگ کر مادر پدر آزاد ہو گئے ہیں۔ کمیونزم کے دور کا ایک مثبت پہلو یہ تھا کہ اس میں روپے پیسے کی اندھی دوڑ نہیں تھی، لیکن اب ہر شخص اس دوڑ میں تمام مذہبی اور اخلاقی قدروں کو روندتا ہوا بگ ٹُٹ بھاگ رہا ہے، غریب و امیر کے درمیان فاصلے بڑھ گئے ہیں، اور ان کے اندازِ زندگی کا فرق نمایاں ہو گیا ہے، جس کے نتیجے میں رشوت ستانی میں بھی اضافہ ہوا ہے، کمیونزم کے دور میں اپنی ساری برائیوں کے باوجود عریانی و فحاشی پر کسی درجے میں ایک روک قائم تھی، اب یہ روک ہٹ گئی ہے اور دوسرے مغربی ملکوں کی طرح یہاں بھی فحاشی کا عفریت کوچہ و بازار میں ننگا ناچ رہا ہے۔ غرض جس تیزی کے ساتھ یہ ملک اشتراکیت کی پہلی تجربہ گاہ بنا تھا، اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ اس میں سرمایہ دارانہ نظام اپنی پوری فتنہ سامانیوں کے ساتھ اپنے پاؤں جما چکا ہے۔ میں نے یہاں کے مختلف لوگوں سے پوچھا کہ یہاں کے عام باشندے کمیونزم کے دور کو زیادہ پسند کرتے ہیں یا موجودہ نظام زندگی کو؟ تقریبا سب لوگوں کا جواب ایک ہی تھا کہ جو بڑے بوڑھے لوگ ہیں وہ تو کمیونزم کے دور کو اس لئے یاد کرتے ہیں کہ اُس میں انہیں ایک معین ماہانہ آمدنی مل جایا کرتی تھی اور اب انہیں پیسے کی دوڑ میں دوسروں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے لیکن نئی نسل کو اس نئے نظام میں جو آزادی اور زیب و زینت میسر آئی ہے، نفسانی خواہشات کی تکمیل کے دروازے جس طرح چوپٹ کھلے ہیں اور زیادہ دولتمند ہونے کے جو مواقع ملے ہیں اس کی وجہ سے وہ اسی نظام کو بہتر سمجھتی ہے اور کمیونزم کی طرف واپس جانا اُس کو کسی طرح گوارا نہیں ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، مجموعی حیثیت سے وہ اس لئے خوش ہیں کہ دینی عبادات ادا کرنے پر کمیونزم کے دور میں جو تشدد ہوتا تھا اب انہیں اس سے نجات مل گئی ہے، اور اسی لئے ان کی مساجد تعمیر اور آباد ہو رہی ہیں، مدارس کھلنے کے بھی امکان پیدا ہوئے ہیں

اور اب انہیں عالم اسلام کے دوسرے ممالک سے رابطے پیدا کرنے کا بھی موقع ملا ہے۔ البتہ چیچنیا کی تحریک آزادی کی وجہ سے یہ بات اب بھی باقی ہے کہ خاص طور سے مسلمان حلیہ رکھنے والوں پر سرکاری ایجنسیوں کی کڑی نگاہ رہتی ہے اور معمولی معمولی شبہات کے نتیجے میں اب بھی لوگوں کو مشکلات پیش آتی ہیں اور فی الحال روس میں دین کی تعلیم و تبلیغ کا کام جاری رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ وہ ان مفتی حضرات کو اعتماد میں لے کر ہو جو سرکاری سطح پر تسلیم شدہ ہیں اور میرے اس دورے کے مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ان حضرات سے روابط استوار ہوں اور پھر اُن کے ذریعے وہاں تعلیم و تبلیغ کو آگے بڑھانے کیلئے جو کچھ کیا جا سکتا ہو، کیا جائے۔ جو الحمدللہ بڑی حد تک حاصل ہوا اور ساتھ ہی اس دورے سے مجھے یہ احساس بڑی شدت کے ساتھ پیدا ہوا کہ عالم اسلام کو اس خطۂ زمین کی طرف خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس ملک کے حالات اور ضروریات سے عالم اسلام بڑی حد تک بے خبر ہے۔ لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ روس میں حکومت کے اعداد و شمار کے مطابق مسلمانوں کی تعداد ڈھائی کروڑ ہے اور واقعے میں اس سے زائد بھی ہو سکتی ہے اور اس طویل و عریض ملک میں جو فن لینڈ سے جاپان تک پھیلا ہوا ہے، کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جہاں مسلمان بڑی تعداد میں آباد نہ ہوں۔ کمیونزم کے دور کی قید و بند کی وجہ سے یہاں کے مسلمانوں کے ساتھ رابطہ مشکل تھا، لیکن اب وہ صورتحال باقی نہیں رہی۔ وہاں کے مسلمان دینی تعلیم و تربیت اور تبلیغ کے حاجت مند ہیں اور ان میدانوں میں جتنی کوششیں امریکہ اور یورپ کے دوسرے ممالک میں صرف ہوئی ہیں، اب یہاں اُن سے زیادہ اہتمام کے ساتھ کام کی ضرورت ہے۔ یہ ملک اس بات کا مستحق ہے کہ وہاں تبلیغی جماعتیں کثرت کے ساتھ جائیں، تعلیمی ادارے قائم ہوں اور روسی زبان میں دینی لٹریچر تیار کر کے پھیلایا جائے اور وہاں کے طلبہ ہمارے ملک میں تعلیم حاصل کریں۔ اس وقت روسی زبان میں دینی کتابوں کی تشویشناک حد تک کمی ہے جسے جلد از جلد پورا کرنا ضروری ہے۔ تاتارستان کے ایک عالم جو پاکستان کے رائے ونڈ کے مدرسے تعلیم حاصل کر کے گئے ہیں،

روسی زبان میں متعدد کتابوں کا ترجمہ کر چکے ہیں، جن میں تعلیم الاسلام اور بہشتی زیور شامل ہیں۔ میرے بعض مضامین کا بھی انہوں نے ترجمہ کیا ہے اور اب انہوں نے میرے ''اصلاحی خطبات'' پر منتخب حصوں کا ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ لیکن یہ کام بڑے پیمانے پر کرنے کی ضرورت ہے اور میرے اس سفرنامے کا مقصد یہ بھی ہے کہ جو حضرات وہاں کے حالات سے واقف نہیں ہیں وہ ان ضروریات کا احساس کر کے جس میدان میں جو خدمت کر سکتے ہوں، اس سے دریغ نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ اس سلسلے میں ہمیں اپنے فرائض ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

دس روز جاپان میں

جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ

مئی 2008ء

دس روز جاپان میں

(جمادی الاولی ۱۴۲۹ھ / مئی 2008ء)

حمد و ستائش اس ذات کیلئے ہے جس نے اس کارخانہ عالم کو وجود بخشا

اور

درود و سلام اس کے آخری پیغمبر ﷺ پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

گیارہ سال پہلے بھی میں جاپان جاچکا ہوں جس کا تذکرہ میری کتاب ”دنیا مرے آگے“ میں ”دنیا کے گرد ایک سفر“ کے عنوان کے تحت موجود ہے، لیکن اُس وقت میں امریکہ سے واپسی پر راستے کی ایک منزل کے طور پر صرف دو رات ٹوکیو میں رکا تھا۔ اس لئے وہ جاپان کا ایک سرسری اور تعارفی سفر تھا۔ لیکن اس مرتبہ منزلِ مقصود ہی جاپان تھی اور وہاں دس روز گزارنے کا موقع ملا اور کچھ نئے مقامات دیکھنے کے علاوہ جاپانی زندگی کے کچھ اور پہلو بھی سامنے آئے جن کے تذکرے کیلئے یہ سفرنامہ حاضر ہے۔

جاپان کے کچھ تاجر دوستوں کی طرف سے تقریباً سال بھر سے یہ فرمائش تھی کہ میں ہفتہ دس دن ان کے ساتھ گزاروں، اور اُن کے تجارتی مسائل میں شرعی مشورے دینے کے علاوہ عام مسلمانوں سے دعوتی اور اصلاحی خطابات بھی ہوں۔ یہ سفر ٹلتا رہا، یہاں تک کہ میں نے دارالعلوم کے ششماہی امتحانات کے زمانے میں وہاں جانے کا ارادہ کیا اور یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ مطابق ۷/ مئی ۲۰۰۸ء کی رات کو تھائی ایئرویز کے طیارے سے روانگی ہوئی اور بنکاک سے طیارہ تبدیل کیا جس نے اگلے دن جاپانی وقت شام کے ۴ بجے کے قریب

(جو پاکستانی وقت سے ۴ گھنٹے آگے ہے) ٹوکیو کے نریتا ایئر پورٹ پر اُتارا۔ میرے دوست جناب آصف صاحب جن کا تذکرہ میں اپنے فیجی کے سفرنامے میں کر چکا ہوں، اب جاپان منتقل ہوگئے ہیں، اور اس سفر کے اصل محرک وہی تھے۔ وہ اپنے رفقاء کے ساتھ استقبال کیلئے موجود تھے۔ جن میں مولانا سلمان تھانوی، مولانا انس صاحب اور عتیق صاحب بطورِ خاص قابل ذکر ہیں۔ نریتا ایئر پورٹ شہر سے بہت دور ہے، اور ہمارے قیام کا انتظام ٹوکیو کے ایک مضافاتی شہر آبینا میں تھا۔ اس لئے ایئر پورٹ سے قیام گاہ تک کا فاصلہ تقریباً ڈھائی گھنٹے میں طے ہوا۔ راستے میں مغرب کا وقت ہوا تو ہم جاپان کے مشہور صنعتی شہر یوکوہاما کی بندرگاہ کے قریب سے گذر رہے تھے۔ یہاں ایک کئی کلو میٹر لمبا رَسّوں سے لٹکتا ہوا پل ہے جو کہیں سمندر اور کہیں آبادی پر سے بل کھاتا ہوا گذرا ہے اور بذاتِ خود ایک عجوبہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی پل کے نیچے ایک پارکنگ کا علاقہ ہے جو ایک تفریح گاہ بھی سمجھی جاتی ہے، یہاں ہم نمازِ مغرب کیلئے رکے اور اوپر نگاہ اُٹھائی تو اس بڑے پل کے نیچے خم دار پلوں کا ایک اور جال بچھا ہوا تھا جس پر کاریں مختلف سمتوں میں دوڑ رہی تھیں۔ ایک ایسا منظر جو چند لمحوں کیلئے انسان کو مبہوت کرنے کیلئے کافی ہے۔ موسم میں بڑی خوشگوار خنکی تھی اور تازہ ہوا کے جھونکوں نے جسم و دماغ کو تھوڑی دیر کیلئے تازہ کر دیا۔ عشاء کے قریب ہم قیام گاہ پر پہنچے۔ یہ ایک ریسٹ ہاؤس تھا جو آبینا شہر کے ایک خوبصورت علاقے میں تیسری منزل پر واقع تھا۔ ہمارے میزبان جناب حامد عزیز صاحب نے یہاں کاروں کی خرید و فروخت کیلئے ایک کمپنی قائم کی ہوئی ہے۔ اس کی خوبصورت عمارت کی تیسری منزل پر انہوں نے یہ کشادہ ریسٹ ہاؤس بنایا ہے جو تمام رہائشی سہولتوں سے آراستہ ہے۔ انہوں نے ہی اس عمارت کے قریب ایک مسجد تعمیر کی ہے جو مدینہ مسجد آبینا کے نام سے معروف ہے۔ جاپان میں مکانات اور تعمیر کے اخراجات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ دو سو مربع گز پر بنی ہوئی تین منزلہ مسجد ہے جس کی تعمیر پر پاکستان کے حساب سے تقریباً سات کروڑ روپے لاگت آئی ہے۔ مسجد کے ساتھ ایک جگہ کاروں کی پارکنگ کیلئے بھی کرائے پر لی ہوئی ہے۔ اس مسجد میں عشاء کی نماز ادا کی

اور نماز کے بعد حاضرین سے مختصر خطاب بھی ہوا۔

اگلی صبح جمعہ تھا، نمازِ فجر کی جماعت یہاں چار بج کر دس منٹ پر ہو رہی تھی اور سورج ساڑھے چار بجے نکل رہا تھا۔ لہٰذا رات بہت مختصر تھی۔ مسجد کی دیوار قبلہ کے سامنے ایک دریا کے کنارے طویل و عریض پارک ہے جہاں میں نے فجر کے بعد اپنی چہل قدمی کا معمول پورا کیا اور اس کے بعد آرام۔

جمعہ کے وقت مسجد کی تینوں منزلیں نمازیوں سے بھر گئی تھیں۔ جمعہ سے پہلے میرا خطاب اردو میں ہوا جس کا ساتھ ساتھ جاپانی اور انگریزی میں ترجمہ کرنے کا انتظام موجود تھا۔ نماز کے بعد دور دور سے آئے ہوئے مسلمانوں سے ملاقات بھی ہوئی اور کچھ دیر جاپان میں مسلمانوں کی زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں مذاکرہ بھی رہا۔

اُسی روز مغرب کے بعد ٹوکیو کے بعض مسلمان رہنما ملاقات کیلئے تشریف لائے جن میں ٹوکیو اسلامک سینٹر کے انتظامی سربراہ مولانا سلیم الرحمٰن صاحب دار العلوم ندوۃ العلماء سے پڑھے ہوئے ہیں اور سالہا سال سے اسلامک سینٹر میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مولانا سلمان تھانوی صاحب ہمارے دوست مولانا قاری احمد میاں تھانوی صاحب کے صاحبزادے ہیں جو ابینا میں تعلیم و تدریس میں اور مسلمانوں کے دینی مسائل میں ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ جناب ابراہیم اوکوبو صاحب ایک جاپانی نژاد نومسلم ہیں جو دعوت دین کے کام میں یہاں بڑے سرگرم ہیں اور ہر طبقۂ خیال کے مسلمان انہیں بہت عزت و احترام سے دیکھتے ہیں، انہوں نے تبلیغی نصاب کا جاپانی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور آج کل فضائل صدقات کے ترجمے میں مصروف ہیں۔ انہوں نے جاپانی مسلمانوں کی مشکلات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے ملک میں مستند اہل علم کی تعداد بہت کم ہے اور جو اہل علم موجود ہیں، اُن کے درمیان رابطے کی کمی ہے۔ جس کی وجہ سے بعض اوقات مسلمانوں کو حلال و حرام کے مسائل میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ یہاں کے اہل علم اور مسلمان رہنماؤں کی کوئی تنظیم ایسی ہونی چاہئے جو نہ صرف

اجتماعی مشورے سے مسلمانوں کی رہنمائی کرے، بلکہ پاکستان کے علماء سے بھی رابطے میں رہے، اور نئے پیش آنے والے مسائل میں ان سے مشورہ کرکے کوئی لائحہ عمل اختیار کرے۔

مولانا سلیم الرحمٰن صاحب اور مولانا سلمان تھانوی صاحب نے بھی اس تجویز کو پسند کیا اور اس سمت میں ابتدائی کارروائی میری جاپان میں موجودگی کے دوران ہی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

عشاء کے بعد آبینا کی مسجد میں میرے خطاب کا اعلان تھا، کافی دور دور سے لوگ اس اجتماع میں شرکت کیلئے آئے ہوئے تھے۔ میں نے سورۂ تکاثر کی بنیاد پر کچھ گذارشات پیش کیں، چونکہ جاپان میں زیادہ تر مسلمان تجارت پیشہ ہیں اس لئے اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے روپے پیسے کی دوڑ کے جو خطرات بیان فرمائے ہیں ان کی تفصیل عرض کی گئی اور حاضرین سے درخواست کی گئی کہ وہ کچھ وقت اپنے اور اپنے بچوں کے دینی حالات کو بہتر بنانے میں صرف کریں اور اس کیلئے ایک تو تبلیغی جماعتوں میں شرکت بہترین راستہ ہے اور دوسرے روزانہ رات کو سونے سے پہلے گھر والوں کے ساتھ مل کر کسی دینی کتاب کا مطالعہ کیا جائے جس کیلئے تبلیغی نصاب، حیات المسلمین اور اسوۂ رسولِ اکرم ﷺ بہترین کتابیں ہیں۔

اگلا دن اتوار تھا اور صبح سے ظہر تک کا وقت میرے اصل میزبان جناب حامد عزیز صاحب نے اپنی تجارتی کمپنی Quintex کے مسائل کیلئے مخصوص کیا تھا۔ یہ کمپنی جاپان سے دنیا کے مختلف ممالک میں کاریں برآمد کرتی ہے اور اس کا کاروبار اچھا خاصا پھیلا ہوا ہے۔ حامد عزیز صاحب ایک غیرتمند پاکستانی مسلمان ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ ان کے کاروبار میں کسی غیر شرعی معاملے کی آمیزش نہ ہو، اس لئے انہوں نے اپنے ذمہ دار رفقاء کی معیت میں میرے ساتھ یہ میٹنگ طے کی تھی جس میں انہوں نے کاروبار کی تفصیل بھی بیان کی، اور اس سلسلے میں انہیں جو سوالات درپیش تھے وہ میرے سامنے رکھے، اور کاروبار کے مختلف پہلوؤں اور زکوٰۃ سے متعلق بہت سے مسائل کے بارے میں شرعی احکام معلوم کئے

جنہیں باقاعدہ لکھ کر کمپنی کے طریق کار کا تعین کیا گیا۔ یہ میٹنگ جو بہت سے پیچیدہ مسائل سے متعلق تھی، ظہر تک جاری رہی۔

اُن تمام غیر مسلم ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، بچوں کی تعلیم و تربیت ایک ایسا مسئلہ ہے جو مسلمانوں کے مسائل میں شاید سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اور میں ہر جگہ اس بات پر زور دیتا رہا ہوں کہ مسلمانوں کو اپنے بچوں کے تحفظ کیلئے خود اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے چاہئیں۔ یورپ اور امریکہ کے بعض علاقوں میں الحمدللہ اب ایسے ادارے قائم ہو رہے ہیں، لیکن جاپان میں ابھی تک ایسا کوئی قابل اطمینان انتظام نہیں ہو سکا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام مسلمان بچے عام تعلیمی اداروں کی فضاء میں رہ کر دینی تعلیم و تربیت سے بالکل محروم رہ جاتے ہیں۔ یہ بڑی سنگین صورتحال ہے جس کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے، اور میں جاپان میں جہاں بھی گیا، وہاں مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کرتا رہا۔

ایبنا کی مسجد میں تقریباً سال بھر سے ایک مکتب کا انتظام کیا گیا ہے جس میں شام کے وقت تقریباً ستر بچے قرآنِ کریم اور دینیات وغیرہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اب اُسے کل وقتی مدرسے میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔

اتوار کو ظہر کی نماز کے بعد اس مکتب کے بچوں اور اُن کے سرپرستوں کا ایک اجتماع رکھا گیا تھا۔ طارق صاحب جو ہمارے قیام کے دوران ہمارے لئے بڑی محبت سے کھانے کا انتظام کرتے رہے، اُن کے ایک بچے کا قرآنِ کریم مکمل ہوا تھا اور دوسرے بچے کی بسم اللہ تھی، نیز بہت سے جاپانی بچے جمع تھے۔ ان سے قرآنِ کریم کی مختلف سورتیں اور مسنون دعائیں سن کر خوشی ہوئی کہ بفضلہٖ تعالیٰ یہ کام کسی نہ کسی درجے میں شروع تو ہوا ہے۔ میں نے بچوں کے سرپرستوں سے درخواست کی کہ بچوں کی دینی تعلیم و تربیت چونکہ والدین کا فریضہ ہے اس لئے اُن کا فرض ہے کہ وہ گھر میں بھی بچوں کو مناسب وقت دیں اور انہیں غیر محسوس طریقے سے بھی اسلامی احکام و آداب سے متعارف کراتے رہیں۔

اُسی روز شام کو عصر کے بعد مولانا سلیم الرحمٰن صاحب نے ٹوکیو کے اسلامی سینٹر میں

مختلف تنظیموں کے افراد کا ایک اجتماع رکھا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ ٹوکیو اور مضافات میں جو حضرات دینی اور سماجی کام کر رہے ہیں، اُن سے بیک وقت میری ملاقات بھی ہو جائے اور میں ان کے سامنے کچھ گزارشات بھی پیش کر سکوں، چنانچہ عصر کی نماز ہم نے ٹوکیو اسلامک سینٹر میں پڑھی۔ جاپان میں اسلام کے داخلے کی تاریخ کا مختصر تذکرہ میں اپنے جاپان کے پہلے سفرنامے میں کر چکا ہوں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سب سے پہلے کسی جاپانی کے مسلمان ہونے کا واقعہ ۱۸۹۱ء میں پیش آیا تھا اس کے بعد متعدد جاپانی حضرات مسلمان ہوئے۔ اور ۱۹۲۱ء میں روسی ترکستان سے ہجرت کرنے والوں کی ایک بڑی جماعت جاپان میں آ کر آباد ہوئی جس کی وجہ سے مسلمانوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہوا۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۳ء میں مسلمانوں کی پہلی تنظیم ''جمعیت المسلمین جاپان'' کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۵۶ء سے تبلیغی جماعت کے حضرات کی یہاں آمد شروع ہوئی اور ان کی مخلصانہ جدوجہد سے اسلام کی نشر و اشاعت میں بہت اضافہ ہوا۔ ۱۹۶۱ء میں جاپان میں پڑھنے والے مسلم طلبہ نے جو عرب ممالک، پاکستان، انڈونیشیا اور ترکی وغیرہ سے تعلق رکھتے تھے یہاں مسلمان طلبہ کی ایک جمعیت قائم کی۔ شاہ فیصل مرحوم نے ایک وفد بھیجا جس نے ۱۹۷۴ء میں یہ اسلامک سینٹر ایک کرائے کی عمارت میں قائم کیا، پھر شاہ خالد مرحوم نے ایک زمین خرید کر اسلامک سینٹر کو دی، اور اس پر شہزادہ احمد بن عبدالعزیز نے چھ منزلہ عمارت تعمیر کرائی جس کا افتتاح ۱۹۸۲ء میں ہوا۔

ڈاکٹر صالح سامرائی جن کا تذکرہ میں اپنے پہلے سفرنامے میں کر چکا ہوں، اب بھی مرکز کے سربراہ ہیں۔ لیکن آج کل وہ زیادہ تر سفر پر رہتے ہیں اور مرکز کی دعوتی اور انتظامی سربراہی کے فرائض مولانا سلیم الرحمٰن صاحب ہی انجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے ہی آج کے اس اجتماع کا انتظام کیا تھا اور اس میں ٹوکیو، یوکوہاما اور مضافات سے دینی اور سماجی تنظیموں کے رہنماء حضرات بڑی محبت سے شریک ہوئے۔ ان میں ائمہ مساجد بھی تھے، طلبہ تنظیموں کے نمائندے بھی، بعض تعلیمی اداروں کے حضرات بھی اور تاجر برادری سے تعلق

رکھنے والے مسلمان بھی۔ مغرب تک ان حضرات سے ملاقات بھی رہی اور میں نے ان کی خدمت میں کچھ گزارشات بھی پیش کیں جن میں بچوں کی تعلیم کا مسئلہ سرفہرست تھا۔

مغرب کی نماز ٹوکیو مسجد میں پڑھنی تھی جو اسلامک سینٹر کے قریب ہی واقع ہے، یہ وہی ٹوکیو مسجد ہے جو ۱۹۳۸ء میں قائم ہوئی تھی، دوسری جنگ عظیم کے دوران آس پاس کی عمارتیں تباہ ہوئیں مگر یہ مسجد قائم رہی، لیکن پھر زلزلوں اور سیلاب کی وجہ سے اس کی عمارت بوسیدہ ہو کر منہدم ہو گئی تھی اور جب میں گیارہ سال پہلے ٹوکیو آیا تھا تو یہ جگہ خالی پڑی تھی اور مسلمان اس کی تعمیر نو کی فکر میں تھے۔ اب ماشاء اللہ یہ مسجد بہت عالیشان طریقے سے تعمیر اور آباد ہو چکی ہے اور ترکی حکومت کے زیر انتظام چل رہی ہے۔ ہم نے مغرب کی نماز وہیں ادا کی اور مغرب کے بعد مسجد ہی کے ایک زیریں ہال میں میری تقریر کا اعلان تھا۔ حاضرین میں چونکہ ملے جلے حضرات تھے۔ اس لئے انہوں نے تقاضا کیا کہ خطاب انگریزی میں ہو، تاکہ سب سمجھ سکیں۔ چنانچہ تقریبا ڈیڑھ گھنٹہ میری تقریر ہوئی۔ سامعین میں پاکستانی حضرات کے علاوہ سعودی عرب، مصر، ترکی، انڈونیشیا، سری لنکا اور ملائیشیا کے حضرات شامل تھے جو دور دراز سے یہاں جمع ہوئے تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد وہیں سب حضرات کے کھانے کا بھی انتظام تھا، کھانے کے دوران ان سب سے ملاقات اور گفتگو کا سلسلہ رہا، اور رات گئے قیام گاہ واپس پہنچ سکے۔

فیوجی کے کوہستان میں

اگلا دن ہمارے میزبانوں نے فیوجی ماؤنٹین کی سیر کا پروگرام رکھا تھا۔ یہ جاپان کا بلند ترین اور خوبصورت ترین پہاڑی مقام ہے جو اپنے حسین قدرتی مناظر کیلئے دنیا بھر میں مشہور ہے، بلکہ جاپان کی شناختی علامت (Symbol) کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور اکثر و بیشتر جاپان کی کوئی مختصر علامت دینی ہو تو اسی پہاڑ کی تصویر دی جاتی ہے۔ یہ بحر الکاہل کے ساحلی علاقے کے قریب بارہ ہزار تین سو اٹھاسی (۱۲۳۸۸) فٹ یعنی تین ہزار سات سو چھہتر (۳۷۷۶) میٹر بلند ہے۔ اس کی چوٹی سال کے بیشتر حصوں میں مخروطی شکل میں اس طرح

برف سے ڈھکی ہوئی نظر آتی ہے کہ نچلا حصہ سرسبز اور اوپر کا مخروطی حصہ برف کی وجہ سے سفید رہتا ہے اور اس کا یہی وہ منفرد منظر ہے جو اس کی پہچان ہے۔ پہاڑ کے دامن میں پانچ چھوٹی جھیلیں اس کے مختلف اطراف میں پھیلی ہوئی ہیں، جنہوں نے اس کے منظر کے حسن میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ جاپانی زبان میں پہاڑ کو ''یاما'' کہتے ہیں اس لئے یہاں اس کا نام ''فیوجی یاما'' ہے۔ قدیم جاپانی زبان (Ainu) میں فیوجی کا مطلب ہے ''جاودانی زندگی'' اور غالباً اس کی وجہ سے یہ ہے کہ جاپانی لوگ اسے ایک مقدس پہاڑ سمجھتے ہیں اور اس کی چوٹی پر ایک عبادت گاہ بھی بنی ہوئی ہے۔ جاپان کے مذہبی لوگ گرمیوں میں اس چوٹی تک پیدل چڑھ کر جاتے ہیں اور اسے ایک عبادت سمجھتے ہیں۔

اس پہاڑ کی سیر کیلئے ہمارے دوست آصف صاحب، طارق صاحب اور مولانا سلمان تھانوی بھی ہمارے رفیق سفر تھے۔ ہماری قیام گاہ سے اس کی مسافت کار سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوئی، راستہ بھی بڑا سرسبز و شاداب اور حسین مناظر سے بھرپور تھا۔ فیوجی کی وہ برف پوش مخروطی چوٹی دور سے نظر آنے لگی تھی، لیکن قریب پہنچنے کے بعد اس کی مختلف سمتوں میں اتنی سڑکیں پھیلی ہوئی تھیں کہ خود ہمارے میزبانوں کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ کس سڑک سے اس پہاڑی سلسلے میں داخل ہوں۔ معلوم ہوا کہ پہاڑ کے مختلف اطراف میں قابل دید مقامات (View Points) اتنے زیادہ ہیں کہ تمام مقامات کا احاطہ کئی دنوں میں بھی ممکن نہیں، اور ہر مقام تک جانے کیلئے الگ الگ سڑکیں بنی ہوئی ہیں۔ بہرحال! میزبانوں نے اس میں سے ایک سڑک کا انتخاب کیا جو پہاڑ کی چوٹی کے قریب تک گئی ہے اور راستے میں پانچ قابل دید مقامات سے گزرتی ہے۔ ان مقامات کو پہلی سیڑھی، دوسری سیڑھی، تیسری سیڑھی کے نام دیئے گئے ہیں اور ہر سیڑھی سے پہاڑ اور اس کی وادی کا ایک نیا منظر سامنے آتا ہے۔ یہاں تک کہ چھٹی سیڑھی پر پہنچ کر سڑک ختم ہو جاتی ہے اور پہاڑ کی چوٹی اتنی قریب آ جاتی ہے کہ لوگ با آسانی پیدل اُس تک پہنچ سکتے ہیں۔ یہاں سے ایک طرف تو اس چوٹی کا نظارہ بڑا دلفریب ہے اور دوسری طرف ایک گہری وادی ہے جو انواع و

اقسام کے درختوں اور سبزہ وگل سے بھری ہوئی ہے، اور وادی کے اُس پار ایک اور پہاڑی سلسلہ ہے جو دور تک برف سے ڈھکا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں درجۂ حرارت نقطۂ انجماد کے قریب تک پہنچا ہوا تھا اور پہاڑ سے ڈھلکتے ہوئے بادلوں کے ٹکڑے ہمیں چھو چھو کر گذر رہے تھے۔ کچھ دیر ہم ان حسین قدرتی مناظر کا لطف لیتے رہے، اور یہیں پر ہم نے اذان دے کر نمازِ ظہر ادا کی۔

میں نے دنیا کے بہت سے پہاڑی مقامات دیکھے ہیں، خود ہمارا ملک بہترین پہاڑی حسن سے مالا مال ہے، اس کے علاوہ انڈیا، سری لنکا، انڈونیشیا، سوئٹزرلینڈ، ناروے، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور نہ جانے اور کتنے ملکوں کے بہترین کوہستانی مقامات دیکھنے کا موقع ملا ہے، اور ہر ایک مقام کا اپنا ایک منفرد حسن ہے جس کی وجہ سے کسی کو کسی پر ترجیح دینا بھی مشکل ہے۔ لیکن ان میں سے ہر مقام کی اپنی انفرادیت کے ساتھ ساتھ ان میں ایک قدر مشترک (Common Feature) بھی ہے جو ہر جگہ محسوس کی جاسکتی ہے، لیکن اُسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ ان مقامات کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ ہے ان کے درمیان بڑے بڑے سمندر حائل ہیں، ان کی آب وہوا مختلف ہے، لوگوں کے رہن سہن کا انداز الگ ہے، مناظر کی ہیئت ترکیبی میں بھی فرق ہے، لیکن ان کی جو قدر مشترک ہر جگہ محسوس ہوتی ہے وہ پکار پکار کر کہہ رہی ہوتی ہے کہ یہ سارے مناظر ایک ہی دستِ قدرت کی صناعی ہیں، ان سب کا خالق ایک ہے، ان سب کے پیچھے ایک ہی ذات جلوہ افروز ہے۔

اس آئینہ خانے میں سبھی عکس ہیں تیرے
اس آئینہ خانے میں تو یکتا ہی رہے گا

واپسی میں اسی پہاڑ کی تیسری سیڑھی پر بھی ہم کچھ دیر ٹھہرے۔ طارق صاحب اپنے گھر سے لذیذ پاکستانی کھانا ساتھ لائے تھے انہوں نے قریب کے ایک ریسٹورنٹ سے گرم کروایا۔ اس برفانی فضاء میں جہاں حلال کھانا ایک نعمت نایاب تھی، اس لذیذ کھانے سے سب لطف اندوز ہوئے اور وہاں سے روانہ ہوگئے۔

اسی پہاڑی سلسلے کی ایک اور چوٹی ہاکونے (Hakone) کہلاتی ہے۔ جو یہاں سے تقریباً اسّی کلومیٹر کے فاصلے پر ہوگی۔ ہمارے میزبانوں کا خیال تھا کہ آج کی یہ سیر ہاکونے دیکھے بغیر نامکمل رہے گی۔ چنانچہ وہ اسی سمت روانہ ہوگئے، میں نے کرسی دراز کرکے اپنے قیلولے کا معمول کسی حد تک پورا کیا، اور آنکھ کھلی تو ہم ہاکونے کے قریب پہنچ چکے تھے، اور چاروں طرف حسین مناظر کی ایک دوسری دنیا آباد تھی، ہمارے بائیں جانب سربفلک اور انتہائی سرسبز پہاڑ تھا، دائیں طرف ایک شفاف جھیل تھی، جس میں بطخوں کی شکل کی بنی ہوئی سفید کشتیاں تیر رہی تھیں، اور ان کے پس منظر میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں۔

یہاں سے ایک چیئر لفٹ پہاڑ کی چوٹی تک جاتی ہے، ہم اس میں سوار ہوئے تو ہر تھوڑی دیر بعد پہاڑوں درختوں اور جھیل کے مختلف زاویے نئے نئے مناظر پیدا کرتے رہے، یہاں تک کہ لفٹ اپنی آخری بلندی تک پہنچ گئی۔ یہاں درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے بھی نیچے تھا، اور برفانی ہواؤں سے پورا ماحول ٹھٹھرا ہوا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کا یہ کرشمہ یہاں دیکھنے میں آتا ہے کہ اس برفانی ماحول میں پہاڑ کی چوٹی سے گرم بھاپ مسلسل اُڑ رہی ہے۔ دراصل یہ گندھک کا آتش فشاں پہاڑ ہے جو اب صدیوں سے لاوا اُبالنا چھوڑ چکا ہے۔ آخری بار اس پہاڑ سے ۱۷۰۷ء میں لاوا اُبلا تھا۔ اس کے بعد اس کا لاوا سُست پڑگیا ہے اور اب یہاں سے ہر وقت بھاپ اُڑتی رہتی ہے۔ تھوڑی سی بلندی پر گندھک کا ایک چشمہ ہے جس کا پانی اتنا گرم ہے کہ اس میں انڈا ڈالا جائے تو چند ہی سیکنڈ میں وہ نہ صرف اُبل جاتا ہے بلکہ اس کا چھلکا فوراً کوئلے کی طرح سیاہ ہوجاتا ہے، اس برفانی ماحول میں یہ اُبلے ہوئے انڈے بڑے لذیذ معلوم ہوتے ہیں اور یہاں کے لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ اس چشمے میں اُبلے ہوئے انڈے بہت مقوی ہوتے ہیں، بلکہ یہاں ایک لغو روایت یہ مشہور ہے جو شخص یہ انڈا کھالے اس کی عمر دس سال بڑھ جاتی ہے۔

عصر کی نماز ہم نے دوبارہ چیئر لفٹ سے نیچے آکر پڑھی اور اس کے بعد واپس قیام گاہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

جاپان کا مشہور پہاڑ فیوجی

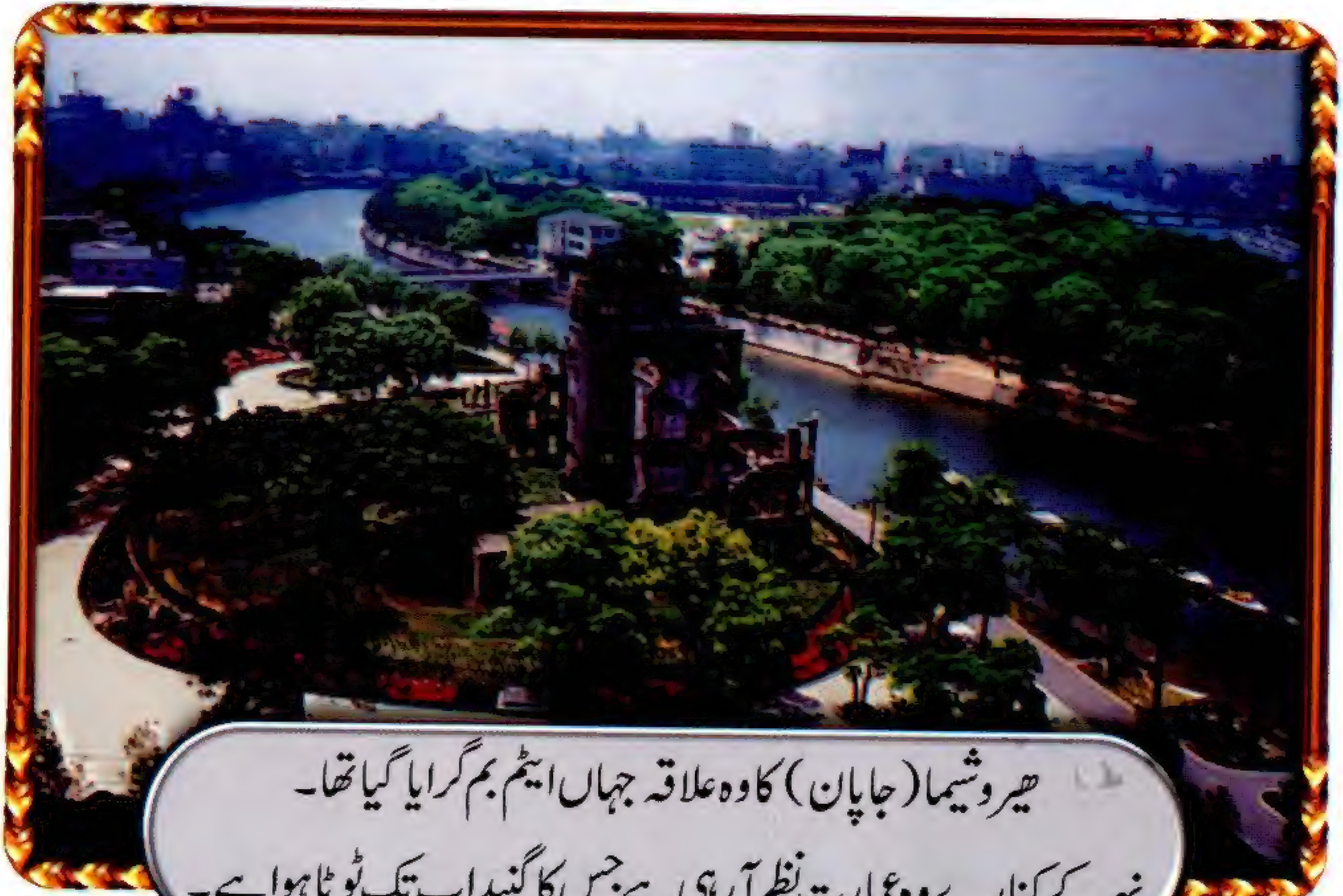

ھیروشیما (جاپان) کا وہ علاقہ جہاں ایٹم بم گرایا گیا تھا۔
نہر کے کنارے وہ عمارت نظر آرہی ہے جس کا گنبد اب تک ٹوٹا ہوا ہے۔

تویآما میں

اگلا دن منگل تھا اور اس روز ہمیں جاپان کے ایک اور شہر تویآما جانا تھا۔ آصف صاحب اور عتیق صاحب بھی ہم سفر تھے۔ چنانچہ ظہر سے پہلے Quintex کمپنی کے ساتھ ایک مختصر میٹنگ ہوئی، اور ظہر کے بعد ہم ٹوکیو کے ہنیدا ایئرپورٹ کیلئے روانہ ہوگئے۔ یہ ایئرپورٹ زیادہ تر اندرونی پروازوں کیلئے استعمال ہوتا ہے اور نریتا کے مقابلے میں شہر سے زیادہ قریب ہے۔ جاپان کی ایئرلائن میں آج کل ANA (All Nippon Airlines) بہت مقبول ہو رہی ہے۔ اسی کے طیارے میں ہم نے سفر کیا اور تقریباً ایک گھنٹے کی پرواز کے بعد ہم تویآما کے ہوائی اڈے پر اُترے۔

تویآما (Toyama) جاپان کا ایک زرعی اور صنعتی شہر ہے جو بہت سے سرسبز پہاڑوں کے دامن میں بحر جاپان کے کنارے آباد ہے۔ یاما جاپانی زبان میں پہاڑ کو کہتے ہیں۔ اس لئے ”تویاما“ کے لفظی معنی ہیں ”دس پہاڑ“ اور یہ ایک پریفکچر ہے جو ۱۶۴۲ مربع میل میں پھیلا ہوا ہے، اور پہاڑوں کے علاوہ اس میں دریاؤں اور جھیلوں کی بھی بہتات ہے۔ اس لئے یہاں چاول بڑی مقدار میں پیدا ہوتا ہے اور یہاں بجلی بھی قابل لحاظ مقدار میں بنانے کے مراکز موجود ہیں، اس کے علاوہ یہاں کپڑے اور کیمیکل کی بھی صنعتیں موجود ہیں اور اس کی بندرگاہ تجارتی اہمیت کی حامل ہے۔

ہمارے لحاظ سے اس شہر کی اہمیت یہ ہے کہ یہاں دو سو سے زیادہ مسلمان گھرانے آباد ہیں اور ان میں بھاری اکثریت پاکستانیوں کی ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہاں کے سارے مسلمان پاکستانی نژاد ہیں، اور غیر پاکستانی مسلمان اِکا دُکا ہیں اور ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ سب حضرات قریب قریب شاید دو تین کلومیٹر کے دائرے ہی میں آباد ہیں اور یہ تمام حضرات ایک ہی قسم کے کاروبار میں مصروف ہیں۔ یعنی جاپان سے گاڑیوں کی خریداری اور بیرونِ ملک انہیں برآمد کرنا۔ تویاما کی بندرگاہ جس سمندر کے کنارے واقع ہے، اُسی کے دوسرے کنارے پر روس کی ایک بندرگاہ موجود ہے اور دونوں

کے درمیان پانی کے جہاز ڈیڑھ دو دن میں آرام سے پہنچ جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ حضرات اپنی گاڑیاں زیادہ تر روس برآمد کرتے ہیں اور وہاں سے وہ یورپ کے دوسرے ملکوں تک بھی پہنچتی ہے۔

یہاں انہی حضرات نے ایک مسجد تعمیر کی ہے جو وسط شہر میں واقع ہے اور آج مغرب کے بعد یہاں خطاب کرنے کیلئے یہاں کے کچھ احباب نے مجھے دعوت دی تھی۔ جن میں امتیاز صاحب، حماد صاحب، رضوان صاحب اور ایاز صاحب کے نام بطورِ خاص قابل ذکر ہیں۔

میں نے اپنے خطاب میں اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ ماشاء اللہ یہاں گاڑیوں کی تجارت پر ہمارے پاکستانی بھائیوں کا کنٹرول ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہ سب خوشحال ہیں اور ان کی تجارت ترقی پذیر ہے اور یہ خوشحالی اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے جس پر جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے لیکن اس نعمت کا شکر یہ ہے کہ تجارتی مصروفیات اللہ تعالیٰ کے دین پر عمل کرنے میں رکاوٹ نہ بنیں۔ قرآنِ کریم نے ایسے تاجروں کی ان الفاظ میں تعریف فرمائی ہے کہ:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ

”وہ لوگ جن کو کوئی تجارت یا بیع اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی۔“ (سورۃ النور۔ ۳۷)

لیکن تجارت جوں جوں ترقی کرتی ہے، عام طور سے اس میں انسان کا انہماک بڑھتا جاتا ہے اور ان سرگرمیوں میں محو ہو کر بعض مرتبہ وہ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ روپیہ پیسہ دنیوی ترقی کا بھی اصل مقصد نہیں بلکہ اصل مقصد راحت و اطمینان ہے جو اس انہماک میں کہیں گم ہو کر رہ گیا ہے۔ لیکن اگر انسان اللہ تعالیٰ کی مقرر فرمائی ہوئی حدود میں رہے اور کاروبار کا یہ انہماک اُسے اپنے فرائض و واجبات سے غافل نہ کرے تو درحقیقت ایسا کاروبار ہی ہے جو انسان کو سکونِ قلب اور راحت و اطمینان کی دولت عطا کرتا ہے۔

دوسرے مقامات کی طرح میں نے یہاں بھی حاضرین کو اس طرف اہمیت کے ساتھ متوجہ کیا کہ وہ کچھ وقت اپنے اہل و عیال کے دینی مستقبل کو بہتر بنانے کیلئے نکالیں اور بچوں کی تعلیم و تربیت کو وہی اہمیت دیں جس کی وہ مستحق ہے اور اُن کیلئے مسلمان فضا میں تعلیم حاصل کرنے کا انتظام کریں۔

الحمدللہ! حاضرین نے توجہ کے ساتھ بندے کی گزارشات کو سنا اور بعض حضرات نے اس سمت میں عملی اقدامات کا عزم بھی ظاہر کیا، خدا کرے کہ یہ عزم آگے بڑھ کر عمل میں تبدیل ہو جائے۔ آمین

وہ رات ہم نے تویاما میں گذاری اور اگلی صبح یعنی بدھ کے روز جہاز ہی کے ذریعے واپس ٹوکیو اور وہاں سے آبینا پہنچ گئے جہاں اُس دن کوئی اور مصروفیت نہیں تھی۔

ہیروشیما میں

جمعرات کو ہمارے میزبان جناب آصف صاحب نے ہمیں جہاز کے ذریعے ہیروشیما لے جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ چنانچہ ہم صبح سات بجے ہنیدا ایئرپورٹ ہی سے دوبارہ جہاز میں سوار ہوئے اور تقریباً سوا گھنٹے کی پرواز کے بعد ہیروشیما کے ایئرپورٹ پر اُترے۔ یہ سارا خوبصورت پہاڑی علاقہ ہے اور ہوائی اڈہ شہر سے کافی دور واقع ہے، چنانچہ یہاں سے ہمیں ایک بس نے تقریباً آدھے گھنٹے میں وسط شہر تک پہنچایا۔ اب تو یہ بہت بارونق، ترقی یافتہ اور چہل پہل سے آباد شہر ہے۔ لیکن یہی وہ شہر ہے جو دنیا کی تاریخ میں پہلی بار امریکی ایٹم بم کا نشانہ بنا تھا۔ اس واقعے کو اب تریسٹھ سال گذر چکے ہیں، اور یہاں زندگی پوری طرح بحال ہو چکی ہے، لیکن اس المیے کی دو یادگاریں باقی رکھی گئی ہیں۔ ہم ان یادگاروں کو دیکھنے کیلئے ایک ٹیکسی میں سوار ہوئے تو ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا کہ جو لوگ اس وقت ایٹمی تابکاری سے متاثر ہونے کے باوجود زندہ رہ گئے تھے، اُن کی اولادوں میں ابھی تک کوئی نہ کوئی خلقی نقص موجود ہوتا ہے۔ یہ بات ہم نے دور دور سے تو سنی تھی۔ لیکن اس ڈرائیور نے جو اچھا خاصا تعلیم یافتہ تھا، اس بات کی تصدیق کی۔ اس کے بعد اس نے ہمیں ایک تباہ شدہ

عمارت کے سامنے لا کھڑا کیا جو ایک نہر کے کنارے واقع تھی۔ یہ عمارت شہر کی ایک اہم عمارت تھی جسے انڈسٹریل پروموشن ہال کہا جاتا ہے۔ ایٹم بم اس عمارت سے ستر گز کے فاصلے پر نہر کے پل کے اوپر پھٹا تھا اور یہاں سے ڈھائی کلومیٹر دور تک تمام عمارتیں راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئی تھیں، اور ان میں سے کوئی عمارت کھڑی نہیں رہ سکی تھی، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بم پھٹنے کی جگہ کے بالکل نیچے یہ عمارت کلی طور پر تباہ نہیں ہوئی، بلکہ اس کے کچھ کھنڈر باقی رہ گئے۔ اس عمارت کے اوپر ایک گنبد تھا، اس کی چھت اور دیواریں تو تباہ ہوگئیں لیکن سریوں کا جال اپنی جگہ باقی رہا اور آج تک باقی ہے۔ عمارت کی دیواریں بھی ٹوٹ پھوٹ گئیں، لیکن بالکلیہ تباہ نہیں ہوئیں۔ حکومت نے اس عمارت کو اُسی حالت میں برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا، اور یہ ایٹم بم کی تباہ کاری کی ایک علامت کے طور پر آج بھی باقی ہے۔ اور اس میں لگی ہوئی گھڑی بھی محفوظ رہی جو سوا آٹھ بجے کے وقت پر بند ہوگئی تھی، کیونکہ بم ٹھیک سوا آٹھ بجے صبح گرایا گیا تھا اس کے اردگرد ایک پارک بنادیا گیا ہے اور پارک کے داخلے کی جگہ پر دو پتھر نصب ہیں جن پر لکھا ہے کہ ۶ اگست ۱۹۴۵ء کو دنیا میں پہلی بار اس عمارت کے سامنے نہر کے پل کے اوپر ایٹم بم پھینکا گیا جو زمین سے تین سو میٹر کی بلندی پر پھٹا اور اس کے نتیجے میں دو لاکھ انسان ہلاک ہوئے۔ یہ عمارت وہ تنہا عمارت ہے جس کے کھنڈر باقی رہ گئے تھے، اور اُسے اس لئے باقی رکھا گیا ہے تاکہ آنے والی نسلیں ایٹم بم کی تباہ کاری کا ایک نمونہ دیکھ کر آئندہ ایٹم بم کے استعمال کی روک تھام کریں۔

اس عمارت اور اس کے متصل پارک کے سامنے وہ چھوٹی سی نہر ہے جس پر ایٹم بم پھینکا گیا تھا اور اُسی کے عقب میں ایک میوزیم بنایا گیا ہے جو ایٹم بم گرنے کے اس المیے کی بہت سی یادگاروں پر مشتمل ہے اور اس کا نام جنگ کی یادگار کے میوزیم کے بجائے ''ہیروشیما کا یادگار امن میوزیم'' (Hiroshima Peace Memorial Museum) رکھا گیا ہے اور یہ نام رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ان تباہ کاریوں کو دیکھ کر لوگ دنیا میں امن وقائم کرنے کا جذبہ پیدا کریں۔

اس میوزیم میں ایک بہت بڑا ماڈل بم گرنے سے پہلے شہر کی حالت کو ظاہر کرتا ہے، یعنی اسے دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بم گرنے سے پہلے شہر کیسا تھا؟ اس میں وہ ایک ہرا ابھرا اور خاصی گنجان آبادی کا شہر نظر آتا ہے جس میں دور تک عمارتیں پھیلی پڑی ہیں۔ پھر اسی کے ساتھ ایک دوسرا ماڈل ہے جو بم گرنے کے بعد شہر کی تصویر پیش کرتا ہے۔ اس دوسرے ماڈل میں عمارت کے اس کھنڈر کے سوا کوئی عمارت نظر نہیں آتی، اور پورا علاقہ سپاٹ نظر آتا ہے، جس میں تباہ شدہ عمارتوں کی راکھ بھی زمین میں پیوست ہوگئی ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ڈھائی کلومیٹر کے رقبے میں تو کوئی فرد زندہ نہیں بچا جو اُس علاقے کی تصویر لے سکتا، یا اُس کا آنکھوں دیکھا حال بتاتا۔ لیکن جو لوگ کئی کلومیٹر دور تھے اُن میں سے جس کو کچھ ہوش رہا، اُس نے شہر پر چھائے ہوئے دھوئیں کے بادلوں کی تصویریں لی ہیں جو اس میوزیم میں دکھائی گئی ہیں۔ وہ جہاز بی ۲۹ (B-29) جس نے یہ بم گرایا تھا اُس کی تصویریں بھی موجود ہیں، نیز دور رہنے والے جو لوگ زندہ رہنے کے باوجود تابکاری اثرات کا شکار ہوئے اُن کو دکھایا گیا ہے کہ کس طرح اُن کے جسم کا گوشت بہہ بہہ کر نیچے گرا ہے۔ غرض پورا میوزیم اس تباہ کاری کے عبرتناک نمونوں پر مشتمل ہے۔

ایٹم بم کے گرنے سے جو تباہی پھیلی ہے، اُس کی تفصیلات ایک کتاب میں محفوظ کی گئی ہیں جو ۱۹۷۱ء میں ہیروشیما سٹی ہال کی طرف سے پانچ جلدوں اور چار ہزار صفحات میں شائع کی گئی تھی اور اس کا جاپانی نام ہے ”Hiroshima Genbaku Sensai Shi“ یعنی ”ہیروشیما کی ایٹمی جنگ کی تباہی کا ریکارڈ۔“ یہاں میوزیم میں اس ریکارڈ کے خاص خاص اقتباسات پر مشتمل ایک کتابچہ فروخت ہو رہا تھا جو ہم نے بھی لیا۔

ایٹم بم کا یہ المیہ دوسری جنگ عظیم میں پیش آیا، اور ہیروشیما پر امریکہ نے ایٹم بم کیوں گرایا؟ اس سوال کا جواب اُس مختصر تعارفی کتابچے میں دیا گیا ہے جو ہیروشیما یادگار امن میوزیم میں ہر آنے والے کیلئے رکھا ہوا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ ۱۹۴۵ء میں جنگ کے دوران جاپان کی طاقت بہت کمزور ہو چکی تھی، اور امریکہ چاہتا تھا کہ یہ لمبی جنگ اب کسی

طرح اختتام تک پہنچے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے اُس کے پاس کئی راستے تھے۔ ایک راستہ یہ تھا کہ وہ خود جاپان کے اندر اپنی فوجیں بھیج کر ایک فیصلہ کن حملہ کرے اور اس کام کیلئے اپنے اتحادی روس سے مدد حاصل کرے ، اور بالآخر جاپانی حکومت کو یہ یقین دہانی کرادے کہ اگر وہ ہتھیار ڈال دے تو اُن کا شہنشاہی نظام باقی رکھا جائیگا اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ جاپان پر ایٹمی حملہ کر کے ایسی تباہی پھیلائے کہ جاپان ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائے۔ امریکہ نے ان دو راستوں میں سے ایٹم بم گرانے کا راستہ اس لئے اختیار کیا کہ اگر پہلی صورت اختیار کی جاتی تو اُسے اندیشہ تھا کہ فتح کے بعد جاپان میں روس کا اثر ونفوذ بہت بڑھ جائے گا جسے روکنے کا اس کے پاس کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ اس لئے اُس نے وہ راستہ اختیار کیا جو سیاسی اعتبار سے اُس کیلئے زیادہ محفوظ تھا۔ اس کتابچے کے مطابق ایٹم بم کا نشانہ بنانے کیلئے ہیروشیما کے شہری علاقے کا انتخاب اس لیے کیا گیا کہ اس شہری علاقے میں اتحادی فوجوں کا کوئی قیدی موجود نہیں تھا جسے ایٹم بم سے نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو۔

بہر کیف! ہوا یہ کہ ۵ اگست ۱۹۴۵ء کی رات کو ہیروشیما پر رات بھر وقفے وقفے سے عام قسم کی بمباری ہوتی رہی، جس کی بنا پر لوگ سو نہیں سکے۔ یہاں تک کہ صبح ہوئی تو آسمان کے صاف ہونے کا اعلان ہوا، اور لوگ اپنے اپنے کام پر جانے لگے، لیکن سوا آٹھ بجے کے قریب ریڈیو سے اعلان ہوا کہ تین دشمن طیارے سائجو تک پہنچ چکے ہیں۔ ابھی یہ اعلان مکمل نہیں ہوا تھا کہ تمام لوگ بیک وقت خوفناک دھماکے، زلزلے، تیز روشنی جھلسا دینے والی گرمی، غرض ایٹم بم کی تمام تباہ کاریوں کا شکار ہوگئے۔

یہ بم ایک امریکی جنگی جہاز بی۔۲۹ نے گرایا تھا جس کا نام Enola Gay تھا۔ اس بم کی لمبائی ایک سو بیس انچ، قطر ۱۲۸ انچ، اور وزن نو ہزار پونڈ تھا۔ یہ گرنے کے ۴۳ سیکنڈ بعد پھٹا اور اس سے پانچ کروڑ سینٹی گریڈ گرمی خارج ہوئی، گرتے ہی ایک سیکنڈ کے دس ہزارویں حصے میں ایک سو اسّی فیٹ قطر کا ایک آگ کا گولہ پیدا ہوا جس کا اندرونی درجۂ حرارت تین لاکھ سینٹی گریڈ تھا۔ اسی کے ساتھ پورے شہر پر ۸ء۲ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے

زلزلے کی شدید لہر آئی جس میں بیس ہزار ٹن کے برابر تباہ کن طاقت تھی۔

اس دھماکے کے نتیجے میں ڈھائی کلومیٹر کے علاقے کی تمام عمارتیں تو راکھ بن گئیں، ہر جگہ آگ بھڑک اُٹھی، کھڑکیوں کے شیشے دو میل دور تک بکھر گئے، زلزلے کے جھٹکے سینتیس (۳۷) میل تک محسوس کیئے گئے۔ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی کم از کم آٹھ میل تک نظر آئی۔ پورے شہر پر دھویں کا بادل ایک چھتری کی شکل میں چھا گیا۔ وقفے وقفے سے زمین سے آگ کے ستون فضاء میں بلند ہوتے رہے۔ لوگوں نے پناہ لینے کیلئے شہر کے وسط سے گذرتے ہوئے دریا میں چھلانگیں لگائیں، لیکن دریا میں گرداب پیدا ہو چکا تھا، اس لئے وہ سب وہیں ڈوب کر مر گئے اور بعد میں دریا میں اتنی لاشیں نظر آئیں کہ ہر طرف سطح سے پانی بمشکل نظر آتا تھا۔ سڑکوں پر لاشیں بکھری پڑی تھیں، بعض حاملہ عورتوں کی لاشیں اس طرح پائی گئیں کہ ان کا پیٹ پھٹا ہوا تھا اور وہ بچہ ان کے برابر پڑا ہوا تھا جو پیدا ہونے سے پہلے ہی رخصت ہو چکا تھا۔

بم گرنے کے پندرہ منٹ بعد ایک عجیب قسم کی سیاہ بارش برسنی شروع ہوئی جس میں کالے کالے اولے تھے، یہ بارش میلوں تک سوا چار گھنٹے برستی رہی، اور جن کے سروں پر یہ بارش زیادہ مقدار میں پڑی اُن کے سروں کے بال اُڑ گئے اور جن لوگوں کے پیٹ میں اس کا پانی چلا گیا، وہ چھ مہینے تک پیٹ کی بیماریوں میں مبتلا رہے۔ گیارہ بجے دوپہر سے دو بجے سہ پہر تک شہر میں ہوا کے بگولے رقص کرتے رہے جن سے آس پاس کی آبادیوں کی چھتیں اُڑ گئیں۔ ایک انچ موٹی پلیٹیں بھی ان بگولوں کی زد میں آ کر اُڑتی نظر آئیں اور بعض انسان بھی ہوا میں اُڑ کر ایک دریا کے پل سے جا ٹکرائے۔ دریاؤں میں پیدا ہونے والے بگولوں نے پانی کو آٹھ آٹھ فٹ اوپر اُٹھا دیا۔

بم گرنے کی جگہ سے کم از کم ڈھائی کلومیٹر دور جو لوگ زندہ بچ رہے تھے، وہ بھی یا تو مذکورہ بالا تباہ کاریوں کے نتیجے میں زخمی ہوئے یا تابکاری کے اثرات سے اُن کے جسم جھلس گئے، جن تک تابکاری اثرات زیادہ شدت کے ساتھ پہنچے، اُن کے جسم کا گوشت بہنے لگا۔

بہت سے شدید بخار، دستوں اور اُلٹیوں میں مبتلا ہوئے جو بکثرت جان لیوا ثابت ہوئیں۔ چونکہ بیشتر ہسپتال تباہ اور ان کے ڈاکٹر ہلاک ہو چکے تھے، اس لئے ان زخمیوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ہنگامی طور پر جو امدادی مراکز قائم کیے گئے وہ سراسر نا کافی تھے۔

ہیروشیما پر ایٹمی حملے کے تین دن بعد امریکہ نے دوسرا ایٹم بم ناگاساکی پر گرایا۔ یہ چونکہ نسبتاً چھوٹا علاقہ تھا، اس لئے اس میں ہیروشیما کے مقابلے میں تباہی کم ہوئی، ہلاک ہونے والوں کی تعداد اُنتالیس ہزار اور زخمیوں کی تعداد پچیس ہزار تھی اور شہر کا چالیس فیصد حصہ تباہ ہوا تھا۔

جس کتابچے کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اُس میں زندگی کے مختلف شعبوں پر ٹوٹنے والی قیامت کی تفصیل بتائی گئی ہے اور تباہی کا نشانہ بننے والوں کے جو لرزہ خیز حالات بیان کیے گئے ہیں ان کا یہ مختصر سفرنامہ متحمل نہیں ہوسکتا۔

جس میوزیم میں ہم تھے اُس میں ایٹم بم کی تباہ کاریوں کے مختلف مناظر دکھانے کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ ان مناظر اور حالات کو دکھانے کا مقصد یہ ہے کہ آنے والی نسلیں ہیروشیما سے سبق حاصل کر کے اس بات کی کوشش کریں کہ ہیروشیما کا المیہ دنیا کی کسی اور جگہ رونما نہ ہو اور پوری انسانیت مل کر دنیا کو ایٹمی حملوں کا نشانہ بننے سے روکنے کیلئے کام کرے۔

ایٹم بم کی تباہ کاری کا تھوڑا بہت اندازہ تو پہلے بھی تھا لیکن اس میوزیم کی فراہم کردہ معلومات سے تباہ کاری کا حجم اندازے سے کہیں زیادہ ثابت ہوا اور واقعہ یہ ہے کہ انسانوں کے کسی بھی گروہ کو اس بربریت کا نشانہ بنانا، عقل و خرد اور دین و اخلاق کے کسی بھی پیمانے سے قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ انسانیت کا تقاضہ یہ تھا کہ ہیروشیما کے واقعے سے سبق لے کر خود وہ قوم ایٹمی ہتھیاروں کو ختم کرنے کی پہل کرتی جس نے لاکھوں بوڑھوں اور عورتوں، بچوں اور شہریوں کو ایسے مظالم کا نشانہ بنایا جن کی نظیر پوری تاریخ انسانیت میں موجود نہیں ہے۔ لیکن مقامِ حیرت ہے کہ انسانیت کے ساتھ اتنے بڑے ظلم کے بعد بھی اُس قوم کو نہ صرف یہ کہ ندامت کا ذرا احساس نہیں ہوا بلکہ وہ اپنے اس اقدام کو انسانیت پر ایک احسان

قرار دیتی رہی۔ میرے پاس انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا جو قدیم ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۵۰ء) تھا، اُس میں ایٹم بم کا تعارف کراتے ہوئے اس کی تباہ کاری کا حال تو بعد میں بیان کیا گیا تھا لیکن مقالے کا آغاز چرچل کے اس جملے سے کیا گیا تھا کہ پہلا ایٹم بم جو ہیروشیما پر گرایا گیا اس کے بارے میں اندازہ یہ ہے کہ اس نے دس لاکھ امریکیوں کی جان بچائی۔ کیونکہ اگر ایٹم بم نہ گرتا تو جنگ جاری رہتی اور اس میں دس لاکھ امریکی مرجاتے۔ اندازہ لگائیے کہ اپنی ہلاکت خیز کارروائیوں کی تاویل کرنے کیلئے یہ لوگ کس حد تک جاسکتے ہیں!

اب عرصۂ دراز سے امریکی اور دوسرے مغربی طاقتوں نے ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کے زبانی دعوے تو بہت کئے ہیں اور انہی دعوؤں کے تحت کمزور اقوام کو مختلف معاہدات کے ذریعے ایٹمی ہتھیار نہ بنانے کا پابند بھی کیا جارہا ہے لیکن اس اندھیر گردی کا آخر کیا جواب ہے کہ ہمیں ایٹمی ہتھیار نہ صرف بنانے کا بلکہ اسے استعمال کرنے کا بھی پورا حق حاصل ہے اور دوسری قومیں اپنے دفاع کیلئے ایٹمی قوت حاصل کرنا چاہیں تو وہ دہشت گرد اور غنڈے (Rogue) قرار دیئے جاتے ہیں۔

دنیا کو یقیناً ایٹم بم کی تباہ کاریوں سے بچانے کی ضرورت ہے، لیکن اس کا پہلا قدم یہ ہے کہ وہ بڑی طاقتیں جن کے پاس یہ تباہ کن ہتھیار موجود ہے، اپنے ہتھیاروں کو خود علانیہ ختم کریں۔ اس کے بعد یہ معاہدات یقیناً مبنی براخلاص اور مؤثر سمجھے جائیں گے، لیکن جب تک یہ نہیں ہوتا، ان معاہدات کے ذریعے ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنا ممکن نہیں ہے۔ اگر دنیا میں کسی ایک ملک کے پاس بھی ایٹم بم موجود ہے تو اس کے حریف کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بچاؤ کیلئے خود بھی ایٹمی قوت بنے۔ اگر جاپان کے پاس بھی ایٹم بم ہوتا تو امریکہ کی مجال نہ ہوتی کہ وہ اس پر ایٹم بم برساتا۔ لہذا اگر دنیا کو ایٹمی تباہی سے واقعی بچانا ہے تو امریکہ اور دوسری بڑی طاقتوں سمیت تمام ممالک کو اپنے ایٹمی ہتھیار خود ختم کرنے ہوں گے، ورنہ یہ مصنوعی انتظام کہ بڑی طاقتیں اپنی ایٹمی قوت کو بڑھاتی چلی جائیں اور دوسروں کو اس سے روکنے کی کوشش کریں، اس تباہ کن دوڑ کو ہرگز روک نہیں

سکے گا۔

کوبے کا سفر

بہر کیف! ہیروشیما کی اس عبرت گاہ سے ہم سیدھے ریلوے اسٹیشن پہنچے اور وہاں سے جاپان کی مشہور بلٹ ٹرین میں سوار ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کی سب سے زیادہ تیز رفتار ٹرین ہے۔ یورپ کی وہ یورو اسٹار جس میں میں نے کئی بار لندن اور پیرس کے درمیان سفر کیا ہے، رود بار انگلستان (English Channel) کو ایک زیر سمندر سرنگ کے ذریعے صرف بیس منٹ میں عبور کر لیتی ہے۔ جاپان کی یہ بلٹ ٹرین اُس کے ہم پلہ تو ضرور ہے اور کچھ بعید نہیں کہ اس سے کچھ زیادہ تیز رفتار ہو۔ اس ٹرین نے ہمیں تقریباً ایک گھنٹے میں جاپان کے ایک اور مشہور شہر کوبے میں پہنچا دیا۔

کوبے کے ریلوے اسٹیشن پر جناب حسن ضیاء صاحب ہمارے استقبال کیلئے موجود تھے۔ مسلمانوں کیلئے کوبے کی یہ اہمیت ہے کہ جاپان میں سب سے پہلی مسجد یہیں تعمیر کی گئی تھی۔ پہلے پروگرام یہ تھا کہ ہم جمعہ کے دن یہاں پہنچیں گے اور جمعہ میں مجھے یہاں خطاب کرنا ہوگا، لیکن بعد میں میرے سفر کے پروگرام میں تبدیلی آئی اور جمعہ مجھے آبینا ہی میں گزارنا پڑا۔ اس لئے ہمارے میزبانوں نے یہ طے کیا کہ کم از کم کوبے کی اس تاریخی مسجد کی زیارت ضرور ہو جائے۔ چنانچہ ریلوے اسٹیشن سے ہم اسی مسجد میں پہنچے جو وسط شہر میں واقع ہے اور ظہر کی نماز اسی مسجد میں ادا کی۔ تصویر سرورق پر ملاحظہ فرمائیں۔

جاپان میں یہ پہلی مسجد ۱۹۳۵ء میں بعض اُن مسلمانوں نے تعمیر کی تھی جو مختلف ملکوں سے آ کر یہاں آباد ہو گئے تھے۔ ان میں ہندوستان کے مسلمانوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی اور انہیں میں سے ایک مخیّر تاجر حاجی فیروز الدین صاحب نے مسجد کے تعمیری اخراجات کا تقریباً دو تہائی حصہ خود ادا کیا اور باقی دوسرے مسلمانوں کے چندے سے حاصل ہوا اور اس طرح یہ نہایت خوبصورت اور عالیشان مسجد تکمیل کو پہنچی۔

اس وقت مسجد کے امام وخطیب جامعہ ازہر کے ایک عالم شیخ محسن شاکر بیومی ہیں۔

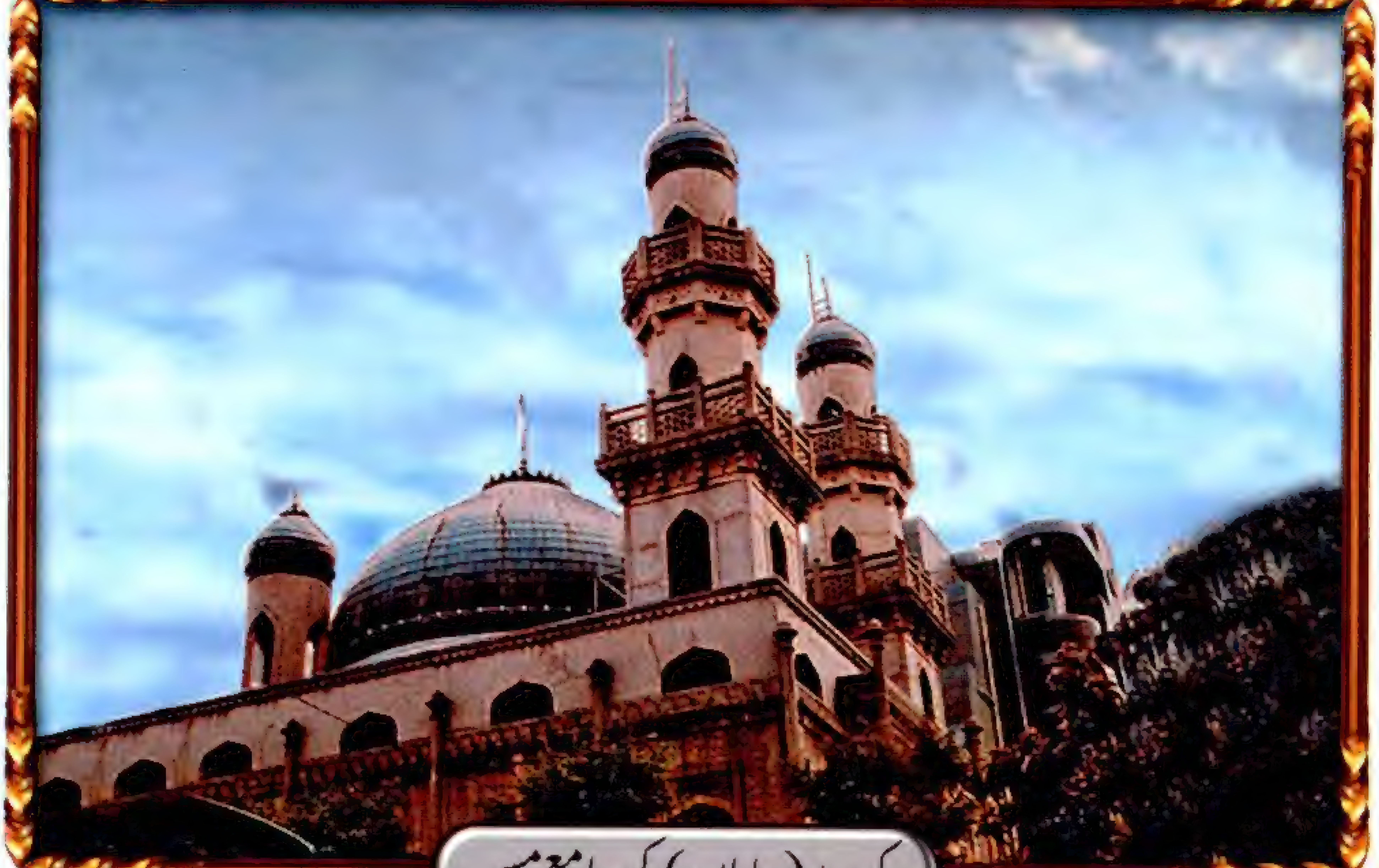

کوبے (جاپان) کی جامع مسجد

یوکوہاما جاپان کا ایک منظر

انہوں نے بڑی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا، شاید میری عربی تصانیف کی وجہ سے وہ مجھ سے پہلے سے واقف تھے، اور انہوں نے بڑی محبت سے مسجد کا معائنہ کرایا اور بتایا کہ یہ مسجد ۱۹۳۵ء سے آج تک اُسی طرح کھڑی ہے جس طرح پہلے دن تعمیر ہوئی تھی، اس کی عمارت، یہاں تک کہ دروازوں میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی، اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا عجوبہ ہے کہ اس عرصے میں دو مرتبہ آس پاس کا پورا شہر اُجڑ چکا ہے۔ ایک دوسری جنگ عظیم کی بمباری میں اور دوسرے ایک شدید زلزلے میں۔ ان دونوں مواقع پر آس پاس کی ساری عمارتیں تباہ ہو گئیں۔ لیکن تنہا یہ مسجد اپنی جگہ کھڑی رہی۔ مسجد کے داخلے کی جگہ پر ایک پرانی تصویر فریم میں لگی ہوئی ہے جس میں یہ منظر صاف نظر آتا ہے کہ خطے کی تمام عمارتیں ختم ہو کر ایک میدان میں تبدیل ہو چکی ہیں، لیکن اس میدان کے درمیان یہ مسجد جوں کی توں کھڑی نظر آ رہی ہے۔ اس مسجد کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے بنانے والوں نے شہر کی کچھ اور عمارتیں خرید کر مسجد پر وقف کر دی ہیں اور ان کی آمدنی سے مسجد کے تمام مصارف پورے ہو جاتے ہیں اور اس کیلئے کسی چندے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بلکہ مسجد کے نام پر کوئی چندہ کرنا ممنوع ہے۔ صرف ایک ڈبہ مسجد میں رکھا ہے کہ اگر کوئی شخص مسجد کی خدمت کی سعادت حاصل کرنا چاہے تو وہ حسب توفیق کچھ رقم اس میں ڈال دے۔ نیز مسجد کے بالکل متصل ایک اسلامک سینٹر قائم کیا گیا ہے جو دعوت اور تعلیم کے فرائض انجام دے رہا ہے۔

مسجد کے بالکل قریب ایک پاکستانی مسلمان کا حلال ریسٹورنٹ ہے انہوں نے بڑی محبت سے ہمیں دعوت دی کہ دوپہر کا کھانا ان کے ریسٹورنٹ میں کھائیں۔ اس پردیس میں خالص پاکستانی اور حلال کھانا اللہ تعالیٰ کی نعمت تھا۔ ہم سب اس سے لطف اندوز ہوئے۔

یوکوہاما میں

عصر کی نماز کوبے کی مسجد میں پڑھنے کے بعد ہم دوبارہ بلٹ ٹرین میں سوار ہوئے کوبے سے متصل ہی جاپان کا دوسرا بڑا شہر اوساکا واقع ہے۔ ٹرین نے سفر کے دوران اس شہر کی بھی ایک جھلک دکھا دی اور پھر تقریباً چھ سو کلومیٹر کا سفر ڈھائی گھنٹے میں پورا کر کے یوکوہاما کے

اسٹیشن پر اُتار دیا جو ٹوکیو کے متصل مشہور تجارتی اور صنعتی شہر ہے جس میں ایک بڑی بندرگاہ بھی واقع ہے۔

کچھ عرصہ پہلے تک اس شہر میں کوئی باقاعدہ مسجد نہیں تھی، البتہ دو عارضی مصلے بنے ہوئے تھے، اب کچھ عرصہ قبل یہاں ایک شاندار مسجد تعمیر ہوئی ہے، اس کے منتظمین بار بار مجھ سے یہ کہہ چکے تھے کہ چند سال پہلے جب آپ کے بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم جاپان تشریف لائے تھے تو اس وقت یہاں کوئی مسجد نہیں تھی، مگر انہوں نے عارضی مصلے پر دعا کرائی تھی کہ اللہ تعالیٰ یہاں مسجد بنانے کے اسباب پیدا فرمادیں۔ الحمدللہ یہ دعا قبول ہوئی اور اب یہاں مکمل مسجد بن چکی ہے۔ اس لئے آپ کوئی وقت اس کیلئے ضرور نکالیں اور وہاں آپ کا خطاب ہو، بہت غور کے بعد جو صورت ممکن نظر آئی وہ یہی تھی کہ کوبے سے واپسی پر ہم عشاء کی نماز اس مسجد میں پڑھیں اور عشاء کے بعد خطاب ہو۔ چنانچہ ریلوے اسٹیشن پر اس مسجد کے منتظمین میں سے جناب سمیع صاحب وغیرہ استقبال کیلئے موجود تھے۔ عشاء کی نماز ہم نے مسجد میں پڑھی۔ دن بھر کے طویل سفر کی وجہ سے جسم تھکن سے چور تھا، لیکن ان حضرات کے خلوص کی برکت سے عشاء کے بعد تقریبا ایک گھنٹہ خطاب ہوا جس میں میں نے اُس حدیث مبارک کی تشریح پیش کی جس میں حضور سرورِ دو عالم ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ:

> ”جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے تمام اعمال ختم ہوجاتے ہیں، البتہ تین چیزیں ایسی ہیں جو اس کے نامہ اعمال میں مسلسل اضافے کا سبب بنتی ہیں، ایک یہ کہ وہ کوئی صدقہ جاریہ چھوڑ جائے، دوسرے یہ کہ وہ کوئی علم کی بات چھوڑ جائے جس سے لوگ اس کے بعد بھی فائدہ اُٹھائیں اور تیسرے یہ کہ وہ ایسی نیک اولاد چھوڑ کر جائے جو اس کیلئے دعا کرتی رہے۔“

میں نے عرض کیا کہ اس مسجد کی تعمیر سے اللہ تعالیٰ نے آپ حضرات کو ایک صدقہ جاریہ

قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ علم اور اولاد صالح کی خاطر آپ حضرات اپنے بچوں کیلئے ایسی تعلیم گاہ قائم کریں جو اسلامی ماحول میں نئی نسل کی مناسب تعلیم و تربیت کا انتظام کر سکے۔ ہمارے آباؤ اجداد ہمارے لئے ایمان کی دولت چھوڑ کر گئے تھے، اب ہمارا فریضہ ہے کہ اپنی اولاد کو بھی اسی دولت سے مالا مال کرنے کے وسائل مہیا کریں۔

اس خطاب کے بعد رات گئے یہاں سے واپسی ہوئی اور دن بھر کے طویل سفر کے بعد یہاں سے ایبنا کی قیام گاہ تک پہنچنے میں تقریباً سوا گھنٹہ مزید لگا۔

اگلا دن جمعہ تھا اور جاپان میں قیام کا آخری دن۔ پچھلے دو دنوں میں مسلسل سفر اور مصروفیت سے طبیعت تھکی ہوئی تھی۔ اُس دن جمعہ کے خطاب کے سوا کوئی اور پروگرام نہیں تھا، اس لئے باقی وقت قیام گاہ ہی پر آرام اور اپنے ترجمہ قرآن کریم کے کام میں گذارا اور بفضلہٖ تعالیٰ سورۂ حشر کے ترجمے اور تشریحی حواشی کی تکمیل ہوئی۔

ہمارے میزبان حامد عزیز صاحب نے مغرب کے بعد اپنے گھر پر کھانے کیلئے مدعو کیا تھا وہ تقریباً بیس سال سے جاپان میں ہیں، ان کی اہلیہ بھی جاپانی نومسلم ہیں اور انہوں نے اس دعوت میں خالص جاپانی طرز کے کھانوں کا انتظام کیا تھا اور نشست بھی جاپانی انداز کی۔ انہوں نے بتایا کہ جاپانی لوگ بہت سادہ زندگی کے عادی ہیں وہ فرش پر سوتے اور فرش ہی پر کھاتے ہیں۔ البتہ فرشی نشست کے ساتھ عام طور سے ایک چوکی ہوتی ہے جس پر کھانا چنا جاتا ہے اور چوکی کے نیچے ایک مربع گڑھا ہوتا ہے جس میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ سردیوں کے دنوں میں گڑھا گرم ہوتا ہے، اور اس سے پاؤں کو گرم رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ جاپانی حضرات اپنا کام خود کرنے کے عادی ہوتے ہیں اور متمول لوگ بھی گھروں میں نوکر رکھنے کی استطاعت کے باوجود نوکر نہیں رکھتے بلکہ گھر کی صفائی سے لے کر کھانا پکانے تک کے تمام کام خواتین خود انجام دیتی ہیں، بچے والی خواتین بچوں کو اپنی کمر سے باندھ کر کام میں مصروف رہتی ہیں۔

۱۹۴۵ء میں مکمل تباہی کے بعد جاپان نے جس حیرت انگیز رفتار سے ترقی کی ہے اور ملکی صنعت سے لے کر نظامِ تمدن کو جس عروج تک پہنچایا ہے، اس کے اسباب میں ان کا سادہ طرزِ زندگی، محنت، جفاکشی، وقت کی قدر، ٹیپ ٹاپ میں وقت اور پیسے کے ضیاع سے احتراز اور قومی غیرت وحمیت کے اوصاف واضح نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنا پورا نظامِ زندگی اپنے قومی تقاضوں کے مطابق ترتیب دیا ہے، اُن کی زبان دنیا کی مشکل زبانوں میں سے ایک ہے، خاص طور پر ان کا رسم الخط انتہائی پیچیدہ ہے۔ ایک ہی زبان کیلئے تین رسم الخط رائج ہیں۔ ان میں قدیم ترین رسم الخط کھانجی کہلاتا ہے۔ اس میں حروف تہجی نہیں ہوتے، بلکہ ہر لفظ کی ایک الگ شکل ہوتی ہے اور اس طرح اس زبان پر عبور حاصل کرنے کیلئے ہزارہا الفاظ کے الگ الگ نقوش سیکھنے پڑتے ہیں، دو رسم الخط بعد میں پیدا ہوئے ہیں جن میں سے ایک کو کھاتے گانا اور دوسرے کو ہرگانا کہا جاتا ہے۔ ان دونوں میں حروفِ تہجی ہوتے ہیں مگر ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جاپانی زبان ان تینوں طریقوں سے لکھی جاتی ہے۔ لیکن اس پیچیدہ رسم الخط کو بھی انہوں نے اس طرح اختیار کیا ہے کہ اُن کے کمپیوٹر اسی رسم الخط میں کام کرتے ہیں، تمام علوم کی تعلیم اسی زبان اور اسی رسم الخط میں دی جاتی ہے۔

جاپان کے ان حالات کا موازنہ جب اپنے ملک کے حالات سے کیا جائے تو حسرت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا، جو اوصاف قرآن وحدیث کی روشنی میں مسلمانوں کو حاصل کرنے تھے، ان کو غیر مسلم اپنا کر دنیا میں ترقی کی منزلیں طے کر رہے ہیں، اور مسلمان ہیں کہ خود اپنے گھر کی دولت سے فائدہ اُٹھانے سے محروم ہیں۔

مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور

جاپانی زندگی کو دیکھنے کے بعد یہ تصورات ذہن پر چھائے رہے، یہاں تک کہ ۱۷ مئی کو دوپہر گیارہ بجے ٹوکیو کے نریتا ایئرپورٹ سے واپسی کا سفر شروع ہوگیا اور تقریباً سولہ گھنٹے کے سفر کے بعد بفضلہ تعالیٰ بعافیت کراچی واپسی ہوگئی۔

لاطینی امریکہ کا ایک سفر

برازیل…… پانامہ
ٹرینیڈاڈ…… باربیڈوس

شوال ۱۴۲۹ھ

اکتوبر 2008ء

لاطینی امریکہ کا ایک سفر

برازیل۔ پانامہ۔ ٹرینیڈاڈ۔ باربیڈوس
(شوال ۱۴۲۹ھ / اکتوبر 2008ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم

و علی آلہ واصحابہ اجمعین

عام طور سے جب ہم امریکہ کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے صرف شمالی امریکہ کے براعظم کا وہ ملک مراد ہوتا ہے جسے ریاست ہائے متحدہ یا انگریزی میں یونائیٹڈ اسٹیٹس کہتے ہیں، اور جو اس وقت دنیا کی سپر پاور کی حیثیت سے مشہور ہے۔ لیکن درحقیقت امریکہ دو بڑے براعظموں کا نام ہے۔ ایک براعظم شمالی امریکہ ہے جس کا سب سے بڑا ملک کینیڈا ہے، اور ریاست ہائے متحدہ اور میکسیکو بھی اُسی میں واقع ہیں اور دوسرا براعظم جنوبی امریکہ کہلاتا ہے جو کولمبیا سے ارجنٹائن اور چلی تک پھیلا ہوا ہے۔ شمالی امریکہ کے انتہائی جنوبی سرے پر خشکی کی ایک لمبی پٹی ہے جس پر میکسیکو سے لیکر پانامہ تک بہت سے چھوٹے چھوٹے ملک واقع ہیں۔ یہ علاقہ اگرچہ شمالی امریکہ کے براعظم میں شامل ہے، لیکن اصطلاح میں اس کو وسطی امریکہ اور انگریزی میں سینٹرل امریکہ کہتے ہیں۔ شمالی امریکہ، وسطی امریکہ اور جنوبی امریکہ تینوں علاقوں میں جو ممالک انگریزی کے بجائے دوسری رومانی زبانیں (Romance Languages) مثلاً اسپینی، پرتگیزی یا فرانسیسی زبانیں بولتے ہیں۔ انہیں لاطینی امریکہ کہا جاتا ہے۔ بعض لوگ لاطینی امریکہ اور جنوبی امریکہ کو ہم

معنی سمجھتے ہیں مگر یہ درست نہیں ہے۔ اگرچہ جنوبی امریکہ کا پورا براعظم لاطینی امریکہ میں شامل ہے۔ لیکن لاطینی امریکہ میں میکسیکو بھی داخل ہے جس کا ایک بڑا حصہ شمالی امریکہ میں ہے، نیز وسطی امریکہ کے تمام ممالک بھی لاطینی امریکہ کہلاتے ہیں جو زیادہ تر اسپینی زبان بولتے ہیں۔ شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ کے درمیان بحر اوقیانوس (Altantic Ocean) سے ملا ہوا ایک سمندر ہے جسے بحیرۂ کیریبین (Caribbian Sea) کہا جاتا ہے۔ اس سمندر میں کئی بڑے بڑے جزیرے ہیں جنہیں جزائر غرب الہند اور انگریزی میں ویسٹ انڈیز کہتے ہیں ان میں سے ہر جزیرہ اب مستقل ملک بن چکا ہے۔ برٹانیکا کے مطابق ان جزیروں کو بھی توسعاً لاطینی امریکہ کی اصطلاح میں شامل کرلیا جاتا ہے۔

میں ان صفحات میں اپنے جس سفر کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں، وہ جنوبی امریکہ کے ملک برازیل، وسطی امریکہ کے ملک پانامہ اور جزائر غرب الہند کے دو ملکوں ٹرینیڈاڈ اور باربیڈوس پر مشتمل تھا۔ چونکہ وسیع تر معنی میں یہ سارے ممالک لاطینی امریکہ کے حصے ہیں، اس لئے عنوان میں اسے لاطینی امریکہ کا سفر قرار دیا گیا ہے۔

تقریباً ڈھائی سال سے پانامہ اور ٹرینیڈاڈ کے بعض مسلمانوں کی طرف سے مجھے ان ملکوں کا دورہ کرنے کی دعوت مل رہی تھی، لیکن چونکہ یہ ملک ہم سے بہت دور واقع ہیں، اور ان کا سفر کرنے کیلئے لمبا وقت درکار تھا، اس لئے یہ سفر ٹلتا رہا، یہاں تک کہ اس سال ۱۴۲۹ھ میں عیدالفطر کے بعد تقریباً تین ہفتے میں اس سفر کیلئے فارغ کرسکا۔ پہلے پانامہ جانے کا خیال تھا اور اس کے بعد ٹرینیڈاڈ۔ پانامہ جانے کیلئے کئی راستے ممکن تھے، لیکن کئی وجوہ سے مجھے برازیل کے راستے سے جانا زیادہ مناسب معلوم ہوا، اور خیال ہوا کہ چند روز برازیل میں بھی گزار لیے جائیں اور اس طرح برازیل بھی اس سفر میں شامل ہوگیا۔ پھر جب باربے ڈوس کے کچھ احباب کو میرے اس سفر کا علم ہوا تو انہوں نے آنے کیلئے بھی اصرار کیا اور اس طرح آخری دو دن وہاں بھی حاضری ہوئی۔

۷ اور ۸ شوال کو دبئ میں دو دن کی میٹنگوں سے فارغ ہونے کے بعد ۹ شوال (مطابق

۱۹ اکتوبر ۲۰۰۸ء) کو بروز جمعرات صبح ساڑھے دس بجے امارات ایئر لائنز کی پرواز سے برازیل کے سب سے بڑے شہر ساؤپالو کے لئے روانگی ہوئی۔ دبئی سے ساؤپالو کا فاصلہ تقریباً تیرہ ہزار کیلومیٹر ہے، اور امارات ایئر لائنز نے ساؤپالو کیلئے براہِ راست پرواز جاری کی ہوئی ہے، جو تقریباً ساڑھے پندرہ گھنٹے میں ساؤپالو پہنچاتی ہے۔ اس ایئر لائنز سے میں نے ماضی میں جو بہت سے سفر کئے ہیں، اُن کی وجہ سے میرے پاس اس کے بہت سے پوائنٹس ہیں۔ ان پوائنٹس کی بنیاد پر ایئر لائنز نے مجھے بلا معاوضہ اپ گریڈ کر کے فرسٹ کلاس کی سیٹ دیدی تھی۔ ایئر لائنز نے حال ہی میں بوئنگ ۲۰۰۔۷۷ کا یہ نیا طیارہ خریدا ہے، جس میں فرسٹ کلاس کے ہر مسافر کیلئے ایک چھوٹا سا خوبصورت کمرہ مخصوص کر دیا جاتا ہے جو دروازوں سے بند بھی ہو جاتا ہے اور اس کی نشست پھیل کر مکمل بستر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں لکھنے کی میز بھی ہے، چھوٹی سی الماری بھی اور بہت سی ایسی سہولیات بھی جن کا پہلے ہوائی جہاز میں تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وجہ سے بفضلہٖ تعالیٰ یہ طویل سفر بڑا آرام دہ بن گیا۔ پچھلے تقریباً دس بارہ سال سے میرے پاس جہاز میں کرنے کیلئے قرآنِ کریم سے متعلق کوئی نہ کوئی تالیفی کام ہوا کرتا تھا، پہلے معارف القرآن کا انگریزی ترجمہ، پھر میرا انگریزی ترجمہ جو نوبل قرآن کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور آخر میں قرآنِ کریم کا نیا اُردو ترجمہ اور اُس کے تشریحی حواشی۔ ان تینوں کاموں کا بڑا حصہ سفروں اور جہازوں میں ہی انجام پایا ہے۔ الحمدللہ! یہ اردو ترجمے کا کام بھی اس رمضان المبارک میں تکمیل کو پہنچ چکا ہے اور اب زیرِ طبع ہے۔ اس لئے سالہا سال کے بعد جہاز کا یہ پہلا طویل سفر تھا جس میں قرآنِ کریم سے براہِ راست متعلق کوئی کام میرے ساتھ نہیں تھا جس کی وجہ سے یہ سفر پھیکا پھیکا سا لگ رہا تھا۔ البتہ ایک اور کام اس سفر میں میرے ساتھ رہا اور وہ سیاست کے مختلف نظریات اور اُن کے بارے میں اسلامی تعلیمات کے موضوع پر کئی سال پہلے میں نے دارالعلوم میں ایک کورس کرایا تھا جس میں ملک بھر سے علماء کرام شریک ہوئے تھے۔ اس درس کی تقاریر کو میرے دوست مولانا مزمل کاپڑیا صاحب نے ٹیپ ریکارڈر

کی مدد سے کمپیوٹر پر کمپوز کرلیا ہے۔ مولانا مزمل صاحب کو ہر ہفتے تین مرتبہ اپنے گردے کی دھلائی (Dialysis) کرانی پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی ہمت سے نوازا ہے۔ اسی دھلائی کے دوران وہ ٹیپ ریکارڈر سے سن سن کر یہ تقاریر کمپوز کرتے رہے، یہاں تک کہ کوئی سو صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ انہوں نے نظرثانی کیلئے میرے کمپیوٹر میں داخل کردیا۔ اب میں نے اس سفر میں اُس پر نظرثانی کا کام شروع کردیا، اور جہاز میں یکسوئی کے ساتھ کافی دیر اس کام میں مشغول رہا۔

جہاز پہلے جزیرۂ عرب کو یمن کی طرف سے عبور کرکے بحر احمر میں داخل ہوا، پھر حبشہ (ایتھوپیا) کی سمت سے براعظم افریقہ میں داخل ہوکر اُس نے افریقہ کو عرضاً عبور کیا، اور کانگو اور انگولا کی طرف سے نکل کر بحر اوقیانوس پر پرواز شروع کردی۔ تقریباً چھ گھنٹے مسلسل اس سمندر پر پرواز کرنے کے بعد جنوبی امریکہ کے براعظم میں داخل ہوکر جب طیارہ ساؤپالو کے ہوائی اڈے پر اُترا تو وہاں کے حساب سے اُس وقت شام کے سات بج رہے تھے (ساؤپالو کا وقت دبئی سے آٹھ گھنٹے اور پاکستان سے نو گھنٹے پیچھے ہے)

برازیل کے شہر ساؤپالو میں

ایئرپورٹ پر ہمارے میزبان جناب علی احمد الصفی استقبال کیلئے موجود تھے۔ یہ اصلاً لبنانی ہیں، اور ان کے والد عرصۂ دراز سے برازیل میں مقیم ہیں۔ دبئی میں ہمارے دوست جناب اسحاق نور اور امان اللہ صاحب کی معرفت ان سے میرا تعارف ہوا تھا اور یہ میری کتابوں کے حوالے سے مجھ سے واقف تھے۔ انہوں نے بڑی محبت سے برازیل کے قیام کے دوران ہماری میزبانی کی۔ ساؤپالو برازیل کا سب سے بڑا تجارتی شہر ہے جو تقریباً ڈیڑھ کروڑ آبادی پر مشتمل بتایا جاتا ہے۔ علی احمد الصفی صاحب نے اپنے گھر کے قریب جس ہوٹل نما فلیٹ میں ہمارے رہنے کا انتظام کیا تھا وہ اس کے ایک محلے ساؤ برنارڈو میں واقع تھا، اور ٹریفک کے ہجوم کی وجہ سے وہاں تک پہنچتے پہنچتے ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔ موسم میں بڑی خوشگوار خنکی تھی اور وہ رات ہم نے اپنی قیام گاہ پر ہی گزاری۔

برازیل جنوبی امریکہ کے براعظم کا سب سے بڑا ملک ہے۔ جو بتیس لاکھ چھیاسی ہزار چار سو ستاسی مربع میل میں پھیلا ہوا ہے، اور اس طرح پورے براعظم کا تقریباً آدھا رقبہ اس کے پاس ہے، اور جنوبی امریکہ کے ممالک میں سب سے زیادہ آبادی بھی اسی ملک میں ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی تک دنیا کو اس علاقے کا علم نہیں تھا، ۱۵۰۰ء میں پرتگال کے ایک نیوی کمانڈر پیڈرو ایلویرس کیبرال (Pedro Alvares Cabral) جو کولمبس اور واسکوڈی گاما کی طرح ہندوستان کا راستہ دریافت کرنے کیلئے نکلا تھا، بھٹک کر جنوبی امریکہ کی طرف آنکلا، اور اس نے برازیل کا یہ علاقہ دریافت کیا۔ اُس وقت یہاں جو قوم آباد تھی، اُس کے حالات نامعلوم ہیں، لیکن کہا جاتا ہے کہ وہ غیر متمدن قوم تھی۔ رفتہ رفتہ جب پرتگالیوں کو معلوم ہوا کہ یہاں قدرتی وسائل بہت ہیں تو انہوں نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا اور اس ملک کو پرتگال کی نوآبادی قرار دے دیا۔ اسی لئے اس ملک میں پرتگیزی زبان بولی جاتی ہے۔ پرتگال کے تسلط کے بعد اس علاقے کے اصل باشندے دور دراز کے دیہاتی علاقوں تک محدود ہوگئے، اور آبادی کی بہت بڑی تعداد تو وہ تھی جو پرتگال سے یہاں آکر رہنے لگی تھی، اس کے علاوہ پرتگالی حکومت افریقہ کے بہت سے سیاہ فام لوگوں کو غلام بنا کر یہاں اس لئے لائی کہ اُن سے یہاں کھیتی باڑی کا کام لیا جائے، اس طرح سیاہ فام افریقیوں کی بھی بڑی تعداد یہاں آباد ہوگئی۔ اِدھر یورپ کے دوسرے علاقوں سے بھی بہت سے سفید فام لوگ آکر آباد ہوئے، اور ان مختلف النسل لوگوں کے درمیان شادی کے رشتے سے ایک ملی جلی قوم پیدا ہوگئی۔ سولہویں صدی سے اُنیسویں صدی کے آغاز تک برازیل پرتگال کے قبضے میں رہا، یہاں تک کہ اس میں آزادی کی تحریک چلی اور آخر کار ۷؍ستمبر ۱۸۲۲ء کو اُس نے پرتگال سے آزادی حاصل کرکے مستقل ملک کی حیثیت اختیار کرلی۔ آزادی کے بعد یہاں کے قدرتی وسائل اور تجارت وصنعت کے مواقع کی وجہ سے دنیا کے مختلف خطوں سے لوگ ترکِ وطن کرکے یہاں آباد ہوئے جن میں افریقہ کے علاوہ یورپ اور عرب ممالک کے باشندے بھی داخل تھے۔ انہی عرب لوگوں میں سے بہت سے

مسلمان بھی تھے جن کی تعداد بڑھتے بڑھتے اب دس لاکھ کے قریب قریب پہنچ چکی ہے۔ ان میں ساٹھ فیصد کے قریب تعداد یہیں کے برازیلی نومسلموں کی ہے، ان کے بعد زیادہ تر مسلمان عربی النسل ہیں اور ان میں بھی لبنان کے باشندے زیادہ ہیں۔ اب پاکستانیوں کی بھی تھوڑی سی تعداد موجود ہے۔

علی الصیفی کے والد احمد الصیفی صاحب عرصۂ دراز پہلے لبنان سے برازیل منتقل ہوئے تھے اور انہوں نے یہاں مسجدوں کی تعمیر اور اسلامی مراکز کے قیام میں بڑا سرگرم حصہ لیا ہے۔ انہوں نے ہمارے قیام کی دوسری رات اپنے گھر پر میرے اعزاز میں ایک عشائیہ کا اہتمام کیا جس میں شہر کے چیدہ چیدہ لوگوں کو بھی مدعو کیا۔ اس موقع پر ان حضرات نے بتایا کہ بحمد اللہ برازیل میں مساجد کی تعداد سو سے متجاوز ہو چکی ہے، اور صرف ساؤپالو کے صوبے میں تقریباً پچاس مسجدیں ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ برازیل کے باشندوں میں اسلام قبول کرنے کا رجحان بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے اور اگر پرتگیزی زبان میں اسلام کی تبلیغ کا انتظام ہو تو اس تعداد میں بہت اضافے کا امکان ہے، (مجھے بھی اپنے مختصر قیام کے دوران کئی نومسلموں سے مل کر اس حقیقت کا شدت سے احساس ہوا جس کا تذکرہ انشاء اللہ آگے کروں گا) جن حضرات سے اس عشائیے میں ملاقات ہوئی، ان میں کئی حضرات بڑے متدین اور دینی جذبے سے سرشار معلوم ہوئے، اور انہوں نے اپنے اپنے تجربات سے آگاہ کیا۔ میری آمد کی خبر سن کر ایک پاکستانی نوجوان فرحان ڈیسائی صاحب اپنے کچھ احباب کے ساتھ تین گھنٹے کی مسافت سے سفر کر کے وہیں پہنچ گئے۔ یہ حضرات تبلیغی جماعت کے ذریعے اس ملک میں دین کی گرانقدر خدمات انجام دے رہے ہیں اور انہوں نے بتایا کہ الحمد للہ جماعت کا کام یہاں سرگرمی سے جاری ہے۔

برازیل میں مرغیوں کے فارم اتنے زیادہ ہیں کہ وہ دنیا بھر میں مرغیوں کا گوشت برآمد کرتا ہے۔ سعودی عرب اور خلیجی ممالک میں بھی بکثرت مرغیوں کا گوشت وہاں سے آتا ہے، اور اگرچہ اس پر یہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ وہ اسلامی طریقے پر ذبح کی ہوئی مرغیوں کا

گوشت ہے، لیکن اُس کی حقیقت کے بارے میں ہمیشہ شک و شبہ ہی رہتا ہے، کیونکہ ان ملکوں میں عموماً مرغیوں کو مشین سے ذبح کیا جاتا ہے اور اس میں شرعی شرائط پوری نہیں ہوتیں۔ اس لئے ہم اُسے کھانے کا مشورہ نہیں دیتے۔ میں نے اپنی کتاب احکام الذبائح میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ میں نے پانامہ جاتے ہوئے برازیل کا جو راستہ اختیار کیا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شاید اس قیام کے دوران اس سلسلے میں کچھ مزید معلومات حاصل ہوں، اور علی الصیفی صاحب سے رابطہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اور ان کے والد اُن چندلوگوں میں سے ہیں جو وہاں مرغیوں کی ذبح کی نگرانی کرتے ہیں، اور سرٹیفکیٹ جاری کرتے ہیں۔ میں نے ان سے برازیل پہنچنے سے چند روز پہلے یہ درخواست کی تھی کہ وہ میرے قیام کے دوران اگر ممکن ہو تو کسی ذبح کا معائنہ کرانے کا انتظام کریں۔ لیکن انہوں نے بتایا کہ ذبح کی فیکٹریوں کا یہ قانون ہے کہ کسی باہر کے ملک سے آنے والے کو کچھ دن برازیل میں قرنطینہ کرانے کے بعد فیکٹری میں داخلے کی اجازت ملتی ہے، اس لئے اس مختصر قیام میں معائنہ ممکن نہیں ہوگا۔ زبانی طور پر انہوں نے بتایا کہ ان کارخانوں میں مسلمانوں کیلئے مرغیاں ذبح کرنے کا جو وقت مقرر ہوتا ہے، اس میں مرغیوں کو مشینی چھری سے ذبح نہیں کیا جاتا، بلکہ چار آدمی اپنے ہاتھوں میں چھریاں لیکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور جب مرغیاں ان کے سامنے سے گزرتی ہیں وہ بسم اللہ پڑھ کر انہیں ہاتھ سے ذبح کرتے ہیں۔ یہ وہی طریقہ ہے جو بندہ نے اپنی کتاب ''احکام الذبائح'' میں تجویز کیا ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی تو رفع ہوئی کہ وہاں مشینی چھری سے مرغیاں ذبح ہوتی ہیں، یا بسم اللہ پڑھنے کیلئے کوئی ٹیپ لگا دیا جاتا ہے، لیکن علی الصیفی اور احمد الصیفی صاحبان نے دو باتوں کا اعتراف کیا۔ ایک یہ کہ اگرچہ ہم نے ان ذبح کرنے والوں پر یہ پابندی عائد کررکھی ہے کہ وہ ہر مرغی پر بسم اللہ پڑھیں، اور جب تک ان کی ڈیوٹی ہے، اس وقت تک کوئی اور کام نہ کریں، لیکن بہر حال وہ انسان ہیں، اور کبھی ان کو کھانسی، چھینک وغیرہ آسکتی ہے، اور جس تیزی سے مرغیاں ان کے سامنے سے گذرتی ہیں، اس کے پیش نظر اس بات کا امکان رہتا

ہے کہ کچھ مرغیاں اس طرح گذر جائیں کہ ان پر الگ سے بسم اللہ نہ پڑھی گئی ہو۔ دوسرے ہمیں ہر مذبح میں ذبح کرنے کیلئے مسلمان میسر آنا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ یہ فیکٹریاں شہروں سے دور ایسے علاقوں میں ہیں جہاں مسلمان رہنا پسند نہیں کرتے، اس لئے بعض مقامات پر عیسائیوں کو بھی مقرر کیا گیا ہے، اور ان پر یہ پابندی لگائی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نام لیکر ذبح کریں۔ اب وہ عملاً اس بات کا کتنا اہتمام کرتے ہیں؟ اس کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔

اس کے علاوہ ان حضرات کے بیان کے مطابق برازیل میں کم وبیش پچاس فیکٹریاں ہیں جن میں سے ہر ایک میں روزانہ ہزارہا مرغیاں ذبح ہوتی ہیں، اور ان میں مسلمانوں کے ذبیحے کی نگرانی کرنے اور سرٹیفکیٹ جاری کرنے والے بھی مختلف ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کن شرائط کا لحاظ رکھتے ہیں، اور جب بازار میں یہ مرغیاں آتی ہیں تو یہ پتہ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے یہ کہ کون سے مذبح کی ہیں اور کن لوگوں نے اس کیلئے سرٹیفکیٹ جاری کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس تفصیل کے معلوم ہونے کے بعد بھی برازیل سے درآمد کی جانے والی مرغیوں کے بارے میں شکوک وشبہات رفع نہیں ہوئے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ حلال گوشت کی فراہمی کیلئے عالمی سطح پر کوئی قابل اعتماد انتظام کیا جائے۔ افسوس ہے کہ مسلمان ملکوں کی حکومتوں کو اس طرف کوئی توجہ نہیں ہے، لیکن میں نے بعض نجی اداروں سے فرمائش کی ہے کہ وہ مستند علماء کی نگرانی میں اس طرح کا کوئی انتظام کریں اور اس سلسلے میں کچھ ابتدائی قدم اُٹھائے بھی گئے ہیں۔ خدا کرے کہ وہ کامیابی کی منزل تک پہنچ سکیں۔

ساؤپالو میں قیام کے دوران ہم نے شہر کی بعض مسجدیں بھی دیکھیں جو ماشاء اللہ بڑی عالیشان تھیں، ان کے منارے دور سے نظر آتے ہیں، اور نمازیوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہوتی ہے۔ نماز جمعہ ہم نے مسجد ابوبکر الصدیق میں پڑھی جو اسی محلے میں واقع ہے جس میں ہمارا قیام تھا۔ یہاں ایک مصری شیخ نے عربی میں اچھا خطبہ دیا، اسی مسجد کے ساتھ ایک

اسلامی مرکز بھی قائم ہے، بچوں کی تعلیم کا بھی کچھ انتظام موجود ہے، ایک مسلمان ریسٹورنٹ بھی ہے اور مسلمانوں کی ضروریات کی ایک دکان بھی۔ ایک اور مسجد جس میں ہمیں نماز پڑھنے کا موقع ملا، مسجد الملک عبدالعزیز ہے جو سعودی تعاون سے تعمیر ہوئی ہے اور بڑی خوبصورت اور شاندار مسجد ہے۔ اس کا رقبہ بھی بہت بڑا ہے اور بارہ سال سے یہاں ایک مدرسہ بھی قائم ہے، جس میں تقریباً سو بچے زیر تعلیم ہیں، اور اس میں عصری مضامین کے ساتھ دینی تعلیم کا انتظام ہے۔ تبلیغی جماعت کا مرکز تو اگرچہ یہاں سے دور مسجد عمر بن الخطاب میں ہے، لیکن جماعتوں کی زیادہ تر آمد ورفت اسی مسجد الملک عبدالعزیز میں ہوتی رہتی ہے اور اس وقت بھی وہاں مراکش سے ایک جماعت آئی ہوئی تھی۔

تبلیغی جماعت کے کام نے جن زندگیوں میں انقلاب پیدا کیا، اُن کی ایک قابل رشک مثال ہمارے سامنے اُس وقت آئی جب علی الصیفی صاحب کے ماموں زاد بھائی صہیب صاحب سے ہماری ملاقات کرائی گئی۔ یہ نوجوان جماعت کے کام میں بہت سرگرم ہیں اور علی صاحب نے بتایا کہ ان کے والد مصطفی احمد العرہ لبنان کے اُن مالدار لوگوں میں سے تھے جو برازیل میں آکر دین و مذہب سے بالکل بے تعلق ہو گئے تھے اور مغربی تہذیب کے تمام بُرے لوازم اُن کی زندگی میں موجود تھے، یہاں تک کہ وہ اپنی ان بُری عادتوں کی وجہ سے مسلمانوں میں اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ اُن کے والد نے ان کی اصلاح کیلئے سختی اور نرمی کا ہر طریقہ آزمایا، مگر اُن کے اطوار میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، یہاں تک کہ ۱۹۷۱ء کے قریب برطانیہ سے ایک تبلیغی جماعت آئی، اور اس کے امیر نے کسی جگہ بیان کیا تو اس وقت اتفاق سے یہ صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ بیان کرنے والے صاحب کی شکل وصورت دیکھ کر انہوں نے دل میں خیال کیا کہ شاید یہ کسی مسجد یا مدرسے کیلئے چندہ کریں گے اس لئے ان کے دل میں اُن کے لئے کوئی اچھے جذبات پیدا نہیں ہوئے۔ لیکن جب انہوں نے بیان کرنا شروع کیا تو نہ جانے کس دردمندی کے ساتھ انہوں نے کہا کہ ہمیں آپ سے کوئی پیسہ نہیں چاہئے، ہم اپنا پیسہ خرچ کرکے یہاں اس لئے آئے ہیں کہ آپ کو

اُس دین کے حصول کی دعوت دیں جو حضور نبی کریم ﷺ لے کر تشریف لائے تھے تو انہیں اپنے خیال پر ندامت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کو مصطفیٰ العرہ صاحب کی زندگی بدلنی تھی، اس کے بعد انہوں نے پورا بیان سنا اور انہی کے کہنے پر مصطفیٰ العرہ صاحب ۱۹۷۲ء میں پاکستان گئے اور جب لوٹے تو وہ ایک بالکل مختلف انسان تھے۔ جن لوگوں نے ان کی پہلی زندگی دیکھی تھی وہ انہیں نئے روپ میں پہچان نہیں سکتے تھے۔ پاکستان سے واپس آ کر انہوں نے اپنی پوری زندگی تبلیغی جماعت کے کام کو برازیل میں فروغ دینے کیلئے وقف کر دی، اور مرتے دم تک اس خدمت میں مشغول رہے۔ ملک بھر میں جماعت کا کام جس طرح پھیلا، اُس میں ان کا کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے صاحبزادے صہیب صاحب نے ہمیں تیسرے دن دوپہر کے وقت اپنے گھر پر آرام کی دعوت دی اور وہاں ان کے پورے خاندان سے ملاقات ہوئی اور نظر آیا کہ وہ سب تبلیغ کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔

علی الصیفی صاحب نے ہمیں ساؤ پالو کی سیر بھی کرائی۔ ساؤ پالو کا شہر بحر اوقیانوس کے مغربی ساحل پر واقع ہے، اور ساحل کے ساتھ ساتھ سرسبز پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ دور تک چلا گیا ہے، ان پہاڑوں کے ایک طرف سمندر ہے اور دوسری طرف ان پہاڑوں کے دامن میں قدرتی جھیلیں، چھوٹے چھوٹے آبشار اور خودرو درختوں کے گھنے جنگل پھیلے ہوئے ہیں جن میں آموں، کیلوں اور کئی مقامی پھلوں کے خودرو درخت بھی شامل ہیں۔ آم کے درخت یہاں خود اُگتے ہیں اور آموں سے لدے ہوئے درخت جگہ جگہ، یہاں تک کہ سڑکوں پر بھی نظر آتے ہیں، اور ہر کس و ناکس کو مفت دستیاب ہیں۔ یہ پورا علاقہ قدرتی حسن سے مالا مال ہے، جس کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہم ساؤ پالو کی بندرگاہ سانتوز (Santos) سے گذرے جو جنوبی امریکہ کی سب سے بڑی بندرگاہ شمار ہوتی ہے، یہاں ایک چھوٹا سا شہر آباد ہے، جس میں ایک مسجد بھی ہے۔ پھر آگے ایک اور چھوٹا سا شہر کیوباٹاؤ (Cubatao) آیا جہاں گیس کے کنویں اور تیل صاف کرنے کی فیکٹریاں ہیں اور اُس کی وجہ سے یہاں فضا میں تیل اور گیس کی بُو بسی ہوئی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ دنیا

میں سب سے زیادہ فضائی آلودگی (Pollution) اسی شہر میں پائی جاتی ہے۔ پھر علی الصیفی صاحب ہمیں ایک خوبصورت ساحلی شہر میں لے گئے جس کا نام گواروجا (Guaruja) ہے اور اس کا میئر بھی ایک مسلمان ہے۔ یہ شہر بحراوقیانوس کے ایک دلآویز کنارے پر آباد ہے جہاں سمندر سرسبز پہاڑیوں سے کھیلتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں اس وقت موسم بہار کی آمد آمد تھی، اور جگہ جگہ سے سبزہ پھوٹا پڑ رہا تھا۔ ان پُرسکون قدرتی نظاروں میں کچھ دیر کیلئے سفر کی تھکن کافور ہوگئی۔

ساؤپالو (جس کا تلفظ یہاں کے لوگ سوں پالو کرتے ہیں)، برازیل کا سب سے بڑا تجارتی شہر سمجھا جاتا ہے اور پورے جنوبی امریکا میں سب سے بڑا صنعتی مرکز بھی۔ اُس کی آبادی ڈیڑھ کروڑ کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کی بنیاد ۲۵ جنوری ۱۵۵۴ء کو عیسائی مشنریوں نے رکھی تھی اور چونکہ یہ تاریخ موجودہ بگڑی ہوئی عیسائیت کے بانی سینٹ پال کی برسی کی تھی، اس لئے اس شہر کا نام ہی سینٹ پال کے نام پر رکھا گیا۔ مگر پرتگیزی تلفظ کے مطابق اُسے ساؤپالو یا سوں پالو کہا جانے لگا۔ اس شہر کی سب سے مرکزی سڑک پالستا ایونیو (paulista Avenue) اپنی شاندار اور فلک بوس عمارتوں کی وجہ سے نیویارک کے پارک ایونیو کی یاد دلاتی ہے۔ اسی علاقے میں اُس طرح کا ایک انتہائی مہنگا بازار بھی ہے جیسے لاس اینجلس کا بازار مشہور ہے۔

جب ساؤپالو میں دو دن گزارنے کے بعد ہماری روانگی کا وقت آیا تو علی الصیفی صاحب نے کہا کہ اگر آپ برازیلی طرز کی مچھلیاں اور یہاں کے بعض حلال کھانے کھائے بغیر یہاں سے چلے گئے تو گویا آپ نے برازیل ہی نہیں دیکھا، چنانچہ انہوں نے ساؤپالو کے ایک خوبصورت مطعم میں ہمیں دوپہر کا کھانا کھلایا جس میں واقعی نہایت لذیذ سبزیوں، چٹنیوں اور مچھلی کی انواع واقسام کا ایسا مجموعہ تھا جو اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا۔ اسی کھانے پر انہوں نے مصطفیٰ العرہ صاحب کے بیٹے صہیب صاحب کو بھی مدعو کیا تھا۔ جن کا تذکرہ میں پہلے کر چکا ہوں۔ انہوں نے ہی کھانے کے بعد اپنے مکان پر آرام کرنے کی

دعوت دی اور پھر ہم وہیں سے ایئرپورٹ کیلئے روانہ ہوگئے۔

ریوڈی جنیرو میں

اس کے بعد ہمیں دو دن برازیل کے دوسرے بڑے شہر ریوڈی جنیرو میں گذارنے تھے (جسے اختصار کے پیش نظر صرف ریو کہا جاتا ہے)، اور وہیں سے پانامہ کیلئے روانہ ہونا تھا۔ علی الصفی صاحب کے ساتھ ایک برازیلی نومسلم نوجوان کام کرتے ہیں جن کا اسلامی نام ابوبکر ہے۔ علی صاحب نے ان کو ہم سے پہلے ہی ریو بھیج دیا تھا، تاکہ وہ وہاں ہمارا استقبال اور وہاں کے قیام میں ہماری رہنمائی کرسکیں۔ وہ ریو ہی کے باشندے ہیں، مگر ملازمت کیلئے ساؤپالو میں رہتے ہیں۔ ان کی مادری زبان اگرچہ پرتگیزی ہے لیکن وہ انگریزی بڑی روانی سے بولتے ہیں ورنہ ریو میں انگریزی جاننے والے بہت کم ہیں۔ چنانچہ ہم مغرب کی نماز ایئرپورٹ پر پڑھ کر ٹم ایئرلائنز کے ایک برازیلی طیارے کے ذریعے ایک گھنٹے میں ریو پہنچے۔ ابوبکر صاحب ایئرپورٹ پر گاڑی لے کر استقبال کیلئے موجود تھے۔ گاڑی سے ہوٹل جاتے ہوئے میں نے ان سے ان کے اسلام لانے کا واقعہ پوچھا تو انہوں نے یہ ایمان افروز واقعہ تفصیل سے بتایا:

انہوں نے کہا کہ مجھے انٹرنیٹ کے ذریعے اسلام کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ میں نے انگریزی پہلے سے پڑھ رکھی تھی، ٹیلیویژن پر جو چینل اسلامی معلومات فراہم کرتے ہیں، انہیں دیکھتا رہا اور کچھ ویڈیو کیسٹس میں نے حاصل کیں جو انگریزی میں اسلام اور مسلمانوں کے تعارف پر مشتمل تھیں۔ جن کے نتیجے میں اسلام کی طرف میری رغبت بڑھتی چلی گئی، اور مجھے حضور نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ پڑھنے کا شوق ہوا۔ اسی دوران ریو کی ایک پرانی مسجد میں سوڈان کے ایک عالم سے میری ملاقات ہوئی، اور انہوں نے میرا شوق دیکھ کر مجھے بذاتِ خود سیرت کا درس دینے کا وعدہ کرلیا۔ اسی زمانے میں اتفاق سے انٹرنیٹ کے ذریعے ساؤپالو کی ایک برازیلی لڑکی سے میری گفتگو (Chat) ہوا کرتی تھی۔ یہ لڑکی کٹر پروٹسٹنٹ عیسائی تھی اور نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر

کے گرنے کے واقعے کی بناء پر اس کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شدید دشمنی پیدا ہوگئی تھی اور اُس نے ارادہ کیا تھا کہ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کام کروں گی۔ اس غرض کیلئے اُس نے اسلام کا مطالعہ شروع کیا اور قرآنِ کریم کا ترجمہ اور حضورِ نبی کریم ﷺ کی سیرت پڑھی۔ اس مطالعے کے نتیجے میں اُس کے دل میں تبدیلی پیدا ہوئی اور اُسے یقین ہوگیا کہ اسلام ہی دینِ برحق ہے۔ اِدھر میں سوڈانی عالم سے سیرت پڑھ رہا تھا اور اُدھر وہ لڑکی اپنے طور پر مطالعہ کررہی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا نہیں تھا، صرف انٹرنیٹ پر بات ہوا کرتی تھی۔ اتفاق سے مجھے کسی کام سے ساؤپالو جانا ہوا تو میں نے اُس سے ملنے کا وقت مقرر کیا، اور ہم نے آپس میں شادی کا فیصلہ کرلیا۔ اس کے بعد اپنے سوڈانی اُستاد کے ذریعے میں نے ۲۰۰۳ء میں اسلام قبول کرلیا، اور لڑکی سے تذکرہ کیا تو اُس نے اپنی کہانی سنائی اور کہا کہ میں پہلے ہی اسلام قبول کرچکی ہوں۔ اس طرح ہماری شادی اس حالت میں ہوئی کہ ہم دونوں مسلمان ہو چکے تھے۔

جس گاڑی کا ہمارے میزبانوں نے ہمارے لئے انتظام کیا تھا، وہ دراصل ایک ٹیکسی تھی، اور اس کا ڈرائیور سعید بھی برازیلی نومسلم تھا۔ مگر پرتگیزی کے سوا کوئی زبان نہیں جانتا تھا، میں نے اُس سے اُس کے اسلام لانے کا واقعہ ابوبکر صاحب کے ذریعے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ دراصل میرا ایک نوجوان لڑکا تھا جو ایک مسلمان استاد سے ملا کرتا تھا۔ اُن کے ذریعے اُس کے دل میں اسلام کی معلومات حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا اور اُس نے کچھ عرصے کے بعد اسلام قبول کرکے مجھے بھی مسلمان ہونے کی دعوت دی، میں نے بھی اسلام کی بنیادی معلومات حاصل کیں اور مسلمان ہوگیا۔ آج کل میرا لڑکا دینی تعلیم حاصل کرنے کیلئے سوڈان گیا ہوا ہے۔

یہ دو واقعات تو میں نے براہِ راست ان نومسلموں سے سنے۔ ابوبکر صاحب نے بتایا کہ یہاں ہر ہفتے اچھے خاصے لوگ مسلمان ہونے کیلئے اسلامی مرکز میں آتے ہیں۔ برازیل میں اگرچہ اکثریت کیتھولک عیسائیوں کی ہے، لیکن لوگ اس مذہب سے بیزار ہوتے

جارہے ہیں، اور جس کسی کو اسلام کی حقیقت معلوم ہوجاتی ہے وہ اسلام لے آتا ہے۔ ابوبکر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ یہاں کے لوگ متعصب نہیں ہیں، بلکہ کھلے دل کے لوگ ہیں اور دوسرے مغربی ملکوں کے مقابلے میں مسلمانوں سے زیادہ ہمدردی رکھتے ہیں، یہاں تک کہ اگر یہاں کے دس آدمیوں کے سامنے اسلام کی وضاحت کی جائے تو میرا اندازہ یہ ہے کہ ان میں سے تین چار ضرور اسلام لے آئیں گے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہاں کے لوگ پرتگیزی کے سوا کوئی زبان نہیں سمجھتے اور پرتگیزی زبان میں انہیں اسلام کی دعوت دینے والے قابل لوگوں کی یہاں بہت کمی ہے۔ چنانچہ جب پرتگال سے ہمارے یہاں تبلیغی جماعتیں آتی ہیں تو ان سے بڑا فائدہ ہوتا ہے لیکن دوسرے علاقوں سے آنے والی جماعتیں چونکہ یہاں کی زبان سے واقف نہیں ہوتیں، اس لئے ان کا فائدہ محدود ہوجاتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ جماعتیں دراصل یہاں کے عرب مسلمانوں میں اسی لئے کام کرتی ہیں کہ یہاں کے لوگ دعوت کیلئے تیار ہوں اور وہ پرتگیزی زبان میں کام کرسکیں۔ اس کے علاوہ میں نے عرض کیا کہ باہر سے بڑی تعداد میں پرتگیزی جاننے والے علماء یا داعیوں کا آنا تو زیادہ مشکل لگتا ہے، لیکن اگر کچھ نوجوان ایسے تیار ہوجائیں جو ہمارے یہاں آکر تعلیم حاصل کریں اور پھر اپنے ملک میں جا کر کام کریں تو انشاء اللہ بہت مفید ہوسکتا ہے۔

ابوبکر صاحب کی زبان سے یہ واقعات اور حالات سن کر دل میں یہ احساسِ جرم پیدا ہوا کہ ہم غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت و تبلیغ کا کوئی ایسا نظام نہیں بنا سکے، جس کے ذریعے دنیا کے مختلف خطوں میں رہنے والوں کو اسلام کی روشنی دکھانے کا کوئی مؤثر انتظام ہو۔ جماعتیں، ادارے اور انجمنیں تو بہت سی ہیں، لیکن خاص اس مقصد کیلئے کوئی قابل ذکر ادارہ عالمی سطح پر موجود نہیں ہے۔ کہنے کو تو میں نے کہہ دیا کہ برازیل کے کچھ نوجوان ہمارے یہاں تعلیم کیلئے آجائیں تو بڑا فائدہ ہوسکتا ہے، لیکن ہماری حکومتوں کی طرف سے دینی مدارس میں باہر کے ملکوں سے آنے والے طلبہ کے لیے اتنی پابندیاں عائد کردی گئی ہیں کہ

ان کیلئے تعلیمی ویزا حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے اور اس مسئلے سے ہم دن رات دوچار رہتے ہیں۔ کیونکہ مسلمان حکومتوں کی ترجیحات میں اسلام کی دعوت کی ضرورت کسی نچلی سے نچلی سطح پر بھی کوئی مقام نہیں رکھتی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ ۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا خاص کرم اور اسلام کی مقناطیسی کشش ہے جو ان جیسے لوگوں کو وسائل کے فقدان کے باوجود اسلام کی طرف کھینچ رہی ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ہماری طرف سے کوئی مؤثر کوشش موجود نہیں ہے۔

ریوڈی جنیرو شہر میں مسلمانوں کی تعداد ساؤپالو کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ سارے علاقے میں کل پچاس مسلم گھرانے آباد ہیں، اس لئے یہاں ابھی تک کوئی باقاعدہ مسجد نہیں تھی، البتہ جماعت کیلئے دو ایک عارضی مصلے بنے ہوئے تھے۔ اب کویت کی تمویل سے ایک اچھی مسجد تعمیر ہوئی ہے۔ جس کے ساتھ اسلامی مرکز بنانے کا بھی پروگرام ہے اور بچوں کی تعلیم کیلئے ایک مدرسہ بھی۔ اس غرض کیلئے ایک جمعیت ”الجمعیۃ الخیریۃ الاسلامیۃ“ کے نام سے قائم ہے۔ اس کے صدر جناب زین العابدین نے جو لبنان کے باشندے ہیں، ہمیں اس مسجد میں آنے کی دعوت دی۔ مسجد کی تعمیر تو بڑی حد تک مکمل ہو چکی ہے، لیکن اس کی ملحقہ عمارتیں جو اسلامی مرکز اور مدرسے کے طور پر استعمال ہونی ہیں، ابھی زیر تعمیر ہیں، بلکہ اُنکی تعمیر فنڈز کی کمی کی وجہ سے رُکی ہوئی ہے۔ جمعیت کے صدر اور سیکریٹری جناب سامی صاحب نے بتایا کہ اب بھی یہاں درسِ قرآن اور درسِ حدیث وغیرہ کا سلسلہ قائم ہے اور بچوں کے لئے ہفتہ وار تربیتی پروگرام بھی ہوتے ہیں لیکن تمام حالات دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ یہ کام یہاں بہت ابتدائی مراحل میں ہے اور ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ جو حضرات اس کام میں کوئی تعاون کرنا چاہیں ان کیلئے ٹیلیفون نمبر یہ ہیں ۰۰۵۵۲۱۲۲۴۱۰۷۹ اور ۰۰۵۵۲۱۹۳۷۴۸۶۳۶۔ میں نے نمازِ ظہر اسی مسجد میں پڑھائی، اور دیکھا کہ بمشکل ایک صف بن سکی۔

ریوڈی جنیرو کا بڑے ترقی یافتہ شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ ابوبکر صاحب نے بتایا کہ

''ریو'' کے معنی پرتگیزی زبان میں دریا کے ہیں، اور ''جنیرو'' جنوری کے مہینے کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ علاقہ جس میں سمندر ایک دریا کی سی صورت اختیار کر گیا ہے۔ پرتگالیوں نے جنوری میں دریافت کیا تھا اس لئے اس کا نام ریو ڈی جنیرو رکھ دیا گیا جو تقریباً دو صدی تک برازیل کا دارالحکومت رہا ہے۔ بعد میں جب دارالحکومت کیلئے نیا شہر برازیلیا تعمیر کیا گیا تو دارالحکومت اُدھر منتقل ہو گیا۔ ریو میں قدرتی حسن ساؤ پالو سے کہیں زیادہ ہے۔ ہمارا قیام اس کے ایک خوبصورت ساحلی علاقے میں واقع ونڈسر ہوٹل میں ہوا۔ جہاں بائیسویں منزل کے کمرے سے خم کھاتی ہوئی ساحلی سڑک، اُس کے دائیں جانب اونچی اونچی عمارتیں اور بائیں طرف ساحل سے ٹکراتی ہوئی بحر اوقیانوس کی موجیں ہر وقت نظر کے سامنے تھیں۔ ریو میں اور بھی کئی ساحلی علاقے ہیں جن میں سے ہر ایک اپنا منفرد حسن رکھتا ہے۔ ہر ساحلی علاقے میں سرسبز پہاڑیاں دور تک پھیلی نظر آتی ہیں۔ ابوبکر صاحب ہمیں ایک ساحلی علاقے Pedrada Gava میں لے گئے۔ یہاں سمندر کے کنارے ہر پہاڑی کی ساخت کچھ انوکھی قسم کی ہے۔ کہیں پہاڑی کی چوٹی ایک گنبد کی سی شکل بنائے ہوئے ہے کہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑی کے اوپر کوئی تاج رکھا ہے۔ ان پہاڑیوں کی چوٹی سے سمندر ایک ہلالی شکل میں نظر آتا ہے اور اس کے گرد سبزہ و گل سے لدے ہوئے پہاڑ اور وادیاں قدرت کی صناعی کا عجیب منظر پیش کرتی ہیں۔ **فتبارک اللہ احسن الخالقین۔**

ابوبکر صاحب نے گاڑی ہی میں شہر کا ایک چکر بھی لگوایا اور اُس کی خاص خاص عمارتیں دکھائیں، جن میں سے ایک عمارت کے بارے میں جو دور سے عجیب الخلقت نظر آ رہی تھی، یہ بتایا کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا فٹ بال اسٹیڈیم ہے۔ یہاں عمارتوں کا انداز بھی کچھ منفرد سا ہے، اور ان کا مجموعی رُوکار ایک ترقی یافتہ مگر انوکھے شہر کا نظارہ کراتا ہے۔

برازیل تو پانامہ جاتے ہوئے میرے راستے کی ایک منزل تھی جہاں قدرے فراغت ذہن کے ساتھ چار دن گزارنے کا موقع ملا اور یہ چار دن یہاں کے حالات معلوم کرنے اور دنیا کے چھٹے براعظم کے سب سے بڑے ملک کی سیر میں گذر گئے جس میں اس سے پہلے

کبھی جانا نہیں ہوا تھا۔

پانامہ میں

۳۰ر ذیقعدہ کو جو اتفاق سے اکتوبر کی بھی ۳۰ تاریخ تھی، میں دن کے ساڑھے بارہ بجے ریوڈی جینرو کے ہوائی اڈے پر ظہر کی نماز پڑھ کر کوپا ایئر لائنز کے طیارے میں پانامہ کیلئے روانہ ہوا۔ یہ ساڑھے چھ گھنٹے کا سفر تھا، کوپا ایئر لائنز پانامہ کی قومی ایئر لائنز ہے اور وسطی اور جنوبی امریکہ کے ممالک میں اُس کا نیٹ ورک خاصا وسیع ہے۔ لیکن جہاز چھوٹے اور سروس معمولی درجے کی ہے۔ یہ سفر شمال مغرب کی طرف تھا، ساڑھے چھ گھنٹے کی پرواز کا بڑا حصہ برازیل ہی کی سرزمین پر اُڑتے ہوئے گذرا اور آخر میں کولمبیا پر پرواز کر کے جہاز وقت سے کچھ پہلے ہی پانامہ سٹی کے ہوائی اڈے پر اُتر گیا۔ یہاں کے وقت کے مطابق اُس وقت شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے (یہاں کا وقت برازیل سے ایک گھنٹہ اور پاکستان سے دس گھنٹے پیچھے ہے)۔

میرے میزبانوں نے ہوائی اڈے پر وی آئی پی لاؤنج کا انتظام کیا ہوا تھا، اس لئے ایئر پورٹ پر کوئی دِقت پیش نہیں آئی اور نمازِ عصر بھی آرام سے مل گئی۔ ہوائی اڈے کے اندر اور باہر محبت کرنے والوں کا جم غفیر منتظر تھا اور معلوم ہوا کہ جہاز کے وقت سے پہلے پہنچ جانے کی وجہ سے بہت سے لوگ ابھی راستے میں تھے اور ہوائی اڈے تک پہنچ نہیں پائے تھے۔ ان میں سے اکثر وہ تھے جنہوں نے اس سے پہلے کبھی مجھے نہیں دیکھا تھا اور میں نے ان کو نہیں دیکھا تھا لیکن صرف کتابوں اور انٹرنیٹ پر پڑھے اور سنے ہوئے مضامین اور بیانات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں تقریباً پندرہ ہزار کلومیٹر دور کے ایک شخص کیلئے محبت ڈال دی تھی جو ظاہر ہے کہ حب فی اللہ تھی اور جانبین کیلئے بڑی سعادت کی بات۔ لیکن ایسے مواقع پر ندامت بھی ہوتی ہے اور دل دل میں دعا بھی کرتا رہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس محبت اور حسن ظن کا اہل بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

پانامہ میں میرے داعی اور میزبان جناب سلیم الدین صاحب اور اقبال صاحب تھے۔

جو اصلاً پاکستانی ہیں اور عرصۂ دراز سے پانامہ میں تجارت کرتے ہیں اور یہاں کی دینی سرگرمیوں میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ سلیم الدین صاحب کئی سال سے مجھ سے رابطہ رکھے ہوئے تھے، انہی کے مکان پر قیام ہوا اور رات گئے تک ان کے گھر میں محبت کرنے والوں کا پُرکیف اجتماع رہا۔ اس کے بعد میں ایک ہفتہ پانامہ میں مقیم رہا اور یہ پورا ہفتہ انہی محبت کرنے والوں کے درمیان نہایت مصروف گذرا۔

پانامہ وسطی امریکہ کا آخری ملک ہے جس کے بعد جنوبی امریکہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ملک تقریباً تیس ہزار مربع میل کے رقبے میں ہے اور اس کا نقشہ بنایا جائے تو انگریزی کے حرف S کی شکل بنتی ہے۔ اس کے مشرق میں بحر اوقیانوس (Altantic Ocean) ہے، اور مغرب میں بحر الکاہل (Pacific Ocean) پانامہ سٹی جو اس کا دارالحکومت ہے، بحر الکاہل کے کنارے واقع ہے۔ یہ انتہائی سرسبز علاقہ پہاڑوں، سمندروں اور دریاؤں سے گھرا ہوا ہے اور بحر الکاہل کے کنارے پر خوبصورت اور فلک بوس عمارتوں نے اس کے حسن میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ پانامہ خط استواء سے بہت قریب ہے چنانچہ یہاں بارشیں بہت ہوتی ہیں، اور بارہ مہینے موسم ایک جیسا یعنی ہلکا گرم (تقریباً ۲۵ سے ۳۰ درجے تک) رہتا ہے اور طلوع و غروب کے اوقات میں بھی بہت کم فرق ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمیشہ بارہ گھنٹے کا دن اور بارہ گھنٹے کی رات۔ نمازوں کے اوقات بھی بہت کم بدلتے ہیں۔

کسی زمانے میں پانامہ مختلف غیر متمدن قوموں کا مرکز تھا جنہیں بعد میں امریکی انڈین کا نام دیا گیا۔ سولہویں صدی میں وسطی امریکہ کے دوسرے علاقوں کی طرح اس کو بھی اسپین نے اپنے قبضے میں لیا اور ۱۸۲۱ء میں یہ علاقہ اسپین سے آزاد ہو کر جنوبی امریکہ کے ملک کولمبیا میں شامل ہو گیا۔ پھر کولمبیا سے آزادی کی بھی کئی تحریکیں چلتی رہیں اور آخر کار نومبر ۱۹۰۳ء میں اُس نے کولمبیا سے الگ ہو کر ایک مستقل ملک کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس دوران یہاں اسپینی لوگ افریقیوں کو غلام بنا کر لائے، اور ان سے زراعت اور دوسرے محنت کے کام لئے۔ اس لئے یہاں مقامی باشندوں سے زیادہ افریقی نسل کے لوگ، اسپینی

اور یورپ اور ایشیا کے مختلف ممالک کے لوگ بھی آ کر آباد ہو گئے۔ اُنیسویں صدی کے آخر میں پانامہ کینال کی تعمیر کے وقت (جس کا تذکرہ انشاء اللہ آگے آنے والا ہے) بنگال اور عرب کے لوگ بھی بڑی تعداد میں یہاں آ کر آباد ہوئے۔ انہی لوگوں میں مسلمان بھی اچھی خاصی تعداد میں تھے۔

۱۹۲۴ء میں گجرات (ہندوستان) کی اسوات فیملی کے کچھ لوگ یہاں تجارت کیلئے آ کر آباد ہوئے اور دو سال بعد گجرات ہی کے ایک تاجر سلیمان بیکو صاحب نے پانامہ میں سکونت اختیار کی، اور انہوں نے ہی پانامہ میں سب سے پہلی باقاعدہ مسجد تعمیر کی جو اس وقت جامع مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بعد عربوں اور گجرات کے بہت سے خاندان یہاں آباد ہوتے رہے۔ سلیمان بیکو صاحب نے پانامہ میں مسجدوں کی تعمیر اور مکتبوں کے قیام میں بڑا حصہ لیا۔ ۱۹۸۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ اب پانامہ کی تیس لاکھ کی آبادی میں تقریباً ساڑھے چار ہزار مسلمان ہیں جن میں گجراتی مسلمانوں کی تعداد پانامہ سٹی میں زیادہ ہے، اور عربوں کی تعداد پانامہ کے دوسرے شہر کولون میں زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ پاکستانی مسلمانوں کی تعداد میں بھی اب اضافہ ہو رہا ہے۔ پورے ملک میں کل نو مسجدیں ہیں، جن میں سے دو بڑی مسجدیں پانامہ سٹی میں ہیں۔ ایک جامع مسجد اور دوسری مدینہ مسجد۔ دونوں مسجدیں بڑی شاندار ہیں، اور ان کے مینار دور سے نظر آتے ہیں۔ میری قیام گاہ سے قریب تر مدینہ مسجد تھی جس میں بیشتر نمازیں پڑھنے کا اتفاق ہوا، اور میرے قیام کے دوران ہر رات عشاء کے بعد انہی دو مسجدوں میں سے کسی نہ کسی میں میرا بیان ہوتا رہا۔ یہ بات واضح طور پر نظر آئی کہ ماشاء اللہ یہاں کے مسلمانوں نے اپنے دینی تشخص کو برقرار رکھنے کی قابلِ تعریف کوشش کی ہے۔ مسجدوں میں حاضری بھی اچھی ہوتی ہے اور ہر بیان میں لوگ بڑے شوق و ذوق کے ساتھ دور دور سے سفر کر کے شریک ہوئے۔

ماشاء اللہ یہاں کئی باقاعدہ علماء لوگوں کی دینی رہنمائی کیلئے موجود ہیں۔ ان میں سب

سے بڑے اور مقتدر عالم مفتی عبدالقادر صاحب ہیں جو ڈابھیل کے مدرسے سے پڑھے ہوئے ہیں، اور یہاں کے مسلمانوں کی رہنمائی میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے، اور ماشاء اللہ ان کی بات کو سب دل و جان سے تسلیم کرتے ہیں، اور یہاں مسلمانوں میں دینی فضا پیدا کرنے اور برقرار رکھنے میں ان کا کردار قابل تعریف ہے۔ کئی نوجوان علماء برطانیہ کے دارالعلوم بری یا لیسٹر میں حضرت مولانا سلیم دھورات صاحب کے مدرسے سے فارغ التحصیل ہیں۔ یہاں کے مسلمانوں نے انہی علماء کی مدد سے شہر سے دور ایک جگہ پر ایک دارالعلوم بھی قائم کیا ہے، جس کے معائنے کا بھی اتفاق ہوا۔ اس مدرسے میں فی الحال اردو، دینیات، عربی زبان، تاریخ اسلام، ابتدائی فقہ اور تجوید کی تعلیم دی جارہی ہے، اور درجہ بدرجہ اس کو آگے بڑھایا جارہا ہے۔ اس وقت اس میں بیالیس طالبعلم مقیم ہیں جن میں سے ایک طالبعلم جنوبی امریکہ کے ملک چلی اور ایک وینزویلا کا بھی ہے۔ اساتذہ میں ماشاء اللہ امنگ کے ساتھ کام کرنے کا جذبہ محسوس ہوا۔ مولانا افضل پٹیل صاحب نوجوان عالم ہیں اور مطالعے اور تحقیق کا ذوق رکھتے ہیں وہ میرے ساتھ زیادہ رہے اور ان کی تمام تر گفتگو کسی نہ کسی مسئلے سے متعلق رہی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ ان میں علم کی وہ لگن ہے جو ترقی کی کلید ہوا کرتی ہے۔ دوسرے بعض اساتذہ میں بھی اسی قسم کا جذبہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ یہ حضرات اپنے معاشرے کے مسائل کے بارے میں بھی فکرمند نظر آئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں میں برکت عطا فرمائیں۔ آمین

ایک مدرسہ طالبات کیلئے بھی شہر کے وسط میں قائم ہے، وہاں بھی حاضری ہوئی اور اُن کے نصاب اور نظام کو دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ماشاء اللہ اُس میں مسلمان بچیوں کی تعلیم کا بہت اچھا نظام موجود ہے، کچھ عالم خواتین ہندوستان کے طالبات کے مدارس سے پڑھ کر یہاں تعلیم دے رہی ہیں اور کچھ مرد اساتذہ پردے کے اہتمام کے ساتھ طالبات کو پڑھاتے ہیں۔

جن ملکوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ بچوں کی

تعلیم و تربیت ہے۔ یہ بچے اگر ملک کے عام تعلیمی اداروں میں تعلیم پاتے ہیں تو وہاں کا نصاب و نظام اور اس سے بھی بڑھ کر وہاں کا ماحول ان کی دینی نشو ونما کیلئے زہر قاتل کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے جب کبھی ان ملکوں میں جانا ہوتا ہے تو میں وہاں کے مسلمانوں سے یہ اپیل ضرور کرتا ہوں کہ وہ اپنی نئی نسل کے تحفظ کیلئے خود اپنے ایسے تعلیمی ادارے قائم کریں جن میں مروّجہ علوم کے ساتھ انہیں ضروری دینی معلومات بھی فراہم کی جائیں اور اس کے ساتھ اسکول کا مجموعی ماحول اور وہاں کی عام فضا میں بھی اسلامی رنگ ہو جو مغربی دنیا کی ناقابل برداشت خصوصیات سے بچوں کو محفوظ رکھ سکے۔ پانامہ میں بھی میں نے مختلف خطابات میں اس طرف اپنے بہن بھائیوں کو توجہ دلائی اور پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اسی فکر کے تحت یہاں کچھ مسلمانوں نے ایک مسلم اسکول کی بنیاد ڈالی ہے۔ اُس کے ذمہ دار حضرات نے اس اسکول میں بھی دعوت دی اور وہاں بھی حاضری ہوئی لیکن وہاں کا نظام اور ماحول دیکھ کر اور ذمہ داروں سے بات کر کے یہ اندازہ تو ہوا کہ ان حضرات کو اس مسئلے کی اہمیت کا احساس ہے لیکن ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ اسکول کو مطلوبہ معیار پر لانے اور اس سے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کیلئے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ بعد میں یہاں کے بااثر حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی بنانے پر بھی اتفاق ہوا جو اسکول کے ذمہ دار حضرات سے مل کر اس کے نصاب و نظام کو بہتر بنانے کی کوشش کرے۔

پانامہ کے دو ہی بڑے شہر ہیں، ایک پانامہ سٹی جو بحرالکاہل کے کنارے آباد ہے اور دوسرا کولون جو بحر اوقیانوس کے کنارے واقع ہے۔ کولون فری پورٹ ہونے کی وجہ سے خالص تجارتی شہر ہے اور مسلمانوں کی بھی ایک بڑی تعداد یہاں تجارت میں مشغول ہے جن میں بھاری تعداد عربوں کی ہے۔ جنہوں نے یہاں ایک شاندار مسجد تعمیر کی ہوئی ہے۔ مسجد کے امام و خطیب ایک مصری عالم ہیں۔ میرے میزبان سلیم الدین صاحب وغیرہ کی خواہش تھی کہ میں اس مسجد میں بھی خطاب کروں اور چونکہ یہاں سامعین اکثر عرب ہیں، اس لئے یہ خطاب عربی میں ہو۔ ان کے ذریعے جب امام صاحب کو میری آمد کا علم ہوا تو

انہوں نے ٹیلی فون پر مجھے جمعہ کے خطاب کی دعوت دی۔ پانامہ سٹی سے احباب کی ایک بڑی جماعت کاروں کے ایک قافلے کی شکل میں کولون کیلئے روانہ ہوئی اور تقریباً دو گھنٹے کے سفر کے بعد ہم کولون پہنچے تو جمعہ کا وقت قریب تھا۔ اس علاقے میں اونچے میناروں والی یہ خوبصورت مسجد دیکھ کر دل خوش ہوا۔ امام صاحب پہلے سے منتظر تھے۔ یہاں جمعہ سے پہلے میرا عربی میں خطاب ہوا۔ عربوں کی مساجد میں یہ عربی تقریر ہی جمعہ کا خطبہ بھی ہوتی ہے۔ یہ چونکہ ایک تجارتی شہر ہے اور اس میں تقریباً سب تاجر حضرات رہتے ہیں۔ اس لئے میرے خطاب کا بنیادی موضوع یہ تھا کہ ایک مسلمان تاجر کی کیا ذمہ داریاں ہیں اور ایک مسلمان کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ تجارتی مفادات کی دوڑ میں یہ بھول جائے کہ وہ کیوں اس دنیا میں آیا تھا؟ قرآن کریم نے بار بار مسلمانوں کو متنبہ فرمایا کہ ان کی مال و دولت انہیں اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ کر پائے۔ اسی طرح ایک مسلمان کا فریضہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان بنالے، بلکہ اس کے ذمہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کی دینی تربیت کا بھی انتظام کر کے انہیں دوزخ کی طرف جانے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرے۔ لہٰذا میں نے درخواست کی کہ ہر مسلمان اپنی روزانہ کی مصروفیات میں کچھ وقت اس کا کیلئے نکالے کہ سب گھر والے دین کی ضروری معلومات سے باخبر ہوں، اور ان کے دلوں میں آخرت کی فکر پیدا ہو۔ اس مسجد میں برصغیر کے کسی شخص کی یہ پہلی تقریر تھی۔ الحمدللہ! یہ گزارشات توجہ سے سنی گئیں۔ امام صاحب کی فرمائش پر جمعہ کی نماز بھی میں نے پڑھائی۔ نماز کے بعد مسجد کے ساتھ ملحق اسلامی مرکز کی کارگذاری سے بھی آگاہ کیا گیا، کچھ مقامی فقہی مسائل پر بھی گفتگو ہوئی اور ان حضرات نے بڑی محبت اور اکرام کا معاملہ کیا۔ جزاہم اللہ تعالیٰ خیرا۔

پانامہ کینال

پانامہ کی ایک اہم خصوصیت جو عالمی شہرت رکھتی ہے۔ پانامہ کینال ہے جسے دنیا کے عجائب میں بھی شمار کیا جاتا ہے۔ اس ملک میں آنے کے بعد یہ عجوبہ دیکھے بغیر جانا بڑی بدذوقی

پانامہ کینال کا ایک خوبصورت منظر

پانامہ کینال کا دلکش منظر

ہوتی، اس لئے میرے میزبانوں نے کینال دکھانے کا انتظام بھی پروگرام میں شامل کیا ہوا تھا۔ جناب اسلم پٹیل صاحب میرے قیام کے دوران اکثر اوقات بڑی محبت سے میرے ساتھ رہے تھے، وہی ہمیں اس کینال کے نظارے کے لیے لے گئے۔

اگر آپ دنیا کے نقشے پر نظر ڈالیں تو دنیا کے دو بڑے سمندروں بحراوقیانوس اور بحرالکاہل کے درمیان شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ کے دو بڑے براعظم حائل ہیں اور اس طرح دونوں سمندروں کے درمیان زیادہ تر مقامات پر سینکڑوں اور بعض جگہوں پر ہزاروں میل کا فاصلہ ہے۔ لیکن شمالی اور جنوبی امریکہ کے درمیان خشکی کی ایک پتلی سی بل کھاتی ہوئی پٹی نظر آتی ہے جو شمال سے جنوب کی طرف جاتے ہوئے بتدریج پتلی ہوتی گئی ہے۔ یہ میکسیکو سے شروع ہوتی ہے، اور پانامہ پر ختم ہوکر جنوبی امریکہ کے براعظم سے مل جاتی ہے۔ اس خشک پٹی پر جا کر بحراوقیانوس اور بحرالکاہل کا درمیانی فاصلہ کم ہوگیا ہے اور پانامہ میں ایک مقام پر یہ فاصلہ صرف پچاس میل رہ گیا ہے۔ بیسویں صدی سے پہلے اگر کوئی سمندری جہاز امریکہ کے مشرقی جانب سے مغرب کے کسی ملک جانا چاہتا تو اُسے اس چھوٹے سے خشک فاصلے کی وجہ سے پورے جنوبی امریکہ کا چکر لگا کر ہزاروں میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا، تب وہ امریکہ کے مغربی ساحل تک پہنچ پاتا تھا۔ جن ملکوں کو امریکہ کے مغرب میں تجارتی سفر کرنے پڑتے تھے ان کے دل میں خیال آیا کہ اگر اس پچاس میل کی خشک پٹی کو کسی طرح جہاز رانی کے قابل پانی میں تبدیل کردیا جائے تو بحراوقیانوس سے براہِ راست بحرالکاہل میں اُترنے کا آسان راستہ نکل آئیگا۔ اس وقت پانامہ کا علاقہ کولمبیا کے ماتحت تھا۔ ۱۸۶۹ء میں فرانس کے ایک انجینئر فرڈیننڈ نے بحراحمر اور بحرمتوسط کو ملانے کیلئے نہر سوئز تعمیر کی تھی (جو آج کل مصر کے پاس ہے)۔ اس کامیابی کو مدنظر رکھتے ہوئے کولمبیا کی حکومت نے ۱۸۷۸ء میں فرانس کی ایک کمپنی کو یہ علاقہ جہاں دونوں سمندروں کے درمیان نہر بنائی جاسکتی تھی، ننانوے سال کی لیز پر دے کر اُسے نہر تعمیر کرنے کا حق (Concession) دیا۔ اس کمپنی نے فرڈیننڈ کی مدد سے ۱۸۸۲ء میں اس علاقے میں کام

شروع کیا جس میں سترہ ہزار مزدور کھدائی پر مامور کیے گئے۔ یہ مزدور زیادہ تر ویسٹ انڈیز کے تھے، لیکن یہ منصوبہ جس کیلئے انسانوں کی اتنی بڑی تعداد کو کام پر لگایا گیا تھا اور جس میں نہر سویز کی کامیابی کے پیش نظر فرانس کے بڑے بڑے سرمایہ داروں نے کمپنی کے حصص خرید کر اندھادھند سرمایہ لگا دیا تھا، آخر کار ناکام ہوا۔ اس لئے کہ یہ علاقہ جس میں کام ہو رہا تھا، نہر سویز کی طرح خشک علاقہ نہیں تھا، یہاں بارشیں بہت ہوتی تھیں اور چند گھنٹوں کی بارش مہینوں کے کام کو تہس نہس کر ڈالتی تھی، دوسرے اس علاقے میں زرد بخار (Yelow Fever) کی وبائیں بار بار پھوٹتیں، اور کام کرنے والوں کی جان لے لیتیں۔ یہاں تک کہ یہاں چھ ہزار سے زائد انسانوں کو دفن کرنا پڑا اور آخر کار اس فرانسیسی کمپنی نے ہتھیار ڈال کر کام بند کر دیا۔

۱۹۰۳ء میں پانامہ کولمبیا سے آزاد ہو کر ایک مستقل ملک بن گیا، لیکن دونوں سمندروں کو ملانے کی کوشش فرانس کی ناکامی پر ختم نہیں ہوئی، بلکہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے ۱۹۰۶ء میں پانامہ کی حکومت سے ایک معاہدے کے تحت یہاں نہر تعمیر کرنے کیلئے متعلقہ زمین لیز پر حاصل کی اور فرانسیسی تجربے کی ناکامی کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک نیا منصوبہ بنایا۔ فرانسیسی کمپنی کا منصوبہ یہ تھا کہ یہاں ایک خندق کھود کر دونوں سمندروں کے پانی ایک دوسرے میں مدغم کر دیے جائیں، لیکن چونکہ یہ منصوبہ ناکام ہوا، اس لئے امریکہ نے ایک اور پلان بنایا اور یہ کہ دونوں سمندروں کو مدغم کرنے کے بجائے یہاں میٹھے پانی کی ایک مصنوعی نہر تعمیر کی جائے۔ اس علاقے میں ایک قدرتی دریا (Chagres River) پہلے سے موجود تھا، امریکیوں نے اس دریا پر بند باندھ کر ایک مصنوعی نہر تعمیر کی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ جس علاقے میں یہ نہر تعمیر کی گئی، وہ دونوں سمندروں کی سطح سے چھبیس میٹر بلند تھا، لہذا جہاز اگر بحر اوقیانوس میں ہے تو اُسے اس نہر میں لانے کیلئے چھبیس میٹر اونچا کیسے کیا جائے، اور جب وہ نہر عبور کر کے بحر الکاہل کے پاس پہنچے تو اُسے نیچے کر کے سمندر کی سطح تک کیسے لایا جائے؟ یہی مسئلہ ان جہازوں کیلئے بھی تھا جو بحر الکاہل سے بحر اوقیانوس میں

جانا چاہیں۔ اس مسئلے کا جو حل نکالا گیا وہی پانامہ کینال کا عجوبہ سمجھا جاتا ہے۔ حل یہ نکالا گیا کہ جب جہاز بحر اوقیانوس میں اُس جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں سے نہر شروع ہوتی ہے تو وہاں اُسے ایک ایسے لمبے چوڑے حوض میں داخل کر دیا جاتا ہے جس کے دونوں طرف بڑے مضبوط گیٹ لگے ہوئے ہیں۔ جب سمندر سے جہاز اس حوض میں آجاتا ہے تو دونوں گیٹ بند کر دیے جاتے ہیں اور اُس حوض میں اتنا پانی بھرا جاتا ہے کہ وہ نہر کی سطح کے برابر ہو جائے، اس نئے پانی کے سہارے جہاز خود بخود بلند ہو کر نہر کی سطح پر پہنچ جاتا ہے۔ اُس وقت نہر کی طرف کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے، اور جہاز نہر عبور کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ پھر جب وہ بحر الکاہل کے قریب پہنچتا ہے تو وہاں پھر ایک حوض میں داخل ہوتا ہے جو داخلے کے وقت نہر کی سطح کے برابر اور سمندر کی سطح سے بلند ہوتا ہے۔ یہاں دونوں طرف کے گیٹ بند کر کے اُس حوض سے پانی نکالا جاتا ہے جس کے ذریعے جہاز نیچے جانا شروع ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ سمندر کی سطح پر آجاتا ہے تو سمندر کی طرف کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے اور جہاز بحر الکاہل میں داخل ہو جاتا ہے۔ جہاز کے کبھی اوپر اور کبھی نیچے ہونے کا یہ عمل تین مختلف مقامات پر تین مرحلوں میں مکمل ہوتا ہے، اور ہر مرحلے پر وہ کسی بڑے حوض میں داخل ہو کر پانی بھرنے یا نکالنے کا انتظار کرتا ہے جس کے ذریعے اُس کی سطح اونچی یا نیچی ہوتی رہتی ہے۔ ان تینوں مراحل سے ہر اُس جہاز کو گزرنا پڑتا ہے جو بحر اوقیانوس سے بحر الکاہل میں جانا چاہتا ہو یا بحر الکاہل سے بحر اوقیانوس میں۔ اس طرح پچاس میل کا یہ فاصلہ اس مصنوعی نہر کے ذریعے اوسطاً چوبیس سے تیس گھنٹے میں طے ہو جاتا ہے، حالانکہ اگر یہ نہر نہ ہوتی تو دوسرے سمندر تک پہنچنے کیلئے اُسے پورے جنوبی امریکہ کا چکر لگا کر تقریباً ایک مہینہ خرچ کرنا پڑتا۔

چونکہ یہ نہر جس کا افتتاح نومبر ۱۹۱۴ء میں ہوا۔ امریکہ نے خاص معاہدہ کے تحت بنائی تھی، اس لئے وہی ۱۹۹۹ء تک اُس پر قابض رہا۔ گذرنے والے تمام جہازوں سے نہر کے استعمال کی بھاری فیس وہی وصول کرتا اور پانامہ کو معمولی رائلٹی دیتا تھا۔ پانامہ کی

حکومت اور امریکہ کے درمیان اس نہر پر کنٹرول کے سلسلے میں عرصے تک تنازعہ چلتا رہا، یہاں تک کہ ایک موقع پر دونوں ملکوں نے سفارتی تعلقات بھی توڑ لئے اور پھر مصالحتی کوششوں کے نتیجے میں امریکہ کو قبضہ چھوڑنے کیلئے ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کی حتمی تاریخ دیدی گئی اور اس کے بعد سے یہ نہر پانامہ ہی کے کنٹرول میں ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک جہاز سے نہر عبور کرنے کا کرایہ دو لاکھ ڈالر وصول کیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ طلسماتی گذرگاہ پانامہ کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔

سیاحوں کو اس نہر میں جہازوں کے اوپر اُٹھنے اور نیچے جانے کا یہ عمل دکھانے کیلئے نہر کے بیچ والے حوض کے اوپر ایک پلیٹ فارم بنادیا گیا ہے، جہاں سے نہر کا منظر بھی دور تک نظر آتا ہے اور وہ حوض بالکل سامنے ہوتے ہیں جن میں جہازوں کو دونوں طرف سے بند لگا کر اوپر اُٹھایا جاتا ہے، یا نیچے لایا جاتا ہے۔ ہمارے سامنے ایک جہاز اس حوض میں آیا جس کی سطح نہر کے اگلے حصے سے نیچی تھی، حوض میں کھڑے ہونے کے بعد دونوں طرف کے دروازے بند کردیئے گئے اور حوض میں کئی نالوں کے ذریعے پانی بھرنا شروع کیا گیا، تقریباً آدھے گھنٹے میں دیکھتے ہی دیکھتے حوض کی سطح بلند ہوئی اور اُس کے ساتھ ہی جہاز اوپر اُٹھتا چلا گیا، یہاں تک کہ وہ نہر کے اگلے حصے کے برابر آ گیا، اس موقع پر اُس طرف کا دروازہ کھول دیا گیا، اور جہاز پھر روانہ ہوگیا۔ یہاں ایک میوزیم بھی بنایا گیا جس میں اس نہر کی پوری تاریخ بتائی گئی ہے اور ایک مقام پر سیاحوں کو ایک جہاز کے ماڈل میں سوار کر کے مصنوعی طور پر اُسے نہر سے گزارنے اور جہاز کو اوپر اور نیچے لانے کا عمل دکھایا جاتا ہے، اور انسان ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ خود جہاز کے ذریعے اس عمل میں شریک ہے۔

پانامہ انتہائی سرسبز ملک ہے اور خودرو درختوں کے جنگلوں میں بسا ہوا ہے۔ برازیل کی طرح یہاں بھی آم اور دوسرے پھلوں کے درخت جگہ جگہ خود اُگے ہوئے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں بہت ہیں۔ ایک علاقے میں بہت اونچے اور ٹھنڈے پہاڑ بھی ہیں۔ ایک طرف بحر اوقیانوس اور دوسری طرف بحر الکاہل سے نکلی ہوئی چھوٹی چھوٹی خلیجیں سرسبز

پہاڑوں کے درمیان سے جھانکتی نظر آتی ہیں۔ ساحلی علاقے بھی بہت سے ہیں۔ انہی علاقوں میں سے ایک علاقہ سانتا کلارا کہلاتا ہے۔ ہمارے میزبانوں نے یہاں ایک خوبصورت بنگلے میں ایک رات گزارنے کا پروگرام بھی رکھا تھا۔ یہ بنگلہ ان ہی سلیمان بیکو صاحب مرحوم کی اہلیہ کا ہے جنہوں نے پانامہ میں سب سے پہلی مسجد تعمیر کی تھی اور جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ انہوں نے بڑی محبت سے یہاں ہمیں ایک دن ٹھہرنے کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ احباب کے ایک اچھے خاصے قافلے کے ساتھ ہم یہاں پہنچے۔ یہ کشادہ اور خوبصورت بنگلہ ساحل سمندر کے سامنے بلندی پر واقع ہے اور یہاں سے بحرالکاہل کی نیلگوں موجوں کا منظر نہایت دلآویز ہے۔ بحرالکاہل دنیا کا سب سے بڑا اور سب سے گہرا سمندر ہے جو مشرق سے مغرب تک نہ جانے کتنے ملکوں میں پھیلا ہوا ہے۔ میں نے سب سے پہلے اس کا نظارہ انڈونیشیا اور ملائیشیا میں کیا تھا۔ پھر سان فرانسسکو اور لاس اینجلس میں، پھر جاپان میں اور اس کے بعد آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں اور اب پانامہ میں بھی وہی سمندر سامنے تھا۔ ہزاروں میل میں پھیلا ہوا یہ سمندر صدیوں سے قرآنِ کریم کی اس آیت کی یاد دلا رہا ہے کہ:

وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْماً طَرِيًّا
وَتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ
مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ.

(سورۃ النحل۔ ١۴)

''اور وہی ہے جس نے سمندر کو کام پر لگایا، تا کہ تم اُس سے تازہ گوشت کھاؤ اور اُسے سے وہ زیورات نکالو جو تم پہنتے ہو، اور تم دیکھتے ہو کہ اُس میں کشتیاں پانی کو چیرتی ہوئی چلتی ہیں تا کہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو اور تا کہ شکر گزار بنو۔''

ایک پر کیف رات سمندر کے کنارے گذارنے کے بعد اگلے دن ہماری واپسی ہوئی، اور اس واپسی کے دوران بھی کئی پروگرام نمٹاتے ہوئے ہم پانامہ سٹی پہنچے اور اگلے دن پیر ۲۰ر شوال ۱۴۲۹ھ (۲۰ر اکتوبر ۲۰۰۸ء) کی صبح ہمیں ٹرینیڈاڈ روانہ ہونا تھا۔ یہ ایک ہفتہ محبت کرنے والوں کے درمیان پلک جھپکتے گزر گیا، لیکن ان احباب کے خلوص و محبت کی بنا پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ساتھ سالہا سال کی رفاقت ہے۔ رخصت کے وقت تک ایئرپورٹ پر بھی ان حضرات کا مجمع موجود تھا۔ جس نے محبت بھرے جذبات کے ساتھ ہمیں الوداع کہا۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو دین و دنیا کی صلاح و فلاح سے نوازیں اور اس محبت کو خالص لوجہ اللہ قرار دے کر جانبین کو اس کی برکات سے سرفراز فرمائیں۔ آمین ثم آمین۔

ٹرینیڈاڈ میں

ٹرینیڈاڈ کیلئے روانہ ہوئے تو پانامہ کی وہی کوپا ایئرلائنز تھی، مگر جہاز اُس سے بھی چھوٹا تھا جس میں ہم برازیل سے پانامہ آئے تھے۔ البتہ اس مرتبہ پرواز صرف چار گھنٹے کی تھی اور جب ہم ٹرینیڈاڈ کے دارالحکومت پورٹ آف اسپین کے ہوائی اڈے پر اُترے تو عصر کا وقت تھا۔ میزبانوں نے امیگریشن اور کسٹم کے مراحل سے جلدی فارغ کرنے کا انتظام کر رکھا تھا۔ (ٹرینیڈاڈ ان گنے چنے ملکوں میں سے ہے جہاں پاکستانیوں کو ایئرپورٹ پر ہی ویزا مل جاتا ہے) باہر متعدد مقامی علماء اور میرے اصل داعی جناب شیراز صاحب استقبال کیلئے موجود تھے۔ ان کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو کر ایک قریبی مسجد میں نمازِ عصر ادا کی، اور پھر قیام گاہ تک پہنچنے سے پہلے ہی مغرب کی نماز ایک اور مسجد میں پڑھی۔ اس رات آرام کے سوا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ لہٰذا شیراز صاحب سے یہاں کے حالات معلوم کرنے ہی میں وقت گذر گیا۔

ٹرینیڈاڈ ویسٹ انڈیز کے ملکوں میں دوسرا بڑا ملک ہے جو دو جزیروں پر مشتمل ہے۔ ایک کا نام ٹرینیڈاڈ ہے اور دوسرے کا ٹوبیگو۔ اسی لئے ملک کا پورا نام ٹرینیڈاڈ اینڈ

ٹوبیگو ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۴۹۸ء میں جب کولمبس (جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُس نے امریکہ کا براعظم دریافت کیا تھا) اپنے تیسرے بحری سفر میں یہاں پہنچا تو یہ اراواک قوم کا مسکن تھا۔ کولمبس کے ذریعے اسپین کی حکومت نے اس پر قبضہ کر کے اس قوم کا بیج ہی مار دیا اور تین سو سال تک اس کی طرف کوئی خاص توجہ بھی نہیں دی۔ ۱۷۹۷ء میں برطانیہ نے اس پر حملہ کیا تو اسپین کی حکومت نے ہتھیار ڈال کر یہ جزیرہ اُس کے حوالے کردیا۔ چونکہ یہاں کے اصل باشندے فنا ہو چکے تھے، اس لئے یہاں تمباکو وغیرہ کی کاشت کیلئے افریقہ وغیرہ سے غلاموں کو لاکر بسایا گیا، اور ان سے کاشت کرائی گئی۔ برطانیہ ٹوبیگو میں بھی اسی طرح اپنی حکومت چاہتا تھا لیکن ۱۷۸۱ء میں فرانس نے ٹوبیگو پر قبضہ کر کے اُسے اپنی نوآبادی بنالیا۔ لیکن ۱۸۰۲ء میں برطانوی حکومت نے فرانسیسیوں کو مار بھگایا اور ۱۸۹۹ء میں اُسے ٹرینیڈاڈ کا ایک حصہ بنادیا گیا۔ جب ۱۸۲۰ء میں رسمی غلامی کا خاتمہ ہوا تو برطانوی حکومت نے یہاں ہندوستان سے بہت سے لوگ درآمد کئے جو یہاں محنت کے کام کرسکیں اس طرح یہاں ہندوستانی ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادی شروع ہوئی۔ چنانچہ یہاں ہندوستانی اصل رکھنے والے آبادی کا اکتالیس فیصد حصہ ہیں۔ ۱۹۲۳ء سے یہاں برطانیہ سے آزاد ہونے کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۲ء میں یہ ملک آزاد ہوکر مستقل ملک کی حیثیت اختیار کرگیا۔ اس دوران یہاں دنیا کے دوسرے خطوں سے بھی لوگ آکر آباد ہوئے۔ اس وقت ملک کی کل آبادی گیارہ لاکھ ہے۔ جس میں ایک لاکھ پینتیس ہزار مسلمان شامل ہیں۔ اور اس چھوٹے سے ملک میں ماشاءاللہ ایک سو بتیس مسجدیں ہیں اور اچھی خاصی آباد رہتی ہیں۔

اسلام قبول کرنے والے

اسلام قبول کرنے کا اوسط بھی ٹرینیڈاڈ میں قابل ذکر ہے۔ خود میرے میزبان جناب شیراز صاحب نومسلم ہیں، ان کے والد ہندو تھے، لیکن والدہ کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی توفیق دی اور انہی کے زیر اثر یہ بھی مسلمان ہوئے اور ملک کی دینی سرگرمیوں میں ان کا بڑا حصہ

رہتا ہے۔ اس ملک کی ایک وزیر مملکت مادام فاطمہ بھی نومسلم تھیں اور اپنے اسلام لانے کا عجیب واقعہ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا جو قاہرہ کے رسالے منبر الاسلام میں شائع ہوا تھا۔ ان کا اصل نام مک ڈیوڈسن (Mik Davidson) تھا، مگر اسلام لانے کے بعد انہوں نے اپنا نام فاطمہ رکھا تھا۔ وہ کہتی ہیں کہ اگرچہ میں ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوئی اور ۹ مارچ ۱۹۵۰ء کو میرے گھر والوں نے مجھے راہبہ کے طور پر ایک عیسائی خانقاہ میں داخل کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اُس دن جب میں صبح کو نیند سے بیدار ہوئی تو میں نے اپنے کانوں میں ''اللہ اکبر اللہ اکبر'' کی آواز گونجتی ہوئی سنی۔ اس آواز نے میرے پورے وجود میں لرزہ طاری کردیا۔ مجھے اس وقت اس آواز کی حقیقت معلوم نہیں تھی، لیکن میں نے اس کے بعد عیسائی خانقاہ میں داخل ہونے سے انکار کردیا۔ اس کے بعد کئی سال میں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کی طلب میں گذارے، یہاں تک کہ مجھے قرآن کریم کے ترجمے کا ایک نسخہ مل گیا اور میرے دل نے گواہی دی کہ یہ برحق ہے۔ اسی دوران میری ملاقات پاکستان کے ایک عالم مولانا صدیق صاحب اور ہندوستان کے ایک عالم شیخ انصاری سے ہوئی۔ ان سے میں نے اپنے موجودہ عقائد کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ ان عقیدوں کی وجہ سے بفضلہٖ تعالیٰ تم مسلمان ہو۔ اگرچہ میں نے باقاعدہ اسلام قبول کرنے کا اعلان ۱۹۷۵ء میں کیا، لیکن درحقیقت میں دل سے اُسی وقت مسلمان ہوچکی تھی جب اللہ اکبر کی آواز میرے کانوں میں گونجی تھی اور قرآنِ کریم کا ترجمہ پڑھنے کے بعد میرا دل ایمان کی نعمت سے لبریز ہوچکا تھا، اور اس میں حضورِ نبی کریم ﷺ کی محبت اور عظمت کا سکہ بیٹھ چکا تھا۔ پہلے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ٹرینیڈاڈ میں اسلام صرف ہندوستانیوں کا دین ہے، لیکن میرے اسلام لانے کے بعد ٹرینیڈاڈ کی دوسری قوموں بالخصوص افریقی نسل کے لوگوں نے بھی اسلام قبول کیا۔ یہاں تک کہ آبادی میں مسلمانوں کا اوسط تیرہ فی صد تک پہنچ گیا، جبکہ کیتھولک عیسائیوں کا اوسط تیرہ فیصد، پروٹسٹنٹ کا ۲۷ فیصد اور ہندوؤں کا ۶ فیصد ہے اور باقی ۳۲ فیصد میں دوسرے کئی مذاہب شامل ہیں۔

MESQUITA DO BRA

ساؤ پالو (برازیل) کی ایک مسجد

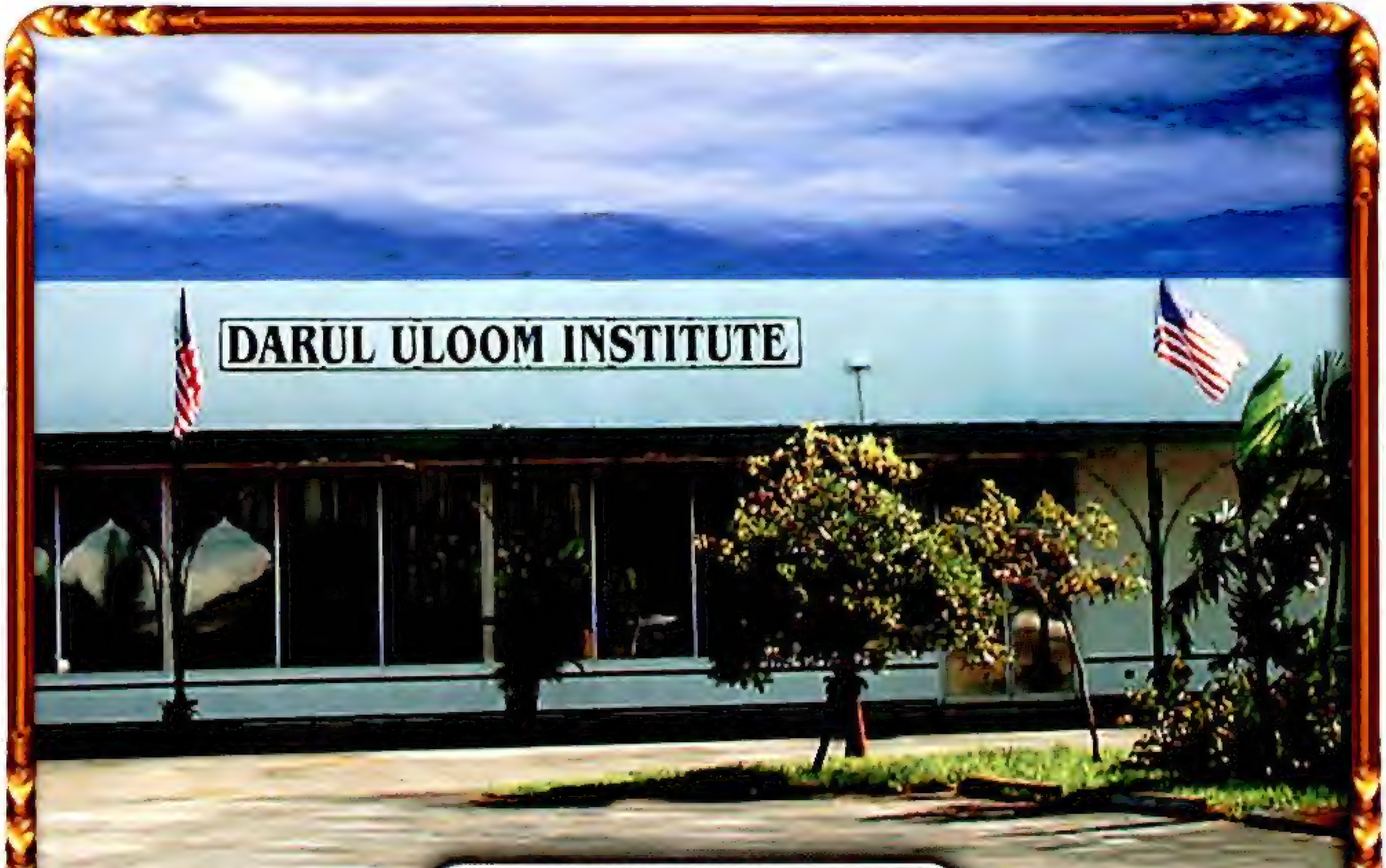
DARUL ULOOM INSTITUTE

دارالعلوم ٹرینیڈاڈ (لاطینی امریکہ)

شیراز صاحب نے بتایا کہ اب بھی لوگوں کے اسلام قبول کرنے کا سلسلہ جاری ہے اور ہر اسلامی سینٹر اور مسجد میں وقفے وقفے سے غیر مسلموں کی ایک اچھی خاصی تعداد مشرف بہ اسلام ہوتی ہے اور مفتی وسیم صاحب نے جو ٹی وی چینل جاری کر رکھا ہے، اُسے دیکھ کر بھی لوگ مسلمان ہونے کیلئے آتے ہیں۔

دارالعلوم ٹرینیڈاڈ

ٹرینیڈاڈ میں ماشاء اللہ علماء دین کی بھی خاصی تعداد ہے۔ ہمارے دارالعلوم کراچی سے بھی کئی علماء پچھلے چند سالوں میں فارغ التحصیل ہو کر وہاں پہنچے ہیں، لیکن یہاں کے علماء میں سب سے زیادہ شہرت مفتی وسیم صاحب کی ہے جن کے آباؤ اجداد ہندوستان کے تھے اور انہوں نے جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن سے فراغت حاصل کی ہے، میرے ٹرینیڈاڈ کے سفر میں ان کی تحریک کو بھی بڑا دخل تھا۔ بلکہ میں نے انہی کے کہنے پر یہاں آنے کی دعوت منظور کی تھی۔ وہ یہاں ایک بڑا دارالعلوم چلا رہے ہیں۔ چنانچہ ٹرینیڈاڈ پہنچنے کے اگلے ہی دن پہلا پروگرام اسی دارالعلوم میں تھا جو پورٹ آف اسپین کے شہر سے کچھ فاصلے پر ایک پُر فضا مضافاتی علاقے میں واقع ہے۔ یہ دارالعلوم ۱۹۸۴ء میں مفتی سبیل علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قائم کیا تھا اور ۱۹۹۶ء میں ان کی وفات کے بعد سے مفتی وسیم صاحب اس کے مہتمم ہیں اور اس میں دورۂ حدیث تک دینی علوم کے ساتھ میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کی سطح تک کے تمام مروّجہ علوم پڑھانے کا بھی معیاری انتظام موجود ہے اور اس کے پورے نظام میں دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور کے مشورے اور ہدایات شامل رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ایک دارالافتاء بھی ہے اور فتویٰ کی تربیت کا بھی انتظام ہے۔ ماشاء اللہ عمارتیں بھی بہت صاف ستھری اور خوبصورت ہیں جن سے حسنِ انتظام واضح طور پر جھلکتا ہے۔ ان خصوصیات کی وجہ سے یہ نہ صرف ویسٹ انڈیز، بلکہ پورے لاطینی امریکہ میں سب سے بڑا ادارہ ہے جس میں اس وقت تقریباً پانچ سو طلبہ اور تقریباً ڈیڑھ سو طالبات زیرِ تعلیم ہیں، جن میں پورے ویسٹ انڈیز کے علاوہ شمالی اور جنوبی امریکہ کے مختلف خطوں سے آئے

ہوئے طلبہ بھی شامل ہیں۔ مفتی وسیم صاحب کے علاوہ مولانا شیراز علی صاحب اور مولانا عبدالسلام صاحب بھی اس کے سرگرم اساتذہ اور منتظمین میں شامل ہیں۔ دارالعلوم کے تحت نکاح خوانی، حلال گوشت کی نگرانی، رؤیت ہلال وغیرہ کے مسائل میں بھی مسلمانوں کی رہنمائی کا اہتمام کمیٹیوں کی شکل میں کیا جاتا ہے۔ مفتی وسیم صاحب نے خود اپنا ایک ٹی وی چینل بھی جاری کیا ہوا ہے جو لوگوں کو دینی معلومات فراہم کرنے کیلئے مخصوص ہے اور لوگوں نے بتایا کہ یہ چینل نہ صرف مسلمانوں میں مقبول ہے، بلکہ جیسے کہ پہلے عرض کیا گیا، غیر مسلم اس چینل کے ذریعے اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کر کے مسلمان ہونے کیلئے آئے اور بفضلہ تعالیٰ مسلمان ہوئے۔

دارالعلوم کی مسجد بڑی شاندار ہے، اور جب ہم اس میں پہنچے تو وہ سامعین سے بھری ہوئی تھی۔ اگرچہ یہاں کے مسلمانوں میں اکثریت اُن کی ہے جن کے آباؤ اجداد ہندوستان سے آئے تھے، لیکن رفتہ رفتہ وہ اپنی زبان بھول چکے ہیں، اس لئے یہاں اردو سمجھنے والے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ دارالعلوم کے طلبہ اور اساتذہ اپنی دینی تعلیم کی بنا پر اردو سے کچھ آشنا ہیں، لیکن بولنے پر انہیں بھی بہت کم قدرت ہے اور چونکہ مجمع عام مسلمانوں کا بھی تھا جو دور دور سے آئے ہوئے تھے، اس لئے میرے میزبانوں نے بتایا کہ یہاں خطاب انگریزی ہی میں ہونا چاہئے۔ چنانچہ یہاں دارالعلوم سمیت ٹرینیڈاڈ کے تمام مقامات پر میرے تمام خطابات انگریزی ہی میں ہوئے۔ بیان کے بعد مفتی وسیم صاحب نے دارالعلوم کے مختلف شعبوں کا معائنہ کروایا، اور ان کا حسن انتظام دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی اور احساس ہوا کہ اس ادارے کا وجود اس خطے کیلئے ایک بڑی نعمت ہے۔

صدر ٹرینیڈاڈ سے ملاقات

میرے میزبان شیراز صاحب نے میری آمد کے موقع پر جب ایئرپورٹ پر وی آئی پی انتظامات کرنے چاہے تو کسی محکمے میں میرا تعارفی خاکہ بھی بھیجا تھا۔ یہ تعارفی خاکہ نہ جانے کس طرح ٹرینیڈاڈ کے صدر مملکت پروفیسر میکس ویل رچرڈ کو پہنچ گیا۔ انہوں نے یہ خاکہ

دیکھ کر شیراز صاحب کو کہلایا کہ اپنے اس مہمان سے ہماری بھی ملاقات کرائیے، اور وزیراعظم کی بھی۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ مجھ طالب علم سے کیوں ملنا چاہتے ہیں، لیکن انکار کی بھی کوئی وجہ نہیں تھی۔ چنانچہ بدھ ۲۲ شوال کو صبح دس بجے ہم پریذیڈنٹ ہاؤس پہنچے۔ پریذیڈنٹ ہاؤس ایک سادہ سی دو منزلہ عمارت تھی جس میں دور دور شان وشوکت کی کوئی علامت نہیں تھی۔ البتہ اُس کا پائیں باغ بہت خوبصورت اور دلفریب تھا۔ صدر نے ہمیں فوراً بلالیا اور بڑے اکرام اور خوش اخلاقی سے ملے۔ مجھے ٹرینیڈاڈ آنے پر مبارکباد دی، اور رسمی باتوں کے بعد انہوں نے کہا کہ مجھے آپ کے بارے میں یہ معلوم ہوا تھا کہ اسلام کے مالیاتی نظام کے بارے میں آپ نے خاصا کام کیا ہے اور اس موضوع پر کتابیں بھی لکھی ہیں، اس لئے مجھے شوق ہوا کہ میں آپ سے اسلام کی معاشی تعلیمات کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کروں اور اس بات کی ضرورت اس لئے بھی محسوس ہوئی کہ آج کل ساری دنیا جس معاشی بحران میں مبتلا ہے اس کے بارے میں کچھ لوگ یہ لکھ رہے ہیں کہ اسلامی مالیاتی ادارے اُس سے سب سے کم متاثر ہوئے ہیں اور اسلامی تعلیمات میں اس بحران کا حل موجود ہے۔ میں اس کی حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔

میں نے اس کے جواب میں قدرے تفصیل کے ساتھ عرض کیا کہ موجودہ بحران اُس سودی مالیاتی نظام کا لازمی نتیجہ ہے جس نے ساری دنیا کو اپنے شکنجے میں کسا ہوا ہے۔ اس نظام کی تین بنیادی خصوصیات ہیں جو اس بحران کا سبب بنی ہیں اور جب تک یہ خصوصیات موجود رہیں گی، دنیا وقتاً فوقتاً ایسے بحرانوں سے دوچار ہوتی رہے گی۔ میں نے عرض کیا کہ ان میں سے پہلی بات تو سودی کاروبار پر مبنی وہ نظام زَر اور وہ تمویلی نظام (Financial System) ہے جس میں تمویل کے پیچھے حقیقی اثاثے نہیں ہوتے، نیز حقیقی زَر (خواہ نوٹ ہی کی شکل میں ہو) کی مقدار کو نظر انداز کر کے محض فرضی اور حسابی زَر پیدا کیا جاتا ہے جس کے پیچھے نوٹ بھی نہیں ہوتے، وہ محض ہندسے ہوتے ہیں، جنہیں زَر تصور کر کے سود کا کاروبار چکایا جاتا ہے، اور اس صورتحال کو مشتقات

(Derivatives) کی تجارت نے کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے جس کی وجہ سے زَر کی مجموعی سپلائی میں حقیقی زَر کا تناسب بہت معمولی سا رہ گیا ہے، اور اس کے بجائے محض فرضی اور حسابی زَر کا پھیلاؤ حد سے زیادہ بڑھ چکا ہے۔ (اس بات کی تفصیل کا سفرنامہ متحمل نہیں ہے، لیکن اس کی تشریح میری کتاب ''سود پر تاریخی فیصلہ'' کے پیراگراف ۱۷۰ اور اس سے آگے مذکور ہے۔) دوسرا بنیادی سبب قرضوں کی خرید و فروخت ہے، جس نے موجودہ بحران پر جلتی پر آگ کا کام کیا ہے۔ تیسرا سبب اسٹاک ایکسچینج میں قبضے کے بغیر خرید و فروخت اور ملکیت کے بغیر خرید و فروخت (Short Sales) کا نظام ہے جس نے سٹہ بازی کو سند جواز عطا کی ہے اور یہی سٹہ بازی اسٹاک مارکیٹ میں بار بار جھٹکے لا کر زلزلے برپا کرتی ہے۔

ان نکات کی مختصر تشریح کے بعد میں نے عرض کیا کہ اسلام میں یہ تینوں باتیں ممنوع ہیں۔ سود کو قرآنِ کریم نے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگ کے مرادف قرار دیا ہے اور اسلام میں کوئی تمویل ایسی نہیں ہو سکتی جس کی پشت پر حقیقی اثاثے نہ ہوں۔ قرض اسلام میں کوئی تجارتی معاملہ نہیں ہے جس سے نفع کمانا مقصود ہو۔ نفع صرف اشیاء و خدمات کی حقیقی خرید و فروخت ہی پر کمایا جا سکتا ہے۔ فرضی، وہمی اور غیر یقینی چیزوں پر نفع نہیں کمایا جا سکتا۔ لہٰذا قرضوں کی خرید و فروخت بھی ناجائز ہے، مشتقات کی خرید و فروخت بھی اور ایسی چیزوں کی خرید و فروخت بھی جو بیچنے والے کی ملکیت اور قبضے میں نہ آئی ہوں۔ موجودہ بحران کی اصل وجہ یہی خرابیاں ہیں اور اگرچہ بحران کی چکی جب ایک مرتبہ چل پڑتی ہے تو گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے لیکن جن اسلامی اداروں نے اپنے معاملات کو ان خرابیوں سے پاک رکھا ہے وہ اس بحران سے اتنے متاثر نہیں ہوئے جتنے عام ادارے متاثر ہوئے ہیں۔

اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ موجودہ دنیا نے ابھی تک دو معاشی نظاموں کا تجربہ کیا ہے، سوشلزم اور سرمایہ دارانہ نظام۔ اسلام کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے انسانیت کو ایک تیسری

معتدل راہ عطا فرمائی ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ جب کبھی اس تیسری راہ کی بات کی جاتی ہے تو مغربی حلقوں کی طرف سے شور مچنا شروع ہو جاتا ہے کہ اسلام کی بات کرنے والے گھڑی کی سوئی کو پیچھے لے جانا چاہتے ہیں اور اب یہ پروپیگنڈہ بھی شروع ہو گیا ہے کہ یہ تو دہشت گردی کا مذہب ہے۔ نتیجہ یہ کہ کسی کو سنجیدگی سے اسلامی تعلیمات کو سمجھنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔

صدرِ مملکت پروفیسر میکس ویل رچرڈ نے جو خود قانون اور معاشیات میں اعلیٰ تعلیم رکھتے تھے، یہ باتیں بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنیں اور بیچ میں سوالات بھی کرتے رہے اور آخر میں انہوں نے موجودہ معاشی نظام کی ان خرابیوں کا اعتراف کیا۔ لیکن کہنے لگے کہ ان خرابیوں کا ازالہ کسی ایک شخص کے بس میں نہیں ہے، لیکن میری خواہش ہے کہ آپ کی ملاقات ہمارے وزیر اعظم سے بھی ہو اور ہم جو کچھ کر سکتے ہیں، کم از کم اُس کے کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔ (ملک کے وزیر اعظم اُس وقت سے ملک سے باہر تھے، اس لئے صدر کی یہ خواہش میرے قیام کے دوران پوری نہ ہو سکی)۔

یہ ملاقات تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہی اور اس سے یہ اندازہ ضرور ہوا کہ موجودہ معاشی بحران نے مغربی دنیا کے اصحابِ فکر کو بھی اپنے معاشی نظام کی کمزوریوں کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مجھے اپنے مرحوم بھائی جناب زکی کیفی رحمۃ اللہ علیہ کی نعت کا یہ شعر یاد آ گیا:

تنگ آ جائے گی خود اپنے چلن سے دنیا
تجھ سے سیکھے گا زمانہ ترے انداز کبھی

میرے میزبان جناب شیراز صاحب ٹرینیڈاڈ کے مسلمانوں کیلئے غیر سودی اسکیمیں جاری کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے کا ابتدائی کام انہوں نے مولانا مفتی وسیم صاحب کی رہنمائی میں انجام دیا ہوا ہے۔ لیکن اس سلسلے کے باقاعدہ آغاز سے پہلے ایک تو انہوں نے پیشہ ور حضرات کی تربیت کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جس کے کئی پروگرام ہو چکے ہیں،

دوسرے ان کی اور مفتی وسیم صاحب کی خواہش تھی کہ میں ان کے نظام کا جائزہ لے کر کچھ مشورے پیش کروں۔ اس غرض کیلئے وہ اپنے ادارے میں مجھے لے گئے اور ابتک کے کام کا ایک خلاصہ پیش کیا۔ مختصر وقت میں پورے کام پر ذمہ دارانہ تبصرہ تو مشکل تھا، لیکن میں نے اپنی بساط کی حد تک کچھ اُصولی مشورے پیش کئے جن پر انہوں نے عمل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ان کی خواہش تو یہ تھی کہ میں ان کے ادارے کے شریعہ بورڈ کی رسمی ذمہ داری قبول کرلوں، لیکن میں اپنی مصروفیات اور دوری کی بنا پر اس بات سے پہلے ہی معذرت کر چکا تھا۔ البتہ مفتی وسیم صاحب ان کی رہنمائی کررہے ہیں۔

ٹرینیڈاڈ کا قیام اس لحاظ سے بہت مصروف گذرا کہ ہر روز صبح کا وقت کسی ادارے کے معائنے میں صرف ہوا اور مغرب کے بعد کسی نہ کسی مسجد میں بیانات کا سلسلہ رہا۔ یہاں کی مختلف تنظیموں اور اداروں سے واقفیت حاصل ہوئی اور انہیں مشورے دینے کا بھی موقع ملا اور یہ دیکھ کر مجموعی حیثیت سے خوشی ہوئی کہ الحمدللہ یہاں مسلمان خوشحال ہونے کے ساتھ اپنے دین کے تحفظ کی فکر رکھتے ہیں، اور تبلیغی سرگرمیاں بھی جاری ہیں۔

ٹرینیڈاڈ ویسٹ انڈیز کے خوبصورت ترین جزیروں میں سمجھا جاتا ہے جہاں سمندر، پہاڑوں اور آبشاروں کا ایک جہان آباد ہے، اور اس وجہ سے یہاں سیاحوں کی بھی خوب آمدورفت رہتی ہے۔ اور ویسٹ انڈیز کے دوسرے جزیروں کی طرح یہاں بھی خط استوا کا موسم یعنی ہلکی گرمی اور بارشوں کی کثرت مغربی سیاحوں کیلئے خاصی دلچسپی کا سبب ہے۔ مجھے اپنی مصروفیات کی وجہ سے جزیرے کے سیاحتی مقامات تک جانے کا موقع تو نہیں ملا، لیکن ایک مقامی دوست کے اصرار پر میرا قیام حیات ریجنسی ہوٹل کی بائیسویں منزل پر رہا جو بڑی پُرفضا جگہ پر واقع تھا۔ اُس کے ایک طرف بحیرۂ کیریبین کا دلکش نظارہ ہر وقت سامنے تھا، اور دوسری طرف ایک سرسبز پہاڑ کے دامن میں پھیلے ہوئے شہر کا منظر بھی بڑا دلفریب تھا۔ پیر سے ہفتے کی صبح تک پانچ دن یہاں میرا قیام رہا، اور جمعہ کا دن جزیرے کے شمالی شہر میں گذرا جہاں ایک عالیشان مسجد میں جمعہ کا خطاب بھی ہوا جو حاضرین سے

کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور شام کو مغرب کے بعد وہیں کی ایک اور مسجد سے ملحق ہال میں بھی تقریر ہوئی جس میں شہر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو خصوصی دعوت پر بلایا گیا تھا۔ یہ میرے قیام کا آخری دن تھا اور اگلی صبح وہاں سے باربیڈوس کیلئے روانگی ہوگئی۔

بار بے ڈوس میں

بار بے ڈوس بھی ویسٹ انڈیز کا ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ اور ۱۹۹۴ء میں یعنی چودہ سال پہلے میں یہاں پانچ دن گزار چکا ہوں جس کا مختصر تذکرہ میری کتاب ''دنیا مرے آگے'' میں ص ۱۰۷ سے ص ۱۱۱ تک موجود ہے۔ یہاں کے کچھ احباب اگرچہ بارہا مجھے دعوت دے چکے تھے، لیکن اس مرتبہ وہاں جانا میرے اصل پروگرام میں اسلئے شامل نہیں تھا کہ برازیل اور پانامہ کیلئے ویزا حاصل کرنے میں اتنا وقت لگ گیا کہ بار بے ڈوس کا ویزا میں چلنے سے پہلے حاصل نہیں کر سکا، لیکن یہاں کے احباب، بالخصوص مفتی محمود دانا صاحب نے ٹرینیڈاڈ تک میرے آنے کی خبر سنی تو انہوں نے اصرار کیا کہ چاہے ایک ہی دن کیلئے ہو، میں باربیڈوس ضرور ہو کر جاؤں۔ چنانچہ انہوں نے خصوصی طور پر بڑی محنت کر کے میرے لئے ویزا حاصل کیا اور اس کی کاپی ٹرینیڈاڈ بھیج دی۔ اس طرح ٹرینیڈاڈ کے پروگرام سے دو دن کم کر کے ہم ہفتے کی صبح باربیڈوس روانہ ہوئے۔ یہ پینتالیس منٹ کا سفر تھا اور ہم ایئرپورٹ پر اُترے تو ایک جم غفیر استقبال کیلئے موجود تھا۔ چونکہ اتوار کی شام کو میری واپسی طے تھی اس لئے اس مختصر وقت میں اسلامک اکیڈمی آف بار بے ڈوس کی طرف سے ان حضرات نے صرف دو پروگرام رکھے تھے۔ ایک تو ہفتے کی شام کو بار بے ڈوس کے سب سے بڑے کانفرنس ہال میں عشاء کے بعد ایک سیمینار کا اہتمام کیا تھا جس کیلئے ان حضرات نے پہلے سے اسلام کی معاشی اور مالیاتی تعلیمات کا عنوان تجویز کر رکھا تھا۔ اس سیمینار میں بنیادی تقریر میری ہی رکھی گئی تھی اور اس میں مقامی علماء کے علاوہ شہر کے مسلم اور غیر مسلم پروفیسر، وکلاء اور دوسرے شعبوں کے لوگ موجود تھے۔ دوسرا پروگرام اتوار کی صبح اکیڈمی کی طرف سے باربیڈوس کے علماء کے ساتھ ایک مشاورتی مجلس کا رکھا

گیا تھا جس میں مقامی فقہی مسائل پر گفتگو تقریباً ڈیڑھ گھنٹے جاری رہی۔ میں جب پہلے آیا تھا تو یہاں دو بڑی مسجدیں تھیں اور اب ماشاء اللہ ان میں ایک اور بڑی مسجد کا اضافہ ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کی تعداد بھی بڑھ کر تین ہزار کے قریب پہنچ گئی ہے۔ یہ تو میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ یہاں مسلمانوں نے بچوں کی تعلیم کا بڑا مضبوط نظام بنایا ہوا ہے۔ اس مرتبہ الفلاح پرائمری اسکول کے نام سے ایک باقاعدہ اسکول بھی دیکھنے میں آیا جو علماء کی نگرانی میں کام کر رہا ہے۔

اتوار کا دن باربیڈوس میں گذارنے کے بعد ہم مغرب کے بعد برٹش ایئرویز کے طیارے سے لندن کیلئے روانہ ہوئے اور پیر ۲۷ر شوال کی صبح فجر کے وقت لندن گیٹ وِک ایئرپورٹ پر اُترے۔ یہاں ایک بجے دوپہر تک قیام کرنا تھا۔ لیسٹر کے جناب مولانا سلیم دھورات صاحب نے مجھ سے باربیڈوس ہی میں فون پر فرمایا تھا کہ وہ آج کل لندن ہی میں ہیں اور یہ چند گھنٹے ان کے ساتھ گذار لیے جائیں۔ وہ ایئرپورٹ پر موجود تھے، اور ان کے ایک دوست ڈاکٹر صاحب کا گھر گیٹ وک کے قریب ہی تھا۔ وہاں چند گھنٹے آرام اور مولانا سے پُر لطف ملاقات کے بعد دوپہر ڈیڑھ بجے امارات ایئر لائنز سے دبئی کیلئے روانگی ہوئی۔ رات ساڑھے بارہ بجے دبئی اُترا اور وہ رات دبئی میں گذار کر علی الصباح کراچی روانہ ہوئے اور بتیس گھنٹوں کے سفر کے بعد کراچی کے وقت سے بارہ بجے کے قریب وطن واپسی ہوئی اور اس طرح پورے تیئس دن کے بعد یہ طویل سفر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بعافیت تکمیل کو پہنچا۔

وللہ الحمد اولاً و آخراً

تاجکستان کا سفر

شوال ۱۴۳۰ھ

اکتوبر 2009ء

تاجکستان کا سفر

شوال ۱۴۳۰ھ / اکتوبر 2009ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ و کفی، وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، امابعد!

شوال ۱۴۳۰ھ کے آغاز میں مجھے پاکستان میں تاجکستان کے سفارت خانے کی طرف سے پیغام ملا کہ تاجکستان کی حکومت اس مہینے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں ایک عالمی کانفرنس منعقد کر رہی ہے، جس میں مجھے بھی مدعو کیا گیا ہے۔ میں عام طور سے ایسی کانفرنسوں میں شرکت سے معذرت ہی کر لیا کرتا ہوں، اور اتفاق سے ان دنوں میں نے بنگلہ دیش جانے کا وعدہ کیا ہوا تھا، اس لئے عذر بھی واضح تھا، لیکن ہمارے یہاں تاجکستان کے جو طلبہ زیر تعلیم ہیں، انہوں نے اصرار کیا کہ مجھے اس موقع پر یہ دعوت ضرور قبول کرنی چاہئے، ان کا کہنا تھا کہ اوّل تو یہ پہلا موقع ہے کہ تاجکستان کی حکومت کسی دینی موضوع پر ایسا اجتماع منعقد کر رہی ہے، دوسرے عام حالات میں پاکستان کے علماء کا تاجکستان کا دورہ کرنا بوجوہ بہت مشکل ہے اور اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اگر وہاں کا ایک سفر ہو جائے گا تو وہاں کے دینی حلقوں کے لئے تقویت کا باعث ہوگا۔ تاجکستان میں ہمارے دارالعلوم سے تعلیم پا کر بہت سے طلبہ گئے ہیں، ان کے بھی ٹیلیفون آئے اور انہوں نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے نام پر میں نے اس سفر کا ارادہ کر لیا اور بنگلہ دیش کے میزبان بھی وہاں کا سفر مؤخر کرنے پر راضی ہو گئے۔

وسط ایشیاء کی جو مسلم ریاستیں سوویت یونین سے آزاد ہوئی ہیں، ان میں سے ازبکستان اور کرغیزستان کا سفر میں پہلے کر چکا ہوں (کرغیزستان کا سفرنامہ شائع بھی ہو چکا

ہے) لیکن تاجکستان کے سفر کا یہ پہلا موقع تھا اور چونکہ کرغیزستان اور روس کے سفر میں میرے محبّ مکرم جناب جاوید ہزاروی صاحب میرے ساتھ تھے، اور وہ ان ریاستوں کا بار بار سفر کر چکے ہیں، اور وہاں کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہیں، اس لئے میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ بھی میرے ساتھ چلیں اور وہ بھی بخوشی تیار ہو گئے۔

تاجکستان کا تعارف

سفر کے حالات شروع کرنے سے پہلے تاجکستان کا ایک مختصر تعارف مناسب معلوم ہوتا ہے۔ تاجکستان اس وقت ایک آزاد ریاست ہے جس کی آبادی کی بھاری اکثریت مسلمان ہے۔ پچپن ہزار دو سو پچاس مربع میل میں پھیلی ہوئی یہ ریاست زیادہ تر پہاڑی علاقوں پر مشتمل ہے، جس میں پامیر کے کوہستانی سلسلے کی برف پوش چوٹیاں بھی داخل ہیں۔ مشرق میں اس کی سرحدیں چین سے، مغرب اور شمال میں ازبکستان اور کرغیزستان سے اور جنوب میں افغانستان سے ملتی ہیں۔ ملک کا دارالحکومت دوشنبے ہے اور دوسرا بڑا شہر خجند ہے جہاں سے بہت سے علماء اور اولیاء اللہ پیدا ہوئے ہیں اور مولانا رومی کے شیخ حضرت خواجہ شمس تبریز کے مرشد بابا کمال الدین (رحمہم اللہ تعالیٰ) بھی۔ (جن کو بعض تذکروں میں جندی اور بعض میں خجندی لکھا جاتا ہے) غالباً یہیں گزرے ہیں۔ تاجکستان کی قومی اور سرکاری زبان فارسی ہے، لیکن روسی غلبے کے بعد اُسے روسی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔

یہ ملک اُس وسیع علاقے کا ایک حصہ تھا جسے عربی مآخذ میں ماوراء النہر کہا جاتا ہے۔ اس اصطلاح میں نہر سے مراد دریائے جیحون ہے جسے آج کل دریائے آمو کہتے ہیں۔ اس دریا کے پار کا سارا علاقہ ماوراء النہر کہلاتا تھا اور اس میں ازبکستان، کرغیزستان اور تاجکستان کے تمام علاقے داخل تھے۔ مسلمانوں نے یہ علاقے دوسری صدی ہجری میں ہی فتح کر لئے تھے اور یہ پورا خطہ جو آج کل کئی ریاستوں میں بٹا ہوا ہے، اسلامی ملک کا ایک صوبہ تصور ہوتا تھا۔ آخری دور میں امارت بخارا میں جہاں ازبکستان کے علاقے آتے تھے، وہاں تاجکستان کے تمام علاقے بھی اُسی کے زیر نگیں تھے۔ اٹھارہویں صدی میں دریائے جیحون

کے جنوب مغربی علاقے جن میں بلخ کا علاقہ بطورِ خاص داخل ہے، افغانستان کا حصہ بن گئے اور تاجک نسل کی ایک بڑی آبادی وہاں موجود ہے۔ ۱۸۶۰ء میں زار روس نے وسط ایشیائی ریاستوں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ امارت بخارا ایک عرصے تک روسی حملوں کا مقابلہ کرتی رہی۔ لیکن بالآخر ۱۸۶۸ء میں اس پورے علاقے کو روس نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ ۱۹۱۷ء میں کمیونسٹ سوویت انقلاب آیا تو اس نے ان سارے علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور ۱۹۲۱ء میں دوشبنے پر قبضہ کرلیا۔ بخارا کے ابراہیم بیگ کی قیادت میں مسلمانوں کی تحریک مزاحمت ۱۹۳۱ء تک چلتی رہی، لیکن آخر کار سوویت روس اس پورے علاقے پر اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا اور اُس نے تاجکستان کو اپنی پندرہ ریاستوں میں سے ایک قرار دے کر اُسے سوویت ری پبلک قرار دیدیا۔ مسلمانوں پر مظالم کا سلسلہ تو زار روس کے وقت ہی سے جاری تھا، لیکن سوویت یونین کے اقتدار میں یہ مظالم انتہاء کو پہنچ گئے۔ مسجدیں ختم کردی گئیں، نماز پڑھنا ممنوع کردیا گیا، دینی تعلیم کا تو ذکر ہی کیا ہے، قرآنِ کریم کے نسخے رکھنا بھی جرم قرار پایا۔ جن علماء نے مزاحمت کی کوشش کی انہیں انتہائی اذیت ناک موت کا سامنا کرنا پڑا اور مسلمانوں کے تقریباً چوہتر سال اسی آزمائش میں گذرے۔ لیکن آفرین ہے یہاں کے مسلمانوں اور بطورِ خاص علماء پر کہ انہوں نے ان صبر آزما حالات میں بھی دین کو باقی رکھنے کیلئے بے مثال قربانیاں دیں۔ وہ چھپ چھپ کر نمازیں پڑھتے اور ایک دوسرے کو سکھاتے، آدھی رات گذرنے کے بعد جب روسی اہلکار خوابِ راحت کے مزے لے رہے ہوتے تھے، ان کے تہہ خانوں اور حجروں میں دین کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوتا اور پو پھوٹنے سے پہلے ختم ہوجاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ چوہتر سال تک ظلم وتشدد کی چکی میں پستے رہنے کے باوجود انہوں نے اپنے دین وایمان کو محفوظ رکھا اور جب سوویت یونین کا اقتدار ٹوٹا، تو ان کی اکثریت اندر سے سچی اور پکی مسلمان ہوکر نکلی۔ سوویت یونین سے آزادی کے بعد جب تاجکستان نے ایک آزاد ریاست کی شکل اختیار کی تو یہاں کے بعض پُرجوش مسلمانوں نے یہ کوشش کی کہ یہ ایک ٹھیٹھ اسلامی ریاست

بنے اور اس غرض کیلئے انہوں نے مسلح جدوجہد شروع کر دی جس کی بناء پر یہ ملک آزاد ہونے کے بعد کئی سال تک خانہ جنگی کا شکار رہا۔ آخر کار تاجکستان کے موجودہ صدر امام علی عبدالرحمٰن برسر اقتدار آئے تو انہوں نے مصالحت کی پالیسی اختیار کرنی چاہی، مسلح جدوجہد کے قائد عبداللہ نوری تھے۔ ان کو بھی یہ احساس ہوا کہ اس خانہ جنگی کے نقصانات زیادہ ہیں، اور انہیں اپنی جدوجہد کا طریقہ بدلنا چاہئے، اس لئے وہ بھی صلح پر آمادہ ہو گئے اور اس طرح دونوں گروہوں میں اس بات پر صلح ہوئی کہ عبداللہ نوری کی جماعت کو حزب اسلامی نام سے سیاست میں حصہ لینے کا حق ہوگا۔ چنانچہ جو حضرات مسلح جدوجہد کر رہے تھے انہوں نے پُر امن جمہوری طریقے پر کام کرنا شروع کر دیا، اور اب وہ پارلیمنٹ کی رکنیت کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شروع میں ان کو پارلیمنٹ میں مؤثر نمائندگی حاصل تھی، لیکن نامعلوم اسباب کے تحت ان کی نمائندگی گھٹتی چلی گئی اور اب پارلیمنٹ میں ان کی نشستیں تھوڑی ہی سی ہیں، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حکومت کی پالیسیوں پر تنقید کی فی الجملہ آزادی ہے، اور اس کا کچھ نہ کچھ اثر ظاہر ہو جاتا ہے، لیکن دوسری طرف حکومت کو یہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ دینی طاقتیں پھر سے اس کیلئے کوئی مسئلہ پیدا نہ کر دیں، چنانچہ ابھی تک پرائیوٹ مدرسوں کی اجازت نہیں ہے۔ مسجدیں اگرچہ کھل گئی ہیں، لیکن ان میں دینی کام بہت مختصر پیمانے پر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ملک کی مجموعی صورتحال روسی اقتدار کے مقابلے میں کچھ بہتر ضرور ہے، لیکن ان پابندیوں کی وجہ سے دینی کام کرنے والوں کیلئے کافی مشکلات ہیں۔ حالات کے اس پس منظر میں حکومت کی طرف سے امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں ایک عالمی اجتماع منعقد کرنے کو یہاں کے دینی حلقوں نے حکومت سے اختلاف کے باوجود غنیمت سمجھا، اور اسی لئے مجھ سے یہ فرمائش کی گئی کہ میں اس میں شرکت ضرور کروں۔

دوشنبے تک کا سفر

چنانچہ جمعہ ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۹ء کی شام ہم کراچی سے اسلام آباد کیلئے روانہ ہوئے اور وہاں

سے رات ایک بجے کرغیزستان ایئر لائنز کے طیارے میں سوار ہوئے۔ طیارے ہی میں یہ معلوم ہوا کہ پاکستان سے اسلام آباد کی اسلامی یونیورسٹی کے متعدد اساتذہ اور پنجاب یونیورسٹی کے فارسی کے شعبہ کے کچھ اساتذہ بھی کانفرنس میں مدعو ہیں، اور میڈیا کے کچھ نمائندوں کو بھی دعوت دی گئی ہے اور اس طرح اُنیس افراد اسی طیارے میں سفر کررہے ہیں۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے کی پرواز کے بعد رات کے پچھلے پہر ہم کرغیزستان کے دارالحکومت بشکیک کے ہوائی اڈے پر اُترے، یہاں ہمیں پانچ گھنٹے ایک دوسرے طیارے کا انتظار کرنا تھا جو ہمیں تاجکستان کے دارالحکومت دوشنبے لے جائے۔ اگرچہ رات کا پچھلا پہر تھا، لیکن بشکیک میں ہمارے احباب کی ایک جماعت ہوائی اڈے پر ہمارے استقبال کیلئے نہ صرف موجود تھی، بلکہ انہوں نے ہمارے لئے وی آئی پی لاؤنج کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ ان حضرات میں سے جناب الحاج محمد مختار صاحب، ہمارے دارالعلوم کے فارغ التحصیل عالم مولانا محمد علی کرغیزی اور کرغیزستان کے نائب مفتی بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ بشکیک کے ان احباب سے تین سال بعد ملاقات ہو رہی تھی۔ اس لئے دیر تک اِن حضرات سے گفتگو رہی، پھر کچھ دیر کیلئے انہوں نے ہمارے آرام کا انتظام بھی کیا، یہاں تک کہ طلوعِ فجر کے بعد ہوائی اڈے کی مسجد میں نماز ادا کی۔ نماز کے بعد ان حضرات نے پُرتکلف ناشتے کا بھی اہتمام کیا ہوا تھا، جس سے لطف اندوز ہونے کے بعد جہاز کی روانگی کا وقت ہوگیا اور ہم آٹھ بجے صبح تاجکستان ایئر لائنز کے طیارے میں سوار ہوگئے۔ یہ چھوٹا طیارہ تھا جس نے تاجکستان کے دارالحکومت دوشنبے پہنچنے میں تقریباً تین گھنٹے لئے۔

اس فضائی سفر کا زیادہ تر حصہ پامیر کے طویل و عریض کوہستانی سلسلے پر پرواز کرتے ہوئے طے ہوا۔ جہاز کی بلندی چونکہ زیادہ نہیں تھی، اس لئے پامیر کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں اور ان کی وادیوں کے پیچ وخم کا نظارہ بڑا دلفریب تھا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کیلئے پانی کا یہ عظیم الشان ذخیرہ ان پہاڑوں کو قدرتی فریزر بنا کر ان کی چوٹیوں پر جمع کردیا ہے جہاں سے وہ حسبِ ضرورت پگھل پگھل کر دریاؤں کی شکل اختیار کرتا ہے اور انسان کی

سیرابی کا انتظام کرتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے:

وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَأَسْكَنَّاهُ فِي الْأَرْضِ.

(المؤمنون۔ ۲۳)

> ''اور ہم نے آسمان سے ٹھیک اندازے کے مطابق پانی اُتارا، پھر اِسے زمین میں ٹھہرادیا۔''

اس آیت کے تحت راقم الحروف نے توضیح القرآن میں لکھا ہے:

> ''یعنی اگر آسمان سے پانی برسا کر تمہیں ذمہ داری دی جاتی کہ تم خود اس کا ذخیرہ کرو تو یہ تمہارے بس میں نہیں تھا، ہم نے یہ پانی پہاڑوں پر برسا کر اُسے برف کی شکل میں جمادیا، جو رفتہ رفتہ پگھل پگھل کر دریاؤں کی شکل اختیار کرتا ہے اور اُس کی جڑیں زمین بھر میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں، جن سے کنویں بنتے ہیں اور اس طرح زمین کی تہہ میں وہ پانی محفوظ رہتا ہے۔''

پامیر کے کوہستانی علاقے سے گذر کر کچھ میدانی علاقے بھی آئے، یہاں تک کہ جہاز دوشنبے کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اُتر گیا۔ کانفرنس کے منتظمین نے جہاز کی سیڑھیوں پر ہی استقبال کیا اور وی آئی پی لاؤنج میں لے گئے جہاں حکومت کے اعلیٰ افسران موجود تھے۔ تاجکستان میں پاکستان کے سفیر جناب خالد عثمان قیصر صاحب نے بھی اپنے متعدد افسران کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کیا اور تاجکستان کے بارے میں مفید معلومات مہیا کیں۔ ہمارے دارالعلوم کے فارغ التحصیل عالم مولانا حکمت اللہ صاحب بھی کچھ دیر کیلئے لاؤنج میں آئے، اور انہوں نے بتایا کہ باہر علماء اور معززین شہر کا ایک بڑا مجمع منتظر ہے۔ رسمی کارروائیوں کے بعد جب ہم باہر نکلے تو واقعۃً استقبال کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد قطار بنائے کھڑی تھی۔ ان میں ہمارے دارالعلوم اور پاکستان کے دوسرے مدارس کے فضلاء بھی تھے اور دوسرے محبت رکھنے والے بھی۔ تقریباً ایک صدی کے بعد شاید یہ پہلا موقع تھا

کہ برصغیر سے علم دین سے نسبت رکھنے والا کوئی شخص تاجکستان آیا تھا، اس لئے ان حضرات میں سے بعض کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو صاف دیکھے جاسکتے تھے۔ ان حضرات سے تفصیلی ملاقات کا نہ کوئی موقع ملا تھا اور نہ میزبانوں کی طرف سے کئے ہوئے انتظامات اس کی اجازت دیتے تھے، اس لئے ان حضرات سے صرف مختصر سلام ودعا اور مصافحے پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ ارادہ یہی تھا کہ قیام کے دوران کوئی وقت ایسا رکھا جائے گا جس میں ان سے تفصیلی ملاقات اور گفتگو ہوسکے۔

قیام کا انتظام اُوستا ہوٹل میں تھا۔ قیام گاہ پہنچ کر منتظمین نے بتایا کہ ظہر کے بعد مہمانوں کو یہاں کے ایک تاریخی قلعے (حصار) میں لے جانے کا پروگرام ہے۔ لیکن سفر کی تھکن اتنی غالب تھی کہ ان سے معذرت کرکے ہم نے کچھ دیر آرام کیا۔ عصر کے بعد پتہ چلا کہ ہوٹل سے باہر ملنے والوں کی ایک جماعت منتظر ہے۔ جو ہوٹل کے سیکورٹی کے انتظامات کی وجہ سے اندر نہیں آپارہی ہے۔ معلوم ہوا کہ ہوٹل کے قریب ہی ایک گلی میں شہر کی سب سے بڑی جامع مسجد ہے۔ ہم نے ارادہ کیا کہ ان حضرات سے اس مسجد میں ملاقات کی جائے اور انہیں یہ پیغام بھی بھجوادیا کہ وہ مسجد میں تشریف لے جائیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم ہوٹل سے باہر نکلے۔ ہوٹل جس سڑک پر واقع تھا، وہ شہر کی سب سے زیادہ خوبصورت اور بارونق سڑک تھی، جس کے دونوں طرف چنار کے اونچے اونچے درختوں نے اس کے حسن کو دوبالا کر رکھا تھا۔ موسم میں بڑی خوشگوار خنکی تھی اور ہم اس میں چہل قدمی کا لطف لیتے ہوئے مسجد کی طرف روانہ ہوئے۔ جب مسجد کے موڑ پر پہنچے تو لوگوں کا ایک انبوہ سامنے تھا، ان سے فرداً فرداً مصافحہ ہوا۔ ان میں سے کچھ تو ہمارے فضلاء بھی تھے اور کچھ وہ لوگ تھے جو کتابوں یا انٹرنیٹ کے ذریعے مجھ سے متعارف تھے اور کچھ صرف پاکستان سے آئے ہوئے ایک طالب علم سے ملنے کے شوق میں آگئے تھے۔

مسجد کے باہر ایک عمارت میں تاجکستان کا واحد دینی مدرسہ ہے جو سرکاری انتظام میں چل رہا ہے۔ جو ریاستیں روس کے زیر انتظام رہی ہیں، ان میں سوویت یونین کے اقتدار

کے زمانے میں اکثر مساجد اور مدارس کو تو ختم ہی کر دیا گیا تھا، لیکن ہر ریاست میں انہوں نے ایک ادارہ ''مفتیات'' کے نام سے باقی رکھا تھا جس کی حیثیت کچھ وزارتِ مذہبی اُمور سے ملتی جلتی تھی، اس کے سربراہ کو مفتی کہتے تھے اور اس کا کام فتوے دینے سے زیادہ مذہبی اُمور کا انتظام ہوتا تھا، اور اس کے زیر نگرانی تھوڑی بہت دینی تعلیم بھی ہو جاتی تھی۔ یہی انتظام اب ریاستوں کے آزاد ہو جانے کے بعد بھی قائم ہے اور یہ مدرسہ بھی اسی نوعیت کا ہے جس میں تعلیم تو واجبی سی ہے لیکن مساجد کا انتظام وغیرہ اس کے سپرد ہے اور جو اساتذہ اس میں مقرر ہو جاتے ہیں ان کو اپنے طور پر دینی کام کرنے کی نسبتاً آزادی بھی میسر آ جاتی ہے۔

لوگوں سے ملتے ملاتے جب ہم مسجد کے قریب پہنچے تو وہاں سے اذانِ مغرب کی دلکش آواز بلند ہو رہی تھی۔ یہ بڑی عالی شان قلعہ نما مسجد تھی جس کے بلند مینار اور منقش تعمیر سے اس کا شکوہ ظاہر ہو رہا تھا۔ اسے دوشنبے کے مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ یعقوب چرخی رحمتہ اللہ علیہ کے نام پر جامع مسجد یعقوب چرخی کہا جاتا ہے۔ ان کا مزار تو کہیں اور ہے لیکن مسجد کو ان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ مسجد کے امام اسی مفتیات کے ادارے کے ایک صاحب ہیں جو عربی بولنے پر فی الجملہ قادر تھے، وہ بڑی محبت سے ملے، اور مسجد کی خصوصیات سے آگاہ کیا۔ نمازِ مغرب کے بعد لوگ منتظر تھے کہ وہاں کوئی نشست ہو جائے، لیکن کانفرنس کے منتظمین نے کہا کہ مہمانوں کو کہیں اور لے جانے کا پروگرام طے ہے، اس لئے اس بار بھی ان حضرات سے رخصت چاہی گئی، کانفرنس کے مہمانوں کے اعزاز میں ایک ریسٹورنٹ میں عشائیہ کا اہتمام تھا، جسے یہاں ''چائے خانہ'' کہتے ہیں۔ رات کا کھانا وہیں ہوا۔

اگلا دن اتوار تھا اور کانفرنس پیر کے دن شروع ہونی تھی، اس لئے ہمارا خیال یہ تھا کہ یہ ایک دن فرصت کا ملے گا تو اس میں اپنے تاجکستانی دوستوں سے مفصل ملاقات اور گفتگو بھی ہو سکے گی، ان کے مسائل سمجھ کر کوئی مدد پہنچانے کی بھی کوشش کی جائے گی اور یہاں کے

خاص مقامات پر حاضری بھی ہو جائے گی، لیکن مشیت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اُسی رات کو تین بجے میرے گردے میں درد شروع ہو گیا جو صبح ہوتے ہوتے شدت اختیار کر گیا، منتظمین کی طرف سے ڈاکٹر نے انجکشن دیا، مگر درد موقوف نہ ہوا تو وہ مجھے ہسپتال لے گئے اور اتوار کا پورا دن اور پیر کا بھی ایک بڑا حصہ مجھے ہسپتال میں رہنا پڑا۔ اس موقع پر کانفرنس کے منتظمین نے جس محبت، لگن اور حسن انتظام کا ثبوت دیا اُسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ نائب وزیر صحت بذاتِ خود ہسپتال لے کر گئے، ہسپتال کے ڈائریکٹر نے اتوار کی چھٹی کے باوجود جن سینئر ڈاکٹروں کی ضرورت تھی، انہیں بلا کر علاج کیا۔ میرے لئے ایک صاف ستھرا کمرہ مخصوص کیا، اور میرے ساتھیوں مولانا حکمت اللہ صاحب اور مولانا فرخ صاحب کیلئے بھی الگ کمرے میں رات وہیں گزارنے کا اہتمام کیا۔ الحمدللہ! چند گھنٹوں کے بعد درد موقوف ہوا، لیکن مسلسل طبّی نگرانی کا اہتمام ہوتا رہا۔ پاکستان کے سفیر جناب خالد عثمان صاحب عیادت کیلئے تشریف لائے، اور تین دن تک میرا پرہیزی کھانا ان کے گھر سے آتا رہا۔ اتوار کے دن میرے رفیق سفر جناب جاوید ہزاروی صاحب کے علاوہ تاجکستان کے مولانا سرور صاحب کو ڈاکٹروں نے میرے ساتھ رہنے کی اجازت دی۔ مولانا سرور صاحب کچھ عرصہ ہمارے دارالعلوم میں بھی پڑھے ہیں۔ لیکن جامعہ فاروقیہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ وہ دوشنبے سے کافی فاصلے پر ایک شہر میں مقیم ہیں جس کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ وہ مشہور محدث، امام بخاری اور امام ترمذی وغیرہ کے استاذ حضرت محمد بن بشار (رحمتہ اللہ علیہم) کا شہر ہے اور اِسی میں اِن کا مزار واقع ہے۔ جب مجھے ہسپتال لے جایا جا رہا تھا تو وہ اُس وقت ہوٹل میں مجھ سے ملنے آئے ہوئے تھے، اس لئے ہسپتال میں بھی ساتھ رہے، اور بڑی محبت اور سمجھ داری سے تیمارداری کرتے رہے۔ ہسپتال سے باہر سارے دن عیادت کرنے والوں کا ہجوم رہا۔ میں اور میرے رفقاء حیران تھے کہ اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کو کس طرح ہمارے یہاں ہونے کی اطلاع ہو گئی ہے جبکہ آنے والوں میں کچھ لوگ سینکڑوں کیلومیٹر کا سفر کر کے آئے تھے۔

اگر چہ سفر کے دوران دیارِ غیر میں جہاں میرا پہلی بار جانا ہوا تھا، ایسی بیماری بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس تکلیف کے ازالے کے اتنے اسباب پیدا فرمائے کہ وطن سے دور ہونے کا احساس بھی نہ ہوسکا۔ اگلے دن کانفرنس شروع ہونی تھی، اور اس کے افتتاحی اجلاس میں میری تقریر بھی طے تھی، لیکن ایک اعلیٰ افسر مہمان داری صدرِ مملکت کی طرف سے عیادت کیلئے آئے، اور انہوں نے صدر کا پیغام یہ پہنچایا کہ آپ کی صحت مقدم ہے، اس لئے آپ کوئی بوجھ نہ رکھیں اور کل اگر آپ کی طبیعت بہتر ہو، اور ڈاکٹر صاحبان معائنہ کے بعد اجازت دیں تو آپ جب چاہیں کانفرنس میں آجائیں اور دل چاہے تو کچھ بات بھی کرلیں، ورنہ آرام ہی کریں۔ چنانچہ اگلے دن دوپہر تک ڈاکٹر صاحبان نے مختلف معائنوں کے بعد مجھے اسپتال سے جانے کی اجازت دی، لیکن ہوٹل پہنچ کر بھی طبیعت کمزور رہی، اور میں افتتاحی اجلاس میں شریک نہ ہوسکا۔ البتہ میرے لئے الگ گاڑی اور رہنما کا انتظام کردیا گیا تھا اس لئے شام کے وقت تھوڑی دیر کیلئے محض حاضری دیدی۔

امامِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کانفرنس

کانفرنس ایک بڑے پرشوکت قصر میں ہورہی تھی اور اس میں جاکر اندازہ ہوا کہ کتنے بڑے پیمانے پر ساری دنیا سے لوگ جمع کئے گئے ہیں۔ اگرچہ ایک ایک ملک سے کئی کئی لوگ بلائے گئے تھے، لیکن شاید اس لئے کہ تاجکستان میں اس نوعیت کی کانفرنس کا پہلا تجربہ تھا، اس میں مشاہیر اور ایسے لوگوں کی تعداد کم تھی جو امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے کوئی خصوصیت رکھتے ہوں۔ مشاہیر میں شیخ الازہر، مجمع الفقہ الاسلامی کے امین عام ڈاکٹر عبدالسلام عبادی اور ایران سے مولانا عبدالحمید صاحب اور مولانا محمد اسحاق صاحب قابل ذکر تھے۔

اگلے دن بھی کانفرنس جاری تھی، اور منتظمین نے کہا کہ تھوڑی دیر کیلئے وہاں چلے جائیں، ہم اس بات کا انتظام کردیں گے کہ جونہی آپ پہنچیں، آپ کی تقریر کا اعلان کردیا

جائے اور آپ کو انتظار نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور میں نے عربی میں امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کی فقہ کے امتیازات کے موضوع پر مختصر تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ فقہ حنفی کو پہلا امتیاز تو یہ حاصل ہے کہ وہ فقہاء کرام کی ایک بڑی جماعت کی مشاورت سے تیار ہوا ہے، اور شاید امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ پہلے وہ بزرگ ہیں جنہوں نے فقہی مسائل میں باہمی مشاورت کا باقاعدہ اہتمام فرمایا۔ دوسرا امتیاز یہ ہے کہ چاروں فقہی مذاہب میں فقہ حنفی ہی وہ مذہب ہے جو ایک طویل مدت تک عالم اسلام کے اکثر خطوں میں سرکاری اور عدالتی مذہب بن کر نافذ رہا۔ اس لئے اُس کا عمل کی دنیا میں جتنا تجربہ ہوا، کسی اور مذہب کا نہیں ہوا۔ تیسرے اُس میں بین الاقوامی معاملات پر جتنی تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ امام محمد رحمتہ اللہ علیہ کی السیر الکبیر اور امام سرخسی رحمتہ اللہ علیہ کی شرح السیر الکبیر سے اُس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ کل کی کانفرنس میں بعض شرکاء نے حنفی فقہاء کے اصحاب الرأی میں سے ہونے کی یہ تشریح کی تھی کہ وہ مصلحت وقت کی بنیاد پر نصوص کی تشریح اپنی رائے سے کرتے تھے۔ میں نے اس کی مفصل تردید کرتے ہوئے بتایا کہ ”رأی“ کا لفظ اُس دور میں ایک مخصوص اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا تھا، اور جن حضرات نے اپنا خصوصی مشغلہ حفظ حدیث کے بجائے فقہی مسائل کے استنباط کو بنایا ہوتا تھا، ان کو ”اصحاب الرأی“ کہا جاتا تھا۔ چنانچہ شروع میں یہ لفظ مالکی فقہاء کے لئے استعمال ہوا، جیسا کہ امام ابن عبدالبر رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب ”الاستذکار لما تضمنہ الموطأ من معانی الرأی والآثار“ کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ البتہ بعد میں چونکہ فقہ کو خصوصی مشغلہ بنانے میں فقہاء کوفہ اور بالخصوص فقہاء حنفیہ نمایاں رہے، اس لئے یہ لقب ان کیلئے زیادہ استعمال ہوا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی ذاتی رائے کو نصوص پر ترجیح دی، یا نصوص کی تشریح مسلّم اُصولوں کے بجائے محض اپنی مصلحت پسندانہ رائے سے کی۔ آخر میں میں نے اس پہلو پر زور دیا کہ امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں یہ کانفرنس منعقد کرنے پر تاجکستان مبارکباد کا ضرور مستحق ہے، لیکن امام اعظم کے ساتھ عقیدت ومحبت کا اصل تقاضا یہ ہے کہ انہوں نے

اسلامی قوانین کو مدون کرنے کا جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، اُس سے عالم اسلام اپنی قانون سازی میں استفادہ کرے اور اُسے اپنے قوانین کی بنیاد بنائے۔

حقیقت یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی حیاتِ طیبہ اور ان کے فقہی مقام پر بات کر کے ایک علمی اور نظریاتی لطف تو لیا جا سکتا ہے، لیکن عملی زندگی میں اُس سے فائدہ اُٹھانے کیلئے اس قسم کی کانفرنسوں کی نہیں، عزم و ارادہ کی ضرورت ہے، جس کا ہمارے بیشتر مسلمان ملکوں میں فقدان نظر آتا ہے۔ تاجکستان کے غیر سرکاری حلقے اس حقیقت کو محسوس کر رہے تھے اور ان کی طرف سے کانفرنس کے مقاصد کے بارے میں مختلف باتیں کہی جا رہی تھیں، لیکن یہاں کے حالات کے پس منظر میں وہ تنہا اس بات کو ہی غنیمت سمجھ رہے تھے کہ حکومت نے ایک عظیم دینی شخصیت کی طرف رُخ کیا ہے تو شاید یہ آئندہ دین کے حوالے سے ملک کی پالیسیوں میں کسی بہتری کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ کانفرنس کی افتتاحی مجلس میں صدرِ مملکت نے جو تقریر کی، اُس سے بھی فی الجملہ اس خیال کی کسی قدر تائید ہوتی تھی، کیونکہ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ہمارے ملک کا خمیر توحید کے کلمے پر اُٹھا ہے اور جہاں ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا ملک مادی ترقی کرے، وہاں ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہماری روحانی اور ایمانی اقدار پوری طرح سلامت رہیں۔ خدا کرے کہ ان حضرات کا یہ نیک گمان درست ثابت ہو۔

دوشنبے شہر

میں اپنی تقریر کر کے کانفرنس سے چلا آیا، اور چونکہ گذشتہ رات مجھے دوبارہ درد کا احساس ہوا تھا، اس لئے تقریر کے بعد ایک مرتبہ پھر ہسپتال میں معائنہ کیلئے گیا جس کا نتیجہ الحمدللہ بحیثیت مجموعی اطمینان بخش ہی تھا۔ واپسی میں ساتھیوں نے کہا کہ دوشنبے شہر کا ایک طائرانہ دورہ کر لیا جائے، چنانچہ انہوں نے شہر کے خاص خاص مقامات گاڑی ہی سے دکھائے، اور پھر شہر کے وسط میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر لے گئے جہاں سے پورے شہر کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔

دوشنبے شہر کا ذکر قدیم کتابوں میں نہیں ملتا۔ سوویت یونین کے عہد اقتدار میں اسے استالن آباد کہا جاتا تھا، اور یہ شہر روسیوں نے تین مختلف آبادیوں کو ملا کر بنایا تھا، ان میں سے ایک آبادی دوشنبے اس لئے کہلاتی تھی کہ وہاں پیر کے دن بازار لگا کرتا تھا۔ جب ملک روس سے آزاد ہوا تو اس کا نام دوبارہ دوشنبے رکھ دیا گیا۔ لیکن مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ شہر اُس علاقے میں واقع ہے جسے قدیم کتابوں میں چغانیاں یا صغانیاں کہا گیا ہے، اور جہاں کے بہت سے علماء صاغانی کی نسبت سے مشہور ہیں۔ اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ دوشنبے ہی میں شیخ یعقوب چرخی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے اور ان کے حالات میں یہ مذکور ہے کہ وہ چغانیاں میں مقیم تھے۔ اب میں نے تاجکستان کے متعدد حضرات سے پوچھا تو چغانیاں کے نام سے کوئی شہر یا بستی انہیں معلوم نہیں تھی، قدیم کتابوں میں چغانیاں کا جو تعارف کرایا گیا ہے، اُس سے بھی گمان یہی گزرتا ہے کہ یہ بستی ان تین بستیوں میں سے ایک ہوگی جنہیں ملا کر دوشنبے شہر آباد کیا گیا ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم۔ اگر یہ بات درست ہے تو یہ علاقہ کسی وقت بڑے عظیم علماء کا مرکز رہا ہوگا۔

دریائے ورزوب

دوشنبے شہر یہاں کے مشہور دریا ورزوب کے دونوں طرف آباد ہے۔ شہر سے باہر پہاڑیوں کا ایک دورویہ سلسلہ ہے جس کے درمیان یہ دریا اسی طرح بہتا ہے، جیسے ہمارے ملک میں دریائے سوات یا دریائے کنہار بہتا ہے۔ شہر سے تقریباً تیس کلومیٹر کے فاصلے پر انہی پہاڑیوں اور دریا کے درمیان ایک تفریحی مقام ہے جہاں صدرِ مملکت نے عین دریا کے اوپر اپنا ایک محل بنایا ہوا ہے۔ آج کانفرنس کے مندوبین کو اس محل میں ظہرانہ دیا گیا تھا۔ اگرچہ طبیعت کی کمزوری کی وجہ سے شروع میں وہاں جانے کی ہمت نہیں ہورہی تھی، لیکن ساتھیوں نے کہا کہ وہاں جانے سے اُمید ہے کہ فرحت حاصل ہوگی، اس لئے ہم اس میں شرکت کیلئے روانہ ہوگئے۔ شہر سے نکل کر سارا راستہ دونوں طرف پہاڑوں اور بیچ میں بہتے ہوئے دریا کے خوبصورت مناظر پر مشتمل تھا اور کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی بستیاں بھی

آ جاتی تھیں۔ منزلِ مقصود پر پہنچے تو واقعتاً وہ بڑا فرحت آفریں علاقہ تھا، کچھ کچھ ہمارے سوات کے علاقے میں بحرین کے مشابہ۔ اُس پر یہ صدارتی محل اس تفریحی مقام کے دل میں عین دریا کے اوپر بنایا گیا ہے اور اس کے اطراف میں خوبصورت باغات ہیں جن میں میوہ دار درخت اور پھولوں کے پودے بڑے قرینے سے لگائے گئے ہیں۔ عام حالات میں واقعی یہ خوبصورت مقامات دل ودماغ کی تازگی کا سبب بنتے ہیں، لیکن بیماری کی وجہ سے مجھے کمزوری بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی، اور سخت قسم کی دواؤں نے ایسا لگتا تھا کہ دل ودماغ کو ماؤف کر رکھا ہے۔ اس لئے طبیعت ان مناظر سے لطف لینے کے بجائے اس فکر میں رہی کہ کب جلد از جلد یہاں سے واپس جا کر آرام کیا جائے۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ:

نہ کلی ہے وجہ نظر کشی، نہ کنول کے پھول میں تازگی
فقط ایک دل کی شگفتگی، سببِ نشاطِ بہار ہے

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر آن ہم پر اپنی بیشمار نعمتوں کی جو بارش کی ہوئی ہے، ان میں دل کی شگفتگی ایسی نعمت ہے جو خالص اللہ تبارک وتعالیٰ کی عطا ہے، اور اُسے بڑی سے بڑی دولت خرچ کر کے بھی خریدا نہیں جا سکتا۔ اکثر اوقات یہ نعمت ہمیں مفت حاصل رہتی ہے، مگر دن رات اس سے نہال ہونے کے باوجود ہم اس کا شکر تو کیا ادا کرتے، اکثر اُس کے احساس واعتراف سے بھی غافل رہتے ہیں اور جب کبھی وہ رخصت ہو جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ کیسی بڑی نعمت تھی، اور اُس وقت بھی شکر کے بجائے اکثر ناشکری کے کلمات زبان سے نکل جاتے ہیں۔ اگر انسان حاصل شدہ نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈال لے تو اللہ تبارک وتعالیٰ سے اُس کا تعلق مضبوط ہو، اور اس کی دنیا اور آخرت سنور جائے۔

ظہرانے سے واپس آنے کے بعد عصر پڑھ کر ہم نے کچھ دیر آرام کیا، اس دوران تقریباً ایک گھنٹے مجھے گہری نیند آ گئی، جس نے جسم وجان کو سیراب کر دیا۔ اندازہ ہوا کہ نیند بھی کتنی بڑی نعمت ہے، قرآن کریم کی آیت یاد آئی:

وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتاً. (النباء۔۷۸:۹)

”اور تمہاری نیند کو تھکن دور کرنے کا سبب ہم نے بنایا۔“

مغرب کی نماز پڑھ کر طبیعت بڑی حد تک بحال ہو چکی تھی، اور سوچا کہ دوشنبے میں قیام کا بس ایک دن اور باقی ہے جس کا نظم پہلے سے طے ہو چکا ہے۔ اس لئے بعد مغرب کے اس وقت سے حضرت شیخ یعقوب چرخی رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد میں حاضری دینے اور اُن کے مزار پر سلام عرض کرنے کا فائدہ اُٹھایا جائے۔ مولانا حکمت اللہ اور مولانا فرخ صاحبان دو دن سے ہر وقت ہمارے ساتھ تھے، اور ہوٹل میں بھی ساتھ مقیم تھے، ان کی رہنمائی میں ہم ہوٹل سے روانہ ہوئے، اور تھوڑی دیر ہی میں منزل تک پہنچ گئے۔ وہاں جا کر دیکھا کہ ہمارے وہاں آنے کی خبر پا کر کچھ اور ساتھی بھی پہنچے ہوئے تھے۔

شیخ یعقوب چرخی رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد میں

حضرت شیخ یعقوب چرخی رحمۃ اللہ علیہ اصلاً غزنی کے قریب ایک بستی چرخ کی طرف منسوب ہیں۔ وہ نقشبندی سلسلے کے بانی حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب میں سے تھے۔ لیکن حضرت نے انہیں اپنے خلیفہ حضرت علاؤالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کر دیا تھا۔ جو چغانیاں میں مقیم تھے، اس لئے وہ بھی یہاں آ کر مقیم ہو گئے تھے۔ اور انہی کے اصحاب میں شمار ہوئے۔ وہ صوفیاء کرام میں بلند مرتبہ کے حامل تھے۔ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ ان کے خلیفہ تھے، جن سے نقشبندی سلسلے کی ایک مستقل شاخ چلی ہے۔ حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب نفحات الانس میں اور حضرت شیخ ہاشم کشمی رحمۃ اللہ علیہ نے نسمات القدس میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔

یہاں ان کے مزار کے پاس ایک مسجد ہے جس کے صحن کے چاروں طرف کچھ اس قسم کی عمارتیں بنی ہوئی ہیں جیسے وہ کسی وقت مدرسہ رہی ہوں۔

پھر مسجد کی مشرقی سمت میں ان کا مزار واقع ہے۔ ان کو سلام عرض کرنے اور ایصال

ثواب کی توفیق ہوئی۔

ایران کے دارالعلوم زاہدان کے مہتمم مولانا عبدالحمید صاحب بھی کانفرنس میں شرکت کیلئے آئے ہوئے تھے۔ رات کے وقت وہ ملاقات کیلئے تشریف لے آئے۔ ملاقات کے علاوہ ہم نے اس موضوع پر بھی گفتگو کی کہ تاجکستان کے طلبہ کی اچھی خاصی تعداد جو دینی علوم کی تحصیل کیلئے پاکستان یا ایرانی بلوچستان جاتی ہے اور پھر یہاں آ کر دینی خدمات انجام دینا چاہتی ہے، ہم اپنے قیام کے دوران ان کی مشکلات دور کرنے کیلئے کیا کر سکتے ہیں۔ بعض طریقے سوچے گئے اور ان کے بارے میں حکومت تاجکستان کے ذمہ داروں اور پاکستانی سفارت خانے سے بات کرنا طے ہوا۔ اوّل الذکر کی ذمہ داری مولانا عبدالحمید صاحب نے لی، کیونکہ ابھی انہیں کئی دن تک یہاں رہنا تھا، اور ثانی الذکر کے بارے میں ہم نے کوشش کا ارادہ کیا۔

اگلا دن بدھ تھا اور ہم نے کانفرنس کے منتظمین سے اجازت لی ہوئی تھی کہ دارالعلوم کراچی یا پاکستان کے دوسرے دینی مدارس میں پڑھے ہوئے تاجکستانی طلبہ سے اب تک ہمیں تفصیلی ملاقات اور گفتگو کا موقع نہیں مل سکا، اس لئے ہم ان کے نظم سے ہٹ کر آج ان سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ایک تاجکستانی تاجر کے دفتر میں جو ایک بڑے احاطے میں واقع تھا، اپنے ان ساتھیوں کو جمع کیا گیا تھا، وہاں یہ حضرات جمع ہوئے، ان کے حالات اور مسائل سے فی الجملہ واقفیت ہو چکی تھی، اس لئے میں نے ان سے اس موضوع پر بات کی کہ موجودہ حالات میں انہیں کس طرح کام کرنا چاہئے۔ صورتحال کچھ ایسی بنی ہوئی ہے کہ ان حضرات کو تاجکستان میں کوئی دینی خدمت انجام دینے میں دوطرفہ مشکلات کا سامنا ہے۔ ایک طرف چونکہ پاکستان کے بارے میں ہماری غلط حکمت عملی کے نتیجے میں یہ تاثر عام کر دیا گیا ہے کہ یہ دہشت گردوں کا ملک ہے، اس لئے یہاں سے پڑھ کر جانے والوں کو حکومتی حلقوں میں شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ دوسرے اس ملک میں جو قدیم طرز کے علماء اثر ورسوخ رکھتے ہیں، ان کا یہ کارنامہ تو ناقابل انکار ہے کہ انہوں نے

سوویت یونین کے جبر و استبداد کے دور میں دین کی حفاظت کیلئے اپنی جانیں لڑا دیں، اور ہر طرح کی قربانیاں دیکر اپنے دین کو محفوظ رکھا، لیکن اتنے عرصے تک علومِ اسلامی کے مراکز سے کٹے رہنے کی بناء پر ان میں کچھ ایسے نظریات اور ایسے طریقے جاری ہو گئے ہیں جو قابل اصلاح ہیں۔ جو طلبہ دینی علوم سے آراستہ ہو کر وہاں جاتے ہیں، وہ ان طریقوں سے متفق نہیں ہو پاتے تو یہ قدیم طرز کے علماء بھی انہیں شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس طرح ان حضرات کو دوہری رکاوٹوں کا سامنا ہے۔ تیسرے ابھی تک اس ملک میں دینی تعلیم وتربیت کا کوئی ایسا انتظام نہیں ہے جس کے ذریعے یہ حضرات یہاں دینی خدمات انجام دے سکیں۔ میں نے ان سے یہ گذارش کی کہ وہ حکمت اور تدریج کے ساتھ الاھم فلاھم کے اُصول پر کام کریں، اپنے لئے کوئی بھی معاشی مشغلہ اختیار کر کے مساجد کے ذریعے انفرادی دعوت اور تعلیم کا کام کرتے رہیں۔ اس سلسلے میں وہاں کے حالات کے مطابق جو مشورے مناسب معلوم ہوئے، دیئے گئے۔ ان حضرات نے بہت سے فقہی سوالات لکھے ہوئے تھے، دیر تک ان کے جوابات کا سلسلہ رہا۔ مولانا معین الدین صاحب عرصہ پہلے دارالعلوم کراچی سے فارغ التحصیل ہو کر گئے تھے، انہوں نے مجھ سے جامع ترمذی پڑھی تھی۔ الحمدللہ وہ یہاں بڑی سمجھ داری سے کام کر رہے ہیں۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ دوشنبے میں ان نوجوان علماء نے انہیں اپنا بڑا مانا ہوا ہے اور ہر کام ان کے مشورے سے کرتے ہیں۔ اس مجلس کے نتیجے میں جو تقریباً دو گھنٹے جاری رہی، ان حضرات کی کافی تشفی ہوئی اور کئی روز سے مفصل ملاقات نہ ہونے کا جو احساس چل رہا تھا وہ دور ہوا۔

واپسی میں مولانا معین الدین صاحب کی مسجد میں بھی مختصر حاضری اور دعا ہوئی۔ اسکے بعد سفیر پاکستان جناب خالد عثمان صاحب نے پاکستان سے آئے ہوئے وفد کے اعزاز میں ظہرانہ دیا ہوا تھا۔ چنانچہ تقریباً ایک بجے ہم پاکستانی سفارت خانے میں پہنچے۔ عام طور سے ہمارے سفارت خانوں کے بارے میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ ملک کی کماحقہٗ نمائندگی کا حق ادا نہیں کرتے۔ لیکن یہاں کے سفارت خانے کو ہم نے اس عام تاثر سے مختلف پایا۔

جناب خالد عثمان صاحب ماشاء اللہ ایک فعال اور محبِ وطن انسان ہیں، انہوں نے تاجکستان میں ملک کے مفادات کا تحفظ کرنے کی جو کوششیں کی ہیں، ان کی تفصیل بیان فرمائی۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ یہاں پاکستانی مصنوعات کی کھپت کے بڑے روشن امکانات ہیں، اور وہ اس ملک سے تجارت بڑھانے کیلئے کیا اقدامات کررہے ہیں۔ ان سے تاجکستانی طلبہ کو ویزا جاری کرنے کے بارے میں بھی بات ہوئی۔ انہوں نے اس کا طریق کار بتایا، اور یقین دہانی کی کہ ملک کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ اس کی پوری کوشش کریں گے کہ لوگوں کو ویزا کے اجراء میں غیر ضروری زحمت نہ اُٹھانی پڑے۔ میری بیماری کے دوران انہوں نے جس محبت سے میرا خیال رکھا، اور ان کی اہلیہ محترمہ نے میرے لئے پرہیزی کھانا بھجوانے کا جو اہتمام کیا اُس پر میں نے ذاتی طور پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں اس کی بہترین جزا دنیا وآخرت میں عطا فرمائیں، اور ملک وملت کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

بشکیک میں

اگلا دن بدھ تھا اور دس بجے صبح ہماری واپسی کا سفر شروع ہونا تھا۔ چنانچہ ہوٹل میں اور اس کے بعد ہوائی اڈے پر الوداع کہنے والوں سے ملتے ملاتے ہم دس بجے کرغیزستان ایئرویز کے طیارے میں سوار ہوگئے۔ تاجکستان اگرچہ کرغیزستان کے مقابلے میں پاکستان سے زیادہ قریب ہے، چنانچہ اگر اسلام آباد سے دوشنبے کیلئے کوئی براہِ راست پرواز ہو تو یہ سفر شاید ڈیڑھ گھنٹے میں پورا ہوجائے، لیکن چونکہ کوئی براہِ راست پرویز میسر نہیں ہے۔ اس لئے آمد ورفت دونوں میں پہلے کرغیزستان جانا پڑتا ہے، پھر وہاں سے لوٹ کر آنا پڑتا ہے۔ پھر کرغیزستان کے دار الحکومت بشکیک کیلئے بھی اسلام آباد سے ہفتے میں صرف ایک پرواز ہے جو جمعہ کے دن آتی جاتی ہے۔ اس لئے ہمیں جمعرات کو بشکیک پہنچ کر ڈیڑھ دن وہاں رُکنا تھا۔ میں تین سال پہلے جب کرغیزستان آیا تھا تو یہاں کے ایک تاریخی شہر اوزجند جانے کی

خواہش تھی اور اس کے لئے اوش تک سفر بھی کیا تھا، لیکن اُن دنوں اوزجند میں کچھ بدامنی تھی جس کی وجہ سے وہاں کا راستہ بند کردیا گیا تھا اور میں وہاں نہیں جاسکا تھا۔ اس مرتبہ جناب جاوید ہزاروی صاحب اور بشکیک کے احباب نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ جب ہم دوشنبے سے بشکیک واپس آئیں تو ہوائی اڈے ہی سے جہاز کے ذریعے اوش جائیں، اور وہاں سے کار کے ذریعے اوزجند جاکر وہیں قیام کریں اور جمعہ کو واپس آکر پاکستان روانہ ہوں، لیکن جب میں دوشنبے میں بیمار ہوا تو دوستوں کی رائے یہ ہوئی کہ اس حالت میں یہ پُرمشقت سفر مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ وہیں سے فون کے ذریعے بشکیک کے حضرات کو یہ پروگرام ملتوی کرنے کیلئے کہہ دیا گیا تھا اور انہوں نے خریدے ہوئے ٹکٹ بھی واپس کردیئے تھے، اور ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ بشکیک کے قیام کے دوران کوئی پروگرام نہ رکھیں، اور یہ وقت مکمل آرام کیلئے مخصوص رکھا جائے۔

جب ہم بشکیک پہنچے تو مولانا محمد علی، مختار صاحب اور متعدد احباب نے حسبِ توقع استقبال کیا اور اگرچہ ایئر لائنز کی طرف سے ہمارے لئے ایک ممتاز ہوٹل میں بکنگ موجود تھی، لیکن بشکیک کے ایک مشہور تاجر جناب ثمر صاحب کی فرمائش پر احباب نے قیام کا انتظام اِن کے مکان پر کیا ہوا تھا، جو شہر کے نہایت پرفضا مقام پر تمام سہولیات سے آراستہ ہے۔ ثمر صاحب خود ہوائی اڈے پر آئے ہوئے تھے، اور ان کا کہنا تھا کہ میں مدتِ دراز سے آپ سے ملاقات کا خواہشمند تھا اور اس کیلئے پاکستان کا سفر کرنا چاہتا تھا لیکن جب آپ کے آنے کی اطلاع ملی تو میں نے اسے اپنے لئے ایک خداساز سامان سمجھا اور مولانا محمد علی اور مختار صاحب سے فرمائش کی کہ قیام میرے یہاں ہو جسے انہوں نے منظور کرلیا۔

بشکیک کا موسم انتہائی خوشگور تھا، بادل چھائے ہوئے تھے اور فضا میں اُس قسم کی خنکی تھی جو ہمیشہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ طبیعت دوشنبے ہی میں کچھ بحال ہوچکی تھی۔ یہاں کے موسم، فضا اور میزبانوں کی محبت وخلوص نے اس میں مزید اُبھار پیدا کردیا۔ مختار صاحب نے میری طبیعت پرنشاط دیکھا تو کہا کہ اوزجند کا پرگرام اب بھی ہوسکتا ہے اور وہ اس طرح کہ

آج آپ مکمل آرام کریں اور کل صبح ہم آٹھ بجے کے طیارے سے اوش اور وہاں سے اوزجند چلے جائیں اور دوپہر تک وہاں رہ کر سہ پہر میں وہاں سے واپس آجائیں چونکہ بشکیک سے اسلام آباد کیلئے طیارے کو شام ساڑھے سات بجے روانہ ہونا ہے، اس لئے آپ وقت سے کافی پہلے واپس پہنچ جائیں گے۔ اس طرح آپ کی خواہش بھی پوری ہوجائیگی اور اوزجند کے علماء اور معززین جو آپ کے دورے کی منسوخی سے رنجیدہ تھے وہ بھی خوش ہوجائیں گے۔ میں نے بھی سوچا کہ نہ جانے پھر کبھی آنا ہو یا نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کے نام پر رضامندی کا اظہار کردیا۔ ثمر صاحب نے بڑی محبت اور شائستگی سے آرام کا اتنا اچھا انتظام کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے دوپہر کے آرام کے بعد طبیعت اور بہتر ہوگئی۔ عصر کے بعد انہوں نے کہا کہ میں نے بشکیک کے نواحی علاقے میں ایک مسجد تعمیر کی ہے اور اس کے ساتھ ایک مدرسہ بھی۔ ابھی تک اس میں نماز شروع نہیں ہوئی میرا دل چاہتا ہے کہ وہاں پہلی نماز آپ پڑھائیں۔ گاڑی میں چلیں تو ہم مغرب کی نماز وہاں پڑھ سکتے ہیں۔ میں نے بھی اسے اپنے لئے سعادت سمجھا چنانچہ ہم وہاں گئے۔ وسط ایشیاء کی مسلم ریاستوں میں کرغیزستان ہی ایسا ملک ہے جہاں مسجدوں اور مدرسوں پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ چنانچہ وہاں کئی دینی مدارس قائم ہوچکے ہیں جن میں ایک مدرسہ ہمارے رفیق سفر جناب جاوید ہزاروی صاحب نے قائم کیا ہوا ہے، اور ایک مدرسہ مولانا محمد علی صاحب نے۔ اب یہ ایک اور مدرسہ ثمر صاحب قائم کرنا چاہتے ہیں اور وہاں جاکر دیکھا تو انہوں نے ماشاء اللہ بڑی خوش ذوقی اور محبت سے یہ مسجد اور مدرسہ تعمیر کیا ہے۔ یہاں تعمیر کے اخراجات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ساری تعمیر ماشاءاللہ ثمر صاحب نے اپنے ذاتی خرچ پر کی ہے۔ یہاں ہم نے نمازِ مغرب پڑھی اور اس طرح مسجد میں نماز کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

رات کو عشاء کے بعد کچھ ملنے والے حضرات آگئے اور ان کے ساتھ کچھ دیر دینی باتوں اور سوال و جواب کا سلسلہ رہا اور اس کے بعد آرام۔ اگلے دن صبح آٹھ بجے میں مختار

صاحب کے ساتھ ہوائی اڈے پر پہنچ کر اوش جانے کیلئے جہاز میں سوار ہوا، دوسرے رفقاء کو سیٹ نہ مل سکی اس لئے وہ بشکیک ہی میں رہ گئے۔ اگرچہ اوش یہاں سے تقریباً چھ سو کلومیٹر دور ہے لیکن چھوٹا سا جیٹ طیارہ پچاس منٹ میں منزل تک پہنچ گیا۔ میں اوش پہلے بھی آچکا ہوں اور کرغیزستان کے سفرنامے میں اُس کا تعارف بھی کرا چکا ہوں اور اس سفر میں یہ نئی بات معلوم ہوئی جس کی کتابوں سے تصدیق بھی ہوگئی کہ اوش حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی جائے پیدائش اور ان کا اصل وطن بھی ہے۔ لیکن اس وقت یہاں قیام پیش نظر نہیں تھا بلکہ یہاں سے پینتالیس کلومیٹر دور اوزجند جانا تھا۔ اس کیلئے مختار صاحب کے ایک دوست نے اپنی لینڈ کروزر ہوائی اڈے پر ہی بھیجی ہوئی تھی۔ اُس وقت نو بجے تھے اور ہمیں سوا دو بجے دوبارہ یہاں سے واپس بشکیک جانے کیلئے طیارے میں سوار ہونا تھا۔ اس لئے ٹکٹ یہاں کے وی آئی پی لاؤنج کے ذمہ داروں کے حوالے کر دیا گیا کہ وہ بورڈنگ کارڈ لیکر رکھیں، اور لینڈ کروزر ہمیں لیکر اوزجند کیلئے روانہ ہوئی۔ سڑک صاف تھی، اور 45 کلومیٹر کا یہ فاصلہ آدھے گھنٹے سے بھی کچھ کم میں طے ہوگیا۔

قاضی خان رحمہ اللہ کے شہر میں

اوزجند شہر کو اوزگند بھی کہا جاتا ہے اور یہ ماوراء النہر کے مردم خیز خطے فرغانہ کے صوبے میں واقع ہے جس کا بیشتر حصہ اب ازبکستان میں ہے۔ یوں تو اوزجند سے بڑی بڑی نامی گرامی شخصیات پیدا ہوئی ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ مشہور شخصیت علامہ قاضی خان رحمۃ اللہ علیہ کی ہے جن کے فتاویٰ فقہ حنفی میں مسلم الثبوت بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ مشہور حنفی فقیہ شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ اسی شہر میں مدتوں قید رہے ہیں، اور یہیں پر انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''المبسوط'' تالیف کی ہے۔ ان کی قبر بھی اسی شہر میں ہے۔

اس شہر میں ایک مینار ہے جو قدامت کے باوجود اپنے شکوہ سے ہر دیکھنے والے کو متاثر کرتا ہے۔ اس مینار کے سامنے کھدائی کے نتیجے میں ایک وسیع وعریض مدرسے کے آثار

برآمد ہوئے ہیں، جس کے بارے میں گمان یہ ہے کہ وہ علامہ قاضی خان رحمتہ اللہ علیہ کا مدرسہ تھا، اور شاید یہ مینار اُسی مدرسے یا اُس سے متصل مسجد کا مینار رہا ہو۔ ہمارے رہنما نے گاڑی اسی مینار کے پاس جاکر روکی۔ مختار صاحب کے دوست جنہوں نے گاڑی بھیجی تھی، ان کا نام بھی مختار ہے اور وہ اس صوبے کے گورنر کے رشتہ دار ہیں، اور ہمارے وہاں پہنچتے ہی گورنر صاحب اور مختار صاحب بھی ہمارے استقبال کیلئے وہیں آگئے، اور اپنے ساتھ آثارِ قدیمہ کے ایک ماہر کو بھی لیکر آئے۔ جنہوں نے اس مینار اور ان آثار کے بارے میں اپنی معلومات سے ہمیں آگاہ کیا۔ میں نے گورنر صاحب سے کہا کہ آپ کو ایک ایسے علاقے کی خدمت کا شرف حاصل ہے جو صدیوں تک علم اور تقویٰ کا مرکز رہا ہے۔ میں نے انہیں خاص طور پر علامہ قاضی خان اور شمس الائمہ سرخسی رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے کہا کہ شروع میں ہم اس شہر کی اس علمی اہمیت سے آگاہ نہیں تھے۔ بعد میں جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ یہاں سے اتنی عظیم شخصیات پیدا ہوئی ہیں تو ہم اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتے ہیں۔ ہم نے یہاں کھدائی کرکے اس مدرسے کے آثار برآمد کئے ہیں، اور یہاں ہم اس مدرسے کی یادگار باقی رکھنے کیلئے تعمیری کام کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے جرمنی کی ایک ٹیم یہاں آئی تھی، اور اس نے اس جگہ کو محفوظ رکھنے کیلئے ایک جنگلے کی چاردیواری اپنے خرچ پر تعمیر کی ہے۔ اگر اسلامی ممالک بھی اس کام میں دلچسپی لیں تو یہاں بہت سے مفید کام ہوسکتے ہیں۔

علامہ قاضی خان رحمتہ اللہ علیہ کا پورا نام حسن بن منصور اوزجندی ہے، اور فخرالدین ان کا لقب ہے۔ یہ چھٹی صدی ہجری کے فقہاء میں سے ہیں۔ ان کے دادا محمود بن عبدالعزیز اوزجندی رحمتہ اللہ علیہ شمس الائمہ سرخسی رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، اور قاضی خان نے اپنے دادا کے علاوہ علامہ ظہیرالدین مرغینانی رحمتہ اللہ علیہ سے بھی فقہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ شہر مرغینان جو صاحب ہدایہ کا بھی وطن ہے، یہاں سے بہت قریب ازبکستان میں واقع ہے۔ فتاویٰ قاضی خان کے علاوہ فقہ پر ان کی اور بھی متعدد تصانیف ہیں جن میں امام

محمد رحمۃ اللہ علیہ کی جامع صغیر کی شرح اور علامہ خصاف رحمۃ اللہ علیہ کی ادب القضاء کی شرح بھی داخل ہے۔ ان کی وفات ۵۹۲ھ میں ہوئی۔ یہ مدرسہ اگرچہ اب کھنڈر ہو چکا ہے، لیکن یہاں کی فضاء میں اِن جبالِ علم وتقویٰ کے انفاسِ قدسیہ کی مہک محسوس ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ رحمھم اللہ تعالیٰ

امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کے محلے میں

یہاں سے ہم اوزجند کے پرانے محلوں سے گزرتے ہوئے ایک محلے میں پہنچے جہاں شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر بتائی جاتی ہے۔ یہ قبر ایک گنجان آبادی کے درمیان واقع ہے، اور آثارِ قدیمہ کے لوگوں نے بتایا کہ اس قبر پر ایک بہت پرانا کتبہ لگا ہوا تھا جس پر شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کا نام لکھا ہوا تھا۔ آثارِ قدیمہ کے لوگ اسے روس لے گئے تھے۔ ہم جب اس قبر کے پاس پہنچے تو شہر کی انتظامیہ کے کچھ اعلیٰ افسر ہمارے ساتھ تھے۔ انہوں نے بتایا کہ جب ہمیں صاحب قبر کی اہمیت اور عظمت کا علم ہوا تو ہم نے یہاں اس قبر کے قریب ایک مسجد اور مدرسہ تعمیر کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن یہ پورا علاقہ مکانات کی گنجان آبادی سے گھرا ہوا تھا اور یہاں کے لوگ کہیں اور منتقل ہونے کو تیار نہیں تھے، لیکن جب انہیں بتایا گیا کہ یہاں ایک بہت بڑے عالم کی یادگار کے طور پر ایک مسجد و مدرسہ تعمیر کرنے کا ارادہ ہے تو یہاں کے مکین اپنی جگہ مناسب قیمت پر چھوڑنے کیلئے تیار ہو گئے۔ یہاں مجوزہ مسجد اور مدرسہ کا نقشہ بھی لگا ہوا تھا۔ اس نقشے سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ قبر کو بھی پختہ کر کے اُس پر گنبد بنانے کا ارادہ ہے۔ میں نے انتظامیہ کے لوگوں سے کہا کہ قبر کو پختہ بنانا اور اُس پر گنبد تعمیر کرنا درست نہیں ہے، اور خود علامہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ اس کو ہرگز پسند نہ کرتے، اس لئے نقشے میں یہ تبدیلی کرنی چاہئے۔ انہوں نے اس پر غور کرنے کا وعدہ تو کیا، لیکن معلوم نہیں وہ کس حد تک اس پر عمل کر پائیں گے۔

امام سرخسی رحمتہ اللہ علیہ اور کنویں میں مبسوط کی تالیف

شمس الائمہ سرخسی رحمتہ اللہ علیہ (متوفی ۴۳۸ھ) کا پورا نام محمد بن احمد ابوبکر سرخسی ہے، وہ پانچویں صدی کے ان علماء میں سے ہیں جنہیں آیۃ من آیات اللہ کہنا چاہئے۔ اصل میں تو وہ خراسان کی ایک بستی سرخس کی طرف منسوب ہیں، لیکن شاید حصولِ علم کیلئے فرغانہ کے اس علاقے میں آئے ہونگے۔ انہوں نے حاکم وقت کی مرضی کے خلاف کوئی فتویٰ دیا، یا کوئی بات بطورِ نصیحت کہی جس کی پاداش میں حاکم وقت خاقان نے انہیں ایک کنویں نما گڑھے میں قید کر دیا۔ وہ بات کیا تھی جس پر حاکم وقت نے انہیں اتنی سخت سزا دی؟ اس کی تفصیل کسی مستند ذریعے سے معلوم نہیں ہوسکی۔ ڈاکٹر صلاح الدین منجد نے شرح السیر الکبیر کے مقدمے میں ایک وجہ بیان کی ہے کہ خاقان نے اپنی ایک کنیز کو آزاد کر کے عدت سے پہلے ہی اس سے نکاح کر لیا تھا۔ امام سرخسی رحمتہ اللہ علیہ نے اس پر اعتراض کیا تھا۔ مگر اس کا کوئی حوالہ انہوں نے نہیں دیا اور اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ ان کی رہائی کے بعد کا مستند تذکروں میں ملتا ہے، ہوسکتا ہے کہ کسی کو اس سے اشتباہ ہوگیا ہو۔ وجہ کوئی بھی ہو حاکم وقت نے انہیں کسی حق کے کلمے کی پاداش میں اس سخت آزمائش میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ سالہا سال کیلئے ایک کنویں نما گڑھے میں قید کر دیئے گئے جہاں ان کیلئے چلنا پھرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ شمس الائمہ سرخسی رحمتہ اللہ علیہ نے مبسوط کی کتاب السیر کے آخر میں یہ بات لکھی ہے کہ انہیں ایک حق کے کلمے کی وجہ سے قید کیا گیا تھا، لیکن اس کی تفصیل بیان نہیں فرمائی۔ (ان کی عبارت آگے آرہی ہے)

ظاہر ہے کہ ان کے شاگردوں کو اس واقعے سے کتنا دُکھ ہوا ہوگا، انہوں نے اپنے استاذ کی دل بستگی کیلئے درخواست کی کہ ہم روزانہ اس کنویں کے منہ پر آجایا کریں گے، آپ ہمیں کچھ املا کرا دیا کریں۔ شمس الائمہ سرخسی رحمتہ اللہ علیہ پہلے سے چاہتے تھے کہ امام حاکم شہید رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب الکافی کی شرح لکھیں۔ چنانچہ انہوں نے اسی کنویں سے اپنی عظیم کتاب ''المبسوط'' املا کرانی شروع کی اور علم کی تاریخ کا یہ منفرد شاہکار اوز جند کے ایک

کنویں نما قید خانے میں اس طرح وجود میں آیا کہ تیس ضخیم جلدوں کی یہ کتاب کنویں سے بول بول کر کنویں کے منہ پر بیٹھے ہوئے شاگردوں کو لکھوائی گئی۔ کتاب کے مقدمے میں خود شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

> **فرأيت الصواب فی تأليف شرح المختصر لاأزيد على المعنی المؤثر فی بيان كل مسألة اكتفاء بما هو المعتمد فی كل باب وقد انضم الی ذلک سوال بعض الخواص من أصحابی زمن حبسی حين ساعدونی لأنسی أن أملی عليهم ذلک فأجبتهم اليه.** (المبسوط۔ ص۵۔ ج۱)

> ”میں نے یہ مناسب سمجھا کہ مختصر (حاکم) کی ایک شرح لکھوں، جس میں ہر مسئلے کے بارے میں راجح بات پر کوئی اضافہ نہ کروں اور ہر باب میں صرف وہ حکم بیان کروں جو قابل اعتماد ہو۔ اس پر مزید اضافہ یہ ہوا کہ میرے ساتھیوں میں سے کچھ خاص لوگوں نے میری قید کے زمانے میں مجھ سے اس کی فرمائش بھی کی اور میری اُنسیت کی خاطر میری یہ مدد کی کہ میں انہیں یہ شرح املا کرادیا کروں، چنانچہ میں نے ان کی اس فرمائش کو قبول کیا۔“

چنانچہ جن شاگردوں نے شرح لکھنی شروع کی، ان کا یہ جملہ کتاب کے بالکل شروع میں موجود ہے کہ:

> **قال الامام الاجل الزاهد شمس الائمة ابوبكر محمد بن ابی سهل السرخسی رحمه الله ونور**

ضریحه وهو فی الحبس باوزجند املاءً.

امام اجل شمس الائمہ سرخسی رحمتہ اللہ علیہ نے اوزجند میں قید ہونے کی حالت میں فرمایا:

پھر امام سرخسی رحمتہ اللہ علیہ کے تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ کنویں سے جو املا کراتے تھے، وہ خالص اپنی یادداشت کی بنیاد پر املا کراتے تھے، کسی کتاب کی مدد انہیں حاصل نہیں تھی۔ اور یہ بات ظاہر بھی ہے کہ کنویں میں قید ہونے کی حالت میں دوسری کتابوں سے باقاعدہ استفادہ بظاہر ممکن نہیں تھا۔ جن حضرات نے مبسوط سے استفادہ کیا ہے، وہ اس کرامت کا صحیح اندازہ کرسکتے ہیں کہ اتنی تحقیقی کتاب جو بعد والوں کیلئے فقہ حنفی کا مستند ماخذ بن گئی، کس طرح تمام تر حافظے سے لکھوائی گئی ہے۔ یہ حقیقت ذہن نشین ہو تو اس روایت کی صحت کا اندازہ ہوسکتا ہے جو متعدد تذکرہ نگاروں نے نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ وہ اپنے درس کے حلقے میں بیٹھے ہوئے تھے، کسی نے کہا کہ امام شافعی رحمتہ االلہ علیہ کے بارے میں منقول ہے کہ ان کو تین سو کرّاسے (یعنی کاپیاں) حفظ یاد تھیں۔ اس پر امام سرخسی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا: ''حفظ الشافعی زکوۃ محفوظی'' یعنی مجھے جتنا یاد ہے امام شافعی کو اس کی زکوٰۃ یاد تھی۔ (الجواهر المضیئة للقرشی۔ ج ۳، ص ۸۰)۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ علامہ سرخسی رحمتہ اللہ علیہ کو امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ سے تقریباً چالیس گنا زیادہ باتیں یاد تھیں، اور انہوں نے جس حالت میں جس طرح مبسوط لکھوائی ہے، اُس کے پیش نظر یہ بات کچھ زیادہ بعید معلوم نہیں ہوتی۔ ایک کنویں یا گڑھے میں بند ہونے کی حالت میں اس عظیم شخصیت پر کیا گذرتی ہوگی؟ اس کا اندازہ بھی ہمارے لئے مشکل ہے اور خود انہوں نے مبسوط کی تالیف کے دوران مختلف ابواب کے آخر میں اپنی حالت کا بڑے پُر درد الفاظ میں ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ عبادات کے مسائل چار جلدوں میں لکھوانے کے بعد کتاب المناسک (حج) کے آخر میں وہ فرماتے ہیں:

هذا آخر شرح العبادات بأوضح المعانی وأوجز

العبارات أملاه المحبوس عن الجُمَع والجماعات، مصليا على سيّد السادات، محمد المبعوث بالرسالات، و على أهله من المؤمنين والمؤمنات. تم كتاب المناسك ولله المنة وله الحمد الدائم الذى لايفنى أمده ولاينقضى عدده.

(المبسوط۔ ج:۳، ص:۳۴۸)

''یہ واضح ترین مضامین اور مختصر ترین عبارت میں عبادات کی شرح کا آخری حصہ ہے، جسے ایک ایسے شخص نے املا کرایا ہے جو اس طرح قید میں ہے کہ نہ جمعہ میں حاضری دے سکتا ہے، نہ جماعت سے نماز پڑھ سکتا ہے (البتہ) سیّد السادات جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو اللہ تعالیٰ کے پیغامات لے کر مبعوث ہوئے تھے ان پر اور جو مؤمن مرد اور عورتیں آپ کے اہل میں داخل ہیں، ان پر درود بھیجتے ہوئے اس حصے کو لکھوایا ہے۔ (اس طرح) کتاب الحج اللہ تعالیٰ کے احسان سے پوری ہوگئی ہے۔ بے شمار ابدی تعریفیں اسی کی ہیں جن کی کوئی انتہاء نہیں۔''

اس عبارت میں اس دلی حسرت کا انتہائی مؤثر اظہار ہے کہ چار ضخیم جلدوں میں نماز اور دوسری عبادتوں کے احکام ایسی حالت میں لکھوائے گئے ہیں جب خود مؤلف جماعت سے نماز پڑھنا تو کجا، جمعہ میں حاضر ہونے سے بھی محروم ہے۔ لیکن آزمائش کی حالت میں یہ عظیم خدمت انجام دینے پر اللہ تعالیٰ نے انہیں جمعہ اور جماعت کے ثواب سے بھی نہ جانے کتنا زیادہ نوازا ہوگا۔ اعلیٰ اللہ تعالیٰ درجاتہ۔

اور پانچویں جلد میں کتاب النکاح کے ختم پر فرماتے ہیں:

هـذا آخـر شـرح كتاب النكاح بالمأثور من المعانى والآثار الـصـحـاح أمـلاه الـمنتظر للفرج والفلاح مـصـليـا عـلـى الـمبعوث بالحق بالسيوف والرماح وعـلـى آلـه وأصـحـابـه أهـل التقى والصلاح الذين مهدوا قواعد الحق وسلكوا طريق النجاح.

(ج:۵،ص:۵۱۲)

’’نکاح کے بارے میں جو مضامین صحیح روایتوں پر مبنی ہیں، یہ ان کا آخری حصہ ہے، جسے ایک رہائی اور کامیابی کے منتظر شخص نے اس حالت میں املا کرایا ہے کہ وہ اُس ذات (ﷺ) پر درود بھیجتا ہے جسے حق دے کر نیزہ وتلوار کے ساتھ بھیجا گیا تھا اور اُن کے آل و اصحاب پر جو صلاح وتقویٰ کے حامل تھے جنہوں نے حق کی راہیں ہموار کیں اور کامیابی کے راستے پر چلے۔‘‘

پھر ساتویں جلد میں کتاب الطلاق کے ختم پر فرماتے ہیں:

هـذا آخـر شرح كتاب الطلاق بالمؤثرة من المعانى الـدقـاق أمـلاه الـمـحـصـور عـن الانطلاق المبتلى بـوحشة الـفـراق مـصـليـا عـلى صاحب البراق وعلى آلـهٖ واصـحـابـهٖ أهـل الـخيـر والسبـاق صلاة تتضاعف وتدوم الى يوم التلاق كتبه العبده البرى من النفاق.

(ج:۷،ص۱۰۷)

’’یہ کتاب الطلاق کی شرح کا آخری حصہ ہے جس میں دقیق مضامین

میں سے قابل ترجیح مسائل درج کئے گئے ہیں۔ اسے ایک ایسے شخص نے لکھوایا ہے جو اس طرح قید ہے کہ چل پھر نہیں سکتا اور (عزیزوں دوستوں کی) جدائی کی وحشت میں مبتلا ہے۔ وہ صاحب براق ﷺ اور آپ کے آل واصحاب پر جو بھلائیوں میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھے، ایسا درود بھیجتا ہے جو قیامت کے دن تک دوگنا چوگنا ہوتا رہے۔ اسے ایک ایسے بندے نے لکھا ہے جو نفاق سے برأت کا اظہار کرتا ہے۔"

پھر آٹھویں جلد میں کتاب الولاء کے ختم پر فرماتے ہیں:

انتهى شرح كتاب الولاء بطريق الاملاء من الممتحن بأنواع البلاء يسأل من الله تعالىٰ تبديل البلاء والجلاء بالعز والعلاء فان ذلك عليه يسير وهو على مايشاء قدير صلى الله على سيّدنا محمد وعلى آلهٖ واصحابه الطاهرين.

(ج:۸۔ص۲۲۳)

"یہاں کتاب الولاء کی شرح اختتام کو پہنچی جو ایک ایسے شخص نے لکھوائی ہے جو کئی طرح کی آزمائشوں میں مبتلا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ اس آزمائش اور جلاوطنی کو عزت اور سربلندی سے تبدیل فرمادے۔ کیونکہ یہ اس کیلئے بہت آسان ہے اور وہ ہر اُس چیز پر قادر ہے جو اس کی مشیت کے مطابق ہو۔ وصلی اللہ علیٰ سیّدنا محمد و علیٰ آلہٖ واصحابہ الطاہرین۔"

اس کے بعد بارہویں جلد میں کتاب الجہاد والسیر کے خاتمے پر فرماتے ہیں:

انتھی شرح السیر الصغیر المشتمل علی معنی اثیر باملاء المتکلم بالحق المنیر المحصور لاجله شبه الاسیر المنتظر للفرج من العالم القدیر السمیع البصیر المصلی علی البشیر الشفیع لامته النذیر، وعلی کل صاحب له ووزیرٍ، واللّٰه هو اللطیف الخبیر. (ج:۱۲۔ص:۳۵۴)

”سیر کی شرح اختتام کو پہنچی جو منقول معانی پر مشتمل ہے، اور ایسے شخص نے املا کرائی ہے جس نے ایک واضح حق کا کلمہ کہا تھا جس کی وجہ سے اُسے قیدی کی طرح بند کردیا گیا اور وہ اللہ تعالیٰ سے جو ہر چیز جاننے والا، ہر بات سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے، رہائی کا منتظر ہے اور جنابِ نبی کریم ﷺ پر اور ان کے ہر صحابی اور مددگار پر درود بھیجتا ہے جو اپنی اُمت کو خوشخبری دینے والے، ان کی شفاعت کرنے والے اور خبردار کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ لطف فرمانے والے، ہر چیز سے باخبر ہیں۔

اسی طرح مبسوط کے کچھ نسخوں کی اٹھارہویں جلد میں کتاب الاقرار کے ختم پر یہ عبارت بھی موجود ہے:

”انتھی شرح کتاب الاقرار، المشتمل من المعانی ماھو سرّ الاسرار، املاہ المحبوس فی موضع الأشرار، مصلیا علی النبی المختار.

”کتاب الاقرار کی شرح پوری ہوئی، جو حقائق و اسرار کے مضامین پر مشتمل ہے، اُسے ایسے شخص نے نبی مختار صلی اللہ علیہ وسلم پر درود

بھیجتے ہوئے املا کرایا ہے جو بُرے لوگوں کے مقام پر قید ہے۔"

اکثر تذکرہ نگاروں کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پوری مبسوط قید ہی کی حالت میں لکھی ہے۔ البتہ چونکہ پرانے تذکرہ نگاروں نے پندرہ جلدوں کا ذکر کیا ہے اور موجودہ مطبوعہ نسخہ تیس جلدوں میں چھپا ہے، اس لئے بعض حضرات یہ سمجھے کہ انہوں نے آدھی کتاب قید میں اور باقی آدھی رہائی کے بعد لکھی ہے۔ لیکن تحقیق سے یہ معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم کہ کتاب کو تیس جلدوں میں تو بعد میں تقسیم کیا گیا، ابتداء میں جو مسودہ تیار ہوا تھا، وہ پندرہ جلدوں ہی میں کیا تھا اور پوری کتاب قید ہی میں لکھوائی گئی ہے، جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ تیسویں جلد میں کتاب الرضاع کے شروع میں یہ عبارت ہے۔

> **"قال الشيخ الامام الأجل الزاهد شمس الائمة فخر الاسلام ابوبكر محمد بن ابى سهل السرخسى املاء يوم الخميس الثانى عشر من جمادى الاخرة سنة سبع وسبعين وأربعمائة."**

(المبسوط۔ ج:۳۰۔ ص:۲۸۷)

جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کتاب الرضاع کا آغاز ۱۲ جمادی الآخرہ ۴۷۷ھ میں ہوا تھا۔ دوسری طرف ''اصول السرخسی'' کے مقدمے سے معلوم ہوتا ہے کہ امام سرخسی شوال ۴۷۹ھ تک قید میں تھے اور اسی وقت انہوں نے اصول السرخسی کی تالیف شروع فرمائی (عبارت آگے آرہی ہے) مبسوط کی کتاب الرضاع سے کتاب کے آخر تک کل سولہ صفحات ہیں، اور جمادی الآخرۃ ۴۷۷ھ سے شوال ۴۷۸ھ تک تقریباً سوا دو سال کا فاصلہ ہے اور ظاہر یہ ہے کہ یہ سولہ صفحات ۴۷۷ھ میں ہی مکمل ہوگئے ہوں گے اور اس طرح پوری کتاب جس کے کل مطبوعہ صفحات کی تعداد چھ ہزار تین سو تینتیس ہے، اسی قید کی حالت میں لکھوائی گئی ہے، جس میں دوسری کتابوں سے باقاعدہ مراجعت کا امکان نہیں تھا۔ (کہیں انتہائی ضرورت کے وقت جزوی طور پر کسی کتاب سے رجوع کیا گیا ہو تو بات اور

ہے) اور موضوع بھی کوئی عام واقعات کا سیدھا سادہ موضوع نہیں تھا جس میں غور و خوض اور کتابیں دیکھنے کی ضرورت نہ ہو، بلکہ یہ فقہ کے انتہائی دقیق اور مشکل مباحث پر مشتمل کتاب ہے اور اُس کے بعد سے علماء و فقہاء اس کتاب کو صدیوں پڑھتے رہے ہیں، لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ اس قید کی حالت میں حافظے کی بنیاد پر کتاب لکھوانے کی وجہ سے فلاں جگہ غلطی ہوگئی ہے۔ اس کے بجائے اس کتاب کو فقہ حنفی کے مستند مآخذ میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ ایسی بات ہے جس کی کوئی مثال کسی اور قانون کی کتاب یا مصنف کی زندگی میں نہیں ملتی۔

صرف یہی نہیں، امام سرخسی رحمتہ اللہ علیہ کی دوسری مشہور کتاب شرح السیر الکبیر ہے جو جنگ اور بین الاقوامی تعلقات کے اسلامی قوانین پر مستند ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، یہ پانچ جلدوں میں چھپی ہوئی موجود ہے، اور شاید اُس وقت اس موضوع پر اتنی مفصل کتاب کوئی اور نہیں تھی۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ یہ کتاب بھی انہوں نے قید ہی کی حالت میں لکھوائی ہے۔ کتاب کے موجودہ نسخوں میں اس کتاب کے اندر کوئی عبارت مجھے ایسی نہیں ملی جس سے معلوم ہوتا ہو کہ یہ کتاب بھی قید میں لکھی گئی ہے، لیکن حاجی خلیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے آخر میں امام سرخسی رحمتہ اللہ علیہ نے یہ جملہ لکھا ہے:

> **"انتهى املاء العبد الفقير المبتلى بالهجرة الحصير المحبوس من جهة السلطان الخطير باغراء كل زنديق حقير و كان الافتتاح، بأوزجند فى آخر ايام المحنة، والتمام عند ذهاب الظلام بمرغينان فى جمادى الأولى سنة، ثمانين وأربعمائة."**

(کشف الظنون۔۲:۱۰۱۳)

> ''اس کتاب کو لکھوانے کا سلسلہ اُس محتاج بندے کی طرف سے مکمل ہوا جو کسی ذلیل زندیق کے کہنے پر خطرناک بادشاہ کی طرف سے جلاوطنی اور قید میں مبتلا تھا اور اس (کتاب) کا آغاز اوزجند میں آزمائش کے آخری دنوں میں ہوا تھا، اور تکمیل جمادی الاولی ۴۸۰ھ میں مرغینان میں اُس وقت ہوئی جب اندھیرا چھٹ چکا تھا۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حاجی خلیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نسخے میں یہ جملہ موجود تھا جو بعد کے نسخوں میں حذف ہوگیا، لیکن اپنے اسلوب کے لحاظ سے یہ جملہ ان جملوں سے واضح مطابقت رکھتا ہے جو مبسوط کے کئی ابواب سے اوپر نقل کیے گئے ہیں۔

پھر امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک اور کتاب اُصولِ فقہ کے موضوع پر ہے جو ''المحرر فی اصول الفقہ'' یا ''اصول السرخسی'' کے نام سے مشہور ہے۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اس کتاب کی تالیف بھی اسی قید میں ہوئی ہے اور اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ کتاب کے شروع میں یہ عبارت آج بھی موجود ہے:

> ''قال الامام الاجل الزاهد شمس الائمة ابوبكر محمد بن ابی سهل السرخسی املاء فی يوم السبت سلخ شوال سنة تسع وسبعين وأربعمائة فی زاوية من حصار أوزجند.

(أصولِ السرخسی۔ طبع بیروت۔ ص۴)

اس عبارت سے واضح ہے کہ یہ کتاب بھی امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے اوزجند کے قید خانے میں شوال ۴۷۹ھ میں لکھوانی شروع کی تھی۔

ان تمام باتوں کو ملانے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مبسوط تو پوری کی پوری قید میں

لکھوائی گئی اور بظاہر اس کی تکمیل ۴۷۷ھ میں ہوگئی تھی۔ اس کے بعد بھی دو سال سے کچھ زیادہ مدت تک امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ قید میں رہے اور اسی حالت میں دو مزید کتابوں کی تالیف شروع فرمادی۔ ایک شرح السیر الکبیر اور دوسرے اُصول السرخسی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کی تالیف ساتھ ساتھ جاری تھی۔ پھر صاحبِ کشف الظنون نے لکھا ہے کہ جب اُصول السرخسی کے باب الشروط پر پہنچے تو قید سے رہائی ملی۔ (کشف الظنون۔ ج:۱، ص:۱۸) اس طرح ان دونوں کتابوں کا باقی حصہ مرغینان میں جاکر مکمل فرمایا۔ جیسا کہ شرح السیر الکبیر کے آخری جملے سے معلوم ہوتا ہے جو حاجی خلیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے پیچھے گذر چکا ہے۔ اصول السرخسی میں باب الشروط کے نام سے کوئی باب نہیں ہے، البتہ ایک فصل "فصل الشرط" کے نام سے موجود ہے۔ شاید حاجی خلیفہ کی مراد وہی ہو۔ لیکن بعض حضرات نے اس سے مبسوط کی کتاب الشروط سمجھ کر جو یہ کہا ہے کہ وہاں پہنچ کر انہیں آزادی مل گئی تھی، بظاہر وہ بات درست نہیں ہے اس لئے کہ کتاب الرضاع جس کے شروع کی عبارت اوپر نقل کی گئی ہے، وہ کتاب الشروط کے بہت بعد ہے اور کتاب الرضاع کا آغاز یقیناً قید میں ہوا تھا، جیسا کہ اوپر تحقیق کی گئی ہے۔ **واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔**

شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ عظمت تو اُس وقت سے دل میں تھی جب سے بچپن میں اپنے والد ماجد قدس سرہٗ سے مبسوط کی تالیف کا حال سنا تھا۔ لیکن آج میں ان کے اسی شہر میں کھڑا تھا جہاں انہوں نے یہ محیر العقول کارنامہ انجام دیا جسے حضورِ نبی کریم ﷺ کے دین کا معجزہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ آج نہ اُس گڑھے یا کنویں کا کوئی نام و نشان موجود ہے، جہاں انہوں نے سالہا سال انتہائی صبر آزما وقت گزارا، نہ اُس حاکم سے کوئی واقف ہے جس نے تکبر اور رعونت کے عالم میں ایسے مقدس شخص کو اتنی بربریت کے ساتھ قید کیا۔ لیکن سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کا نام زندہ و پائندہ ہے، اور انشاء اللہ قیامت تک اُسے خراجِ تحسین پیش کیا جاتا رہے گا اور لوگ ان کیلئے رحمت کی دعائیں کرتے رہیں گے۔ **رحمہ اللہ تعالیٰ و جزاہ عن الامۃ الاسلامیۃ احسن الجزاء۔**

اوزجند کے شہر میں مجھے صرف چند گھنٹے ملے، لیکن تصور کی نگاہیں یہاں علم و فضل اور عظمتِ کردار کے وہ پہاڑ دیکھتی رہی جن کی خدمات سے آج پوری علمی دنیا سیراب ہو رہی ہے۔

شمس الائمہ سرخسی رحمتہ اللہ علیہ کی قبر پر سلام عرض کرنے اور ایصالِ ثواب کے بعد مختار صاحب کے دوست ہمیں اپنے گھر لے گئے جہاں کچھ دیر سوال و جواب کی نشست رہی۔ پھر یہاں کی مرکزی جامع مسجد میں میرا مختصر خطاب بھی ہوا جہاں دیر سے لوگ منتظر بیٹھے تھے۔ تقریر کا ترجمہ مختار صاحب نے کرغیزی زبان میں کیا۔ ایک بج کر پچیس منٹ پر ہم مسجد سے نکلے۔ اوش سے ہمیں جس جہاز میں سوار ہونا تھا اس کی روانگی کا وقت دو بج کر دس منٹ تھا اور ہمیں یہاں سے پینتالیس کلومیٹر کا سفر کر کے اوش کے ہوائی اڈے پر پہنچنا تھا۔ لیکن جو صاحب گاڑی چلا رہے تھے انہوں نے انتہائی مہارت کے ساتھ گاڑی چلائی۔ اوش شہر میں چونکہ ٹریفک زیادہ ہونے کا امکان تھا، اس لئے ایک لمبا راستہ اختیار کیا جس سے پینتالیس کلومیٹر کی مسافت اور زیادہ بڑھ گئی لیکن جب ہم ہوائی اڈے پر داخل ہوئے تو دو بج رہے تھے اور وی آئی پی لاؤنج کا عملہ ہمارا بورڈنگ پاس لئے دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ ہمیں سیدھا جہاز پر لے گیا اور جب ہم تین بجے بشکیک کے ہوائی اڈے پر اُترے تو سات گھنٹے میں تقریباً تیرہ سو کلومیٹر کا یہ طوفانی سفر ایک خواب معلوم ہو رہا تھا۔

بشکیک میں ایک پاکستانی تاجر جناب صدیق صاحب کا ایک پاکستانی ریسٹورنٹ ہے۔ وہ ثمر صاحب کے مکان پر پاکستانی کھانا لیکر آ گئے تھے، جس سے ہم محظوظ ہوئے اور وہاں جمع ہو جانے والے دوسرے احباب سے بھی ملاقات رہی۔ سات بجے شام ہماری اسلام آباد کیلئے پرواز تھی۔ میرے رفیقِ سفر جاوید ہزاروی صاحب نے یہ کرم فرمایا کہ سامان وغیرہ لے کر پہلے چلے گئے اور ثمر صاحب کے مکان پر مجھے آرام کا موقع مل گیا اور جب مغرب کے وقت میں ہوائی اڈے پہنچا تو ایئرپورٹ کے سارے مراحل طے ہو چکے تھے۔ سات بجے ہم جہاز میں سوار ہو کر ڈھائی گھنٹے میں اسلام آباد پہنچے اور وہاں سے رات گیارہ بجے

روانہ ہو کر ایک بجے شب بفضلہٖ تعالیٰ بعافیت کراچی پہنچ گئے۔

اگرچہ بیماری کی وجہ سے کئی کام جو سوچے تھے وہ اس سفر میں نہ ہو سکے، لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ایک ہفتے کا یہ سفر بہت سی جہتوں سے میرے حق میں بہت مفید ثابت ہوا۔

ہندوستان کا تازہ سفر

رجب وشعبان ۱۴۳۱ھ

جولائی 2010ء

ہندوستان کا تازہ سفر

(رجب وشعبان ۱۴۳۱ھ / جولائی 2010ء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ رب العالمین، والصلوۃ والسلام علی رسولہ
الکریم، وعلی آلہ واصحابہ اجمعین. اما بعد

ہندوستان کی سرزمین سے میرے جذباتی تعلق کے بہت سے اسباب ہیں۔ اُسی کا ایک خطہ یعنی دیوبند میرا پیدائشی اور آبائی وطن بھی ہے اور علمی ہدایت کا مرکز بھی، اُسی کے ضلع مظفر نگر میں تھانہ بھون اور جلال آباد واقع ہیں جو میرے روحانی مشائخ کا مستقر رہے ہیں۔ اسی ہندوستان کے مختلف خطوں میں ہماری تاریخ کے وہ جگمگاتے ہوئے کردار پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے علم وفضل اور زہد وتقویٰ سے لیکر جہد وعمل اور جانبازی وسرفروشی تک ہر میدان میں اپنی انمٹ یادگاریں چھوڑی ہیں۔ پھر اسی خطے میں پندرہ کروڑ کے قریب مسلمان آباد ہیں جو اپنے دینی تشخص کو قائم رکھنے کے لیے قابل تعریف کوششیں کر رہے ہیں۔

پچھلے چند سالوں میں میری تقریباً تمام کتابیں ہندوستان میں شائع ہو کر ملک بھر میں پھیلی ہیں، اور ان کے حوالے سے انہی مسلمانوں کی طرف سے مجھے بے شمار محبت بھرے خطوط ملتے رہے ہیں، ان میں جس والہانہ محبت کا اظہار ہوتا تھا، اگرچہ میں اُس کا مستحق نہیں تھا، لیکن اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا تھا کہ ان کی طرف سے اس محبت میں کسی لگاوٹ کا شائبہ نہیں ہے۔ اس دوران نہ جانے کتنی مختلف جہتوں سے مجھے ہندوستان آنے کی دعوت ملی اور میں چاہنے کے باوجود وہاں نہ جاسکا۔ ایک دو مرتبہ تاریخیں بھی متعین ہوگئیں، لیکن کچھ غیر اختیاری اسباب ایسے پیش آئے کہ ہر مرتبہ سفر کو ملتوی کرنا پڑا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی

مشیت میں ہر کام کا ایک وقت مقدر ہے۔ مدراس کے ایک بڑے تاجر جناب این فاروق احمد صاحب جو ماشاء اللہ علماء سے گہری وابستگی رکھتے ہیں، چند سال سے میرے مدراس آنے کے لیے مسلسل رابطہ کر رہے تھے۔ اس سال رمضان المبارک میں وہ مکہ مکرمہ آئے تو اپنے رفقاء کی ایک جماعت کے ساتھ مجھ سے ملے، اور کچھ اس والہیت کے ساتھ اپنی دعوت کو دہرایا اور ساتھ ہی ویزا وغیرہ کے مراحل طے کرنے کا یقین بھی دلایا کہ میں نے ان سے اللہ تعالیٰ کے نام پر وعدہ کر لیا کہ ان شاء اللہ اس سال کسی وقت ہندوستان کا پروگرام بناؤں گا۔ جناب این فاروق صاحب ویزا کی کوشش میں لگے رہے، یہاں تک کہ ویزا مل گیا، اور مختلف رکاوٹوں سے گذرنے کے بعد اس مرتبہ رجب کے مہینے میں یہ یادگار سفر طے پا ہی گیا۔

صحیح بخاری کا آخری درس ۴ جولائی (۲۲ رجب ۱۴۳۱ھ) کو ہوا، اور میں نے اگلے ہی دن پی آئی اے سے بمبئی کے لیے روانگی طے کر رکھی تھی، میرے ساتھ میری اہلیہ اور میرے چھوٹے بیٹے مولوی حسان اشرف سلمہ بھی ساتھ جا رہے تھے، جس کی اطلاع اپنے میزبانوں کو بھی دی ہوئی تھی، اور وہ استقبال کے لیے بمبئی آ چکے تھے۔ مقررہ وقت پر ہم ہوائی اڈے پر پہنچے تو ویزا کے سلسلے میں ایک ایسی قانونی رکاوٹ پیش آ گئی کہ اُس روز ہمیں ہوائی اڈے سے واپس آنا پڑا۔ ہمارے میزبان جو مدراس سے بمبئی آئے ہوئے تھے، انہیں سخت دھچکا لگا۔ اگلے دو دن تک بمبئی کے لئے کراچی سے کوئی پرواز نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے فون پر کہا کہ ہم اگلے روز کاغذات کی تکمیل کے بعد امارات ائیر لائنز سے دبئی کے راستے بمبئی کی بکنگ کرا لیں۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا۔ تھوڑی دیر میں ڈابھیل کے صدر مفتی حضرت مولانا احمد خان پوری صاحب مدظلہم العالی کا فون آیا، اور انہوں نے بتایا کہ وہ ہماری آمد کی اطلاع سن کر ڈابھیل سے بمبئی پہنچے ہوئے تھے۔ اسی طرح حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے اور ماہنامہ الفرقان کے ایڈیٹر جناب مولانا خلیل الرحمٰن سجاد حفظہ اللہ تعالیٰ کا فون آیا کہ وہ ہماری آمد کی خبر پر لکھنؤ سے بمبئی تشریف لے آئے تھے۔ سخت صدمہ ہوا کہ میں ان حضرات کی تکلیف کا باعث بنا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ

یا تو سفارت خانے سے یہ چوک ہوئی یا ہمارے ٹریول ایجنٹ سے کہ یہ ضروری کاغذات ویزا کے ساتھ ہم تک نہ پہنچ سکے۔ یقیناً اسی میں کوئی مصلحت تھی کہ ہمارا سفر اُس دن نہ ہو سکا۔

بمبئی میں

اگلے دن بفضلہٖ تعالیٰ کاغذات مکمل ہو گئے، اور ہم نے امارات ائیر لائنز سے براستہ دبئی سفر کیا، اور اس طرح جو سفر مشکل سے پونے دو گھنٹے کا تھا، اُس میں تقریباً دس گھنٹے لگ گئے، اور ہم ٦ جولائی کو رات ساڑھے آٹھ بجے بمبئی کے ہوائی اڈے پر اترے۔ پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کی جو نوعیت ہے، اُس کی وجہ سے امیگریشن وغیرہ کے مراحل عام ملکوں سے زیادہ سخت اور دیر طلب ہوتے ہیں، لیکن جہاز سے نکلتے ہی خود ائیر پورٹ کے بعض افسران نے استقبال کیا، جناب مولانا سجاد صاحب اور جناب این فاروق صاحب اور ان کے کچھ رفقاء بھی اندر آ چکے تھے۔ ایک نوجوان غلام رسول صاحب نے ان تمام مراحل کو مستعدی سے طے کرانے اور ائیر پورٹ کے اندر استقبال کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ صاحب صرف میرے لئے ہی نہیں، فاروق صاحب کے لیے بھی نئے تھے، اور محض اتفاق سے ان سے تعارف ہو گیا تھا۔ غرض اس طرح ائیر پورٹ کے تمام پیچیدہ مراحل بیٹھے بیٹھے طے ہو گئے، لیکن نکلتے نکلتے گیارہ بج چکے تھے۔ میرے میزبانوں نے بتایا تھا کہ مولانا بدرالدین اجمل صاحب جو پارلیمنٹ کے رکن بھی ہیں، اور مکہ مکرمہ میں مجھے دعوت دینے والوں میں وہ بھی شامل تھے، بمبئی میں ایک روزہ قیام اُن کے یہاں ہوگا، چنانچہ شروع میں ارادہ یہی تھا، لیکن اچانک ان کی طبیعت ناساز ہونے کے باعث انہیں ہسپتال میں داخل ہونا پڑا، اس لیے مولانا سجاد صاحب نے بمبئی کے ایک بڑے مخلص اور صالح تاجر جناب آصف صاحب کے گھر میں قیام کا انتظام کیا ہوا تھا، چنانچہ رات ہم انہی کے گھر میں رہے، اور وہاں بہت سے احباب سے ملاقات بھی ہوئی، اور پھر آصف صاحب اس سفر کے بیشتر حصے میں ہمارے ساتھ رہے، اور رفاقت کا حق ادا کر دیا۔

بمبئی میں کوئی تقریر وغیرہ کا پروگرام نہیں تھا، اور اگلے دن شام سات بجے ہمیں مدراس

روانہ ہونا تھا، اس لیے میزبانوں نے بہت کم لوگوں کو ہماری آمد کی اطلاع کی ہوئی تھی، لیکن صبح سے ملنے والوں کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر آصف صاحب ہمیں گاڑی میں بمبئی شہر کے بعض قابل دید مقامات پر لے گئے، اور گاڑی میں بیٹھے ہی بیٹھے بمبئی کے نئے علاقوں کی سیر کرادی جن میں سب سے زیادہ قابل ذکر وہ طویل وعریض پل ہے جو بمبئی کے دو حصوں کو ملانے کے لیے سمندر پر بنایا گیا ہے، اور ”سی لنک“ (Sea Link) کہلاتا ہے۔ بمبئی میں ایک مشہور مسلمان تاجر جناب شہاب الدین صاحب مرحوم نے شالیمار ہوٹل کے نام سے ایک ریسٹورنٹ بنایا ہوا ہے، ان کے ایک حادثے میں شہید ہونے کے بعد اب اُسے ان کی اہلیہ اور صاحبزادے عمیر صاحب چلا رہے ہیں۔ وہاں انہوں نے ہمارے دوپہر کے کھانے اور آرام کا انتظام کیا ہوا تھا، چنانچہ ہم دوپہر کو وہاں پہنچے، اور انہوں نے بڑی محبت سے نہایت لذیذ کھانا کھلایا، لیکن اُس وقت تک نہ جانے کس طرح ہمارے اس ہوٹل میں موجود ہونے کی خبر پھیل چکی تھی۔ چنانچہ ہوٹل پر بہت ہجوم ہوگیا، بمبئی کے مسلمانوں کے علاوہ بیشتر حضرات گجرات کے مختلف علاقوں سے سفر کرکے آئے ہوئے تھے۔ ان حضرات سے ملاقات کے بعد کچھ دیر آرام کیا۔

بمبئی کی سب سے بڑی جامع مسجد کے امام وخطیب حضرت مولانا شوکت صاحب مدظلہم اس وقت بمبئی میں سب سے زیادہ معمر بزرگ ہیں جن پر علاقے کے تمام مسلمان اعتماد کرتے ہیں۔ آج کل وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو چکے ہیں۔ ہمارا خیال یہ تھا کہ عصر کی نماز اُن کی مسجد میں پڑھ کر اُن کی زیارت اور عیادت کی سعادت حاصل کریں گے، لیکن ہجوم کی وجہ سے ہمیں نکلنے میں دیر ہوئی، اور جماعت ہوٹل ہی میں کرنی پڑی۔ نماز کے فوراً بعد معلوم ہوا کہ حضرت مولانا ہمارے آنے کی خبر سنکر بذات خود ہوٹل کی نچلی منزل میں تشریف لا چکے ہیں۔ میں نیچے اُترا تو حضرت مولانا ایک کرسی پر تشریف فرما تھے، بڑی شرمندگی معلوم ہوئی کہ ہماری وجہ سے انہوں نے اتنی تکلیف اُٹھائی کہ چلنے پھرنے سے معذور ہونے کے باوجود تشریف لائے۔ میری درخواست پر انہوں نے بہت دعائیں دیں، اور ہمت افزائی

کے کلمات ارشاد فرمائے۔ جب انہیں واپس گاڑی تک پہنچانے کے لیے میں نے انہیں سہارا دینے کی کوشش کی تو اندازہ ہوا کہ دو طرفہ سہارے کے باوجود وہ تین چار قدم چلنے کے بعد گرنے لگتے ہیں۔ اوپر سے دشواری یہ تھی کہ ہم سے ملنے کے لیے آنے والوں کا ہجوم لمحہ لمحہ بڑھ کر اتنا زیادہ ہوگیا تھا کہ چلنے یا حضرت مولانا کو کرسی پر بٹھا کر لے جانے کی جگہ نہیں تھی۔ اس طرح دس بارہ گز کا فاصلہ انہوں نے کئی قسطوں میں طے فرمایا۔ اور جب میں نے انہیں گاڑی میں بٹھانے کے بعد واپس آنے کا ارادہ کیا تو واپس جانے کا راستہ ہجوم کی شدت کی وجہ سے مسدود ہو چکا تھا، اس لیے آصف صاحب نے مجھے واپس لانے کے بجائے حضرت ہی کی گاڑی میں بٹھا دیا، اور ایک لمبا چکر کاٹ کر دوسری طرف سے ہوٹل میں داخل کیا۔ ادھر اب ہمارے ہوائی اڈے جانے کا وقت آ چکا تھا، اس لیے اس ہجوم سے فرداً فرداً صرف مصافحہ بھی ممکن نہیں تھا، چنانچہ اجتماعی دعا کر کے ہم ہوائی اڈے کے لیے روانہ ہوگئے۔

جہاز لیٹ تھا، اس لئے ہوائی اڈے پر کافی انتظار کرنا پڑا، اور پھر تقریباً ڈھائی گھنٹے کی پرواز کے بعد ہم مدراس کے ہوائی اڈے پر اترے۔ رات آدھی ہو رہی تھی، مگر یہاں بھی اچھی خاصی تعداد میں لوگ استقبال کے لیے موجود تھے۔ جناب این فاروق صاحب کے مکان میں قیام ہوا، اور اس کے بعد مسلسل مصروفیات کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔

مدراس میں

مدراس صوبہ تامل ناڈو کا مرکزی شہر ہے، اور اب اُس کا نیا نام چینائی رکھ دیا گیا ہے۔ یہاں مسلمانوں کی بھی بڑی تعداد آباد ہے، جنوبی ہند کی اہم بندرگاہ ہونے کی وجہ سے یہ شہر تجارت کا مرکز ہے، اور یہاں کی تجارت میں مسلمانوں کا بھی بڑا حصہ ہے۔ خاص طور پر چمڑے اور اس کی مصنوعات کی تجارت زیادہ تر مسلمانوں ہی کے پاس ہے۔ اور الحمد للہ یہ حضرات تجارت کے ساتھ مسلمانوں کے اجتماعی کاموں میں دل کھول کر حصہ لیتے ہیں۔ انہی کی کوششوں سے ایک وسیع و عریض عمارت حج ہاؤس کے نام سے تعمیر کی گئی ہے۔ یہاں

صوبے بھر کے حجاج حج کو جانے کے لئے جمع ہوتے ہیں، ان کی رہائش کا بھی انتظام ہے، اور ان کے سفر کی تمام کارروائیاں ایک ہی جگہ مکمل ہو جاتی ہیں، اور جہاز کے بورڈنگ کارڈ سمیت انہیں تمام کاغذات یہیں سے مل جاتے ہیں، اور وہ سیدھے ہوائی جہاز تک پہنچ جاتے ہیں۔

جمعرات ۸؍جولائی کو اسی حج ہاؤس میں علاقے کے علماء کرام کا ایک اجتماع رکھا گیا تھا۔ اس میں نہ صرف مدراس، بلکہ پورے صوبے سے، بلکہ صوبے سے باہر کے بھی علماء کرام اور اصحابِ مدارس اور اہلِ افتاء کی ایک بڑی جماعت شریک ہوئی اور ان کی فرمائش پر ان کی خدمت میں کچھ گذارشات پیش کرنے کا موقع ملا جو زیادہ تر اپنے بزرگوں سے سنی ہوئی باتوں کا تکرار تھا۔

دنیا کے دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی تاجر حضرات کو بینکوں سے معاملات پیش آتے ہیں، اور دوسری جگہوں کی طرح یہاں بھی علماء کرام اور تاجر حضرات اس کوشش میں ہیں کہ کوئی ایسا ادارہ قائم ہو جس کے ذریعے وہ یہ معاملات سود کی آمیزش کے بغیر انجام دے سکیں۔ اس جدوجہد کے لیے یہاں بعض حضرات نے مستقل جماعت بھی بنائی ہوئی ہے۔ صوبہ کیرالہ میں اس کا عملی آغاز بھی کیا گیا، لیکن حکومتی حلقوں کے ذہن میں یہ اشکال ہے کہ مذہب کی بنیاد پر کسی اسلامی مالیاتی ادارے کا قیام اُس کی سیکولر پالیسی کے خلاف نہ ہو، اور عدالت کے ایک فیصلے کی وجہ سے اس اشکال کو مزید تقویت بھی ملی ہے۔ اس سلسلے میں ایک عمومی شعور پیدا کرنے کے لیے علماء کرام اور تاجروں نے جمعرات کی شام ایک خصوصی اجتماع رکھا تھا، اور اُس میں تجارت کے بااثر حضرات کو مدعو کیا گیا تھا۔ میرے میزبان جناب این فاروق صاحب کے علاوہ مفتی شکیل صاحب، مفتی خلیل الرحمٰن صاحب، مفتی ظفر احمد صاحب، مولانا اقبال قاسمی صاحب اور جناب حاجی محمد ہاشم صاحب جو تامل ناڈو کی ایک بزرگ شخصیت ہیں، اور نہ صرف صوبے، بلکہ پورے ملک میں اُنہوں نے بہت سے فلاحی ادارے

قائم کیے ہوئے ہیں، اس اجتماع کے انعقاد میں پیش پیش تھے۔

مدراس میں پانچ ستاروں والے ہوٹل بڑی تعداد میں ہیں، اور یہ اجتماع ایک ایسے ہی ریزیڈنسی ہوٹل کے ہال میں رکھا گیا تھا۔ اجلاس کے شروع میں مجھ سے فرمائش کی گئی کہ اسلام کے مالیاتی اصولوں کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بتاؤں کہ یہ اصول صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں، بلکہ پوری انسانیت کے لیے معاشی صلاح وفلاح کے ضامن ہیں، اور ایک غیر مسلم یا سیکولر ملک اپنے اوپر مذہبی چھاپ لگائے بغیر بھی خالص معاشی فوائد کے تحت ان کو اختیار کرسکتا ہے۔ اس ضمن میں اسٹیج کی طرف سے مجھ سے یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ اس سال کے آغاز میں "ورلڈ اکنامک فورم" نے اپنے سالانہ اجلاس میں موجودہ مالیاتی بحران کے حل کے لیے اسلامی اقدار کے حوالے سے جو تجاویز مانگی تھیں، اور اُس کے جواب میں میں نے جو مقالہ پیش کیا تھا، اُس کا خلاصہ بھی بیان کروں۔ چونکہ حاضرین میں غیر مسلم بھی تھے، اور مسلمانوں میں بھی ایسے حضرات کی بڑی تعداد موجود تھی جو اردو نہیں سمجھتے تھے، اس لئے یہ فرمائش کی گئی تھی کہ یہ خطاب انگریزی میں ہو۔

ان تمام فرمائشوں کی تعمیل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے خطاب کیا، اور اس خطاب میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہی ایک نئے اسلوب سے اسلامی تجارت کے اخلاقی اور قانونی پہلوؤں کی وضاحت دل میں ڈالی، اور بفضلہٖ تعالیٰ حاضرین پر اُس کے مثبت اثرات نظر آئے۔ یہ پوری تقریر ریکارڈ کی گئی، اور سی ڈی کی شکل میں وسیع پیمانے پر پھیلائی گئی۔

اگلا دن جمعہ تھا، اور مدراس کی مرکزی جامع مسجد میں جسے بڑی میٹ مسجد کہا جاتا ہے، جمعہ کا خطاب بھی ہوا، اور نماز پڑھانے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔

دیوبند کا یادگار سفر

ہندوستان کے اس سفر میں میرے لئے سب سے زیادہ کشش دیوبند کی حاضری میں تھی، لیکن شروع میں جن تین مقامات کا ویزا ملا تھا، اُن میں دیوبند شامل نہ تھا۔ اس لئے

میرے میزبانوں نے دیوبند کے بغیر پروگرام ترتیب دے رکھے تھے۔ بعد میں میرے اصرار پر دیوبند کے ویزے کے لیے کوشش کی گئی، اور آخرکار وہ مل گیا، لیکن اب طے شدہ پروگراموں میں ردوبدل کر کے بیچ میں دیوبند کی گنجائش نکالنے کے لیے بہ مشکل جمعہ سے لیکر پیر تک کے تین دن ملے، اور اُس میں بھی ڈیڑھ دن مدراس سے دیوبند کے طویل فاصلے کی وجہ سے سفر ہی کی نذر ہو جانے تھے۔ تاہم نہ ہونے کے مقابلے میں اسی کو غنیمت سمجھے بغیر چارہ نہیں تھا۔ اگرچہ وقت مختصر تھا، لیکن عزیزوں سے ملاقات کے علاوہ بدیہی طور پر دارالعلوم دیوبند کے دونوں اداروں میں حاضری کی نیت تھی۔ میرا مقصد ان علمی اور روحانی مراکز کی برکت حاصل کرنے اور وہاں کے اکابر کی زیارت کی حد تک محدود تھا۔ لیکن مدراس میں قیام کے دوران حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب مدظلہم کا پیغام ملا جو اس وقت بیرون ملک دورے پر تھے کہ میں دارالعلوم (وقف) میں طلبہ سے خطاب کروں، اور میرے برادر عم زاد حضرت مولانا خورشید عالم صاحب مدظلہم اسی دارالعلوم کے قابل ومقبول اساتذہ میں سے ہیں، اور صحیح بخاری کے بڑے حصے کا درس اُن کے سپرد ہے، انہوں نے فون پر ارشاد فرمایا کہ یہاں کے طلبہ حدیث کی اجازت لینا چاہتے ہیں۔ پھر دارالعلوم دیوبند قدیم کے مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہم العالی کا یہ گرامی نامہ مجھے مدراس میں ملا:

> باسمہٖ تعالیٰ
>
> مکرمی ومحترمی حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدکم۔ کراچی (پاکستان)
>
> السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
>
> امید کہ مزاجِ گرامی بخیر وعافیت ہوں گے۔
>
> دار العلوم دیوبند کے رکنِ شوریٰ، جناب ملک محمد ابراہیم صاحب مدراس کے ذریعہ معلوم ہوکر بڑی مسرت ہوئی کہ آپ مستقبلِ قریب میں ہندوستان تشریف لا رہے ہیں۔ خدا کرے یہ سفر بخیر وعافیت اپنے انجام کو پہنچے، آمین۔

اس موقعہ پر ہم خدامِ دار العلوم کی خواہش ہوگی کہ آنجناب دار العلوم دیوبند کو بھی پروگرام میں شامل فرمالیں۔ دیوبند سے جہاں آپ کا خاندانی رشتہ ہے، وہیں دار العلوم دیوبند سے بھی عظیم تعلق اور نسبت ہے۔ یقیناً آپ کی تشریف آوری سے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کی یاد تازہ ہوجائے گی۔ خدام دار العلوم اور دار العلوم کے حضرات اساتذہ کرام بھی زیارت و ملاقات کی مسرت حاصل کرسکیں گے، نیز اس موقع پر طلباء دار العلوم بھی آپ کی زیارت و نصیحت سننے کے مشتاق ہوں گے، وہ تشنگی بھی دور ہوجائے گی۔

ہمیں امید ہی نہیں بلکہ پورا یقین ہے کہ آنجناب خدام دار العلوم کی اس دعوت کو شرفِ قبولیت عطا فرماتے ہوئے دیوبند کے پروگرام کی اس طرح تشکیل فرمائیں گے کہ ایک وقت ماحضر ہمارے ساتھ تناول فرمائیں اور طلباء عزیز کو بھی خطاب فرمانے کا موقعہ عنایت فرمائیں۔ امید ہے کہ شاکر و ممنون فرمائیں گے۔

والسلام

(مولانا) مرغوب الرحمٰن (مہتمم دار العلوم دیوبند)

۲۳/۷/ ۱۴۳۱ھ ۶/۷/ ۲۰۱۰ء

دیوبند کے سفر سے اہم ترین مقصد تو اعزہ سے ملاقات کے علاوہ دار العلوم ہی کی زیارت تھی۔ ان حضرات کے پیغامات سے مزید ہمت افزائی ہوئی۔ اور جمعہ کی شام کو سات بجے کی پرواز سے دہلی جانے کا نظم طے پاگیا، لیکن کچھ قانونی ضروریات پوری کرنے میں دیر لگی، اور وہ پرواز نکل گئی، پھر ساڑھے آٹھ بجے کی پرواز سے بکنگ کرائی گئی۔

مدراس میں ہمارے عزیز دوست جناب حاجی حسن صاحب اس پورے سفر میں ساتھ رہے، اور انہوں نے راحت رسانی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ جزاہم اللہ تعالیٰ خیراً۔

جناب حاجی محمد ہاشم صاحب جن کا ذکر اوپر آیا ہے، اُن کے صاحب زادے مولانا ابراہیم صاحب دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن ہیں، وہ ہم سے پہلے دن ہی میں دہلی جا چکے تھے، تاکہ وہاں کے انتظامات میں آسانی ہو، انہی کے ذریعے میں نے حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہم کو یہ پیغام بھجوادیا تھا کہ دارالعلوم میں حاضری تو میرے سفر کا اہم مقصد ہے، اور میں ان شاء اللہ یہ سعادت ضرور حاصل کروں گا۔ البتہ کھانے کے بارے میں یہ عرض ہے کہ میرے پاس اپنے اعزہ سے ملنے کا وقت بہت کم ہوگا، اور یہ ان کا حق معلوم ہوتا ہے کہ کھانا اُن میں سے کسی کے یہاں ہو، تاکہ کم از کم کھانے پر ان سے ملاقات ہوجائے۔ الحمدللہ حضرت مدظلہم نے اس بات کو پذیرائی بخشی تھی اور اس سفر میں ہمارے ساتھ مدارس کے صالح تاجر حسن بھائی جو جناب این فاروق صاحب کے قریبی دوست ہیں ہمراہ تھے۔

مولانا ابراہیم صاحب کے والد جناب ہاشم صاحب کا دہلی میں ایک مکان ہے جہاں انہوں نے ہمارے رات کے قیام کا انتظام کر رکھا تھا۔ لیکن دہلی میں میرے ماموں زاد بھائی اشرف کریم صاحب بھی مقیم ہیں، اور ان کا اصرار تھا کہ قیام اُن کے یہاں ہو۔ ان کا حق بھی مقدم تھا اور میری خواہش بھی کہ کچھ وقت اُن کے ساتھ گذر جائے، اس لئے ہم ہوائی اڈے سے اُنہی کے گھر چلے گئے، اور مدراس سے ہمارے ساتھ آنے والے رفقاء ابراہیم صاحب کے یہاں ٹھہرے۔ اشرف کریم صاحب کے یہاں پہنچتے پہنچتے رات کے بارہ بج چکے تھے، اور لیٹتے لیٹتے دو بج گئے، جبکہ صبح کو پانچ بجے دیوبند جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن روانہ ہونا تھا۔ دوسری طرف بعض حضرات یہ اندیشہ ظاہر کر رہے تھے کہ ریلیں عموماً لیٹ ہوجاتی ہیں، اور اگر ایسا ہوا تو دیوبند میں جو تھوڑا بہت وقت ملنا ہے، اُس میں اور کمی ہوجائے گی، اس لئے کار سے سفر کرنا چاہیے۔

ابراہیم صاحب نے بیک وقت دونوں انتظامات کر رکھے تھے کہ اگر ٹرین لیٹ ہو تو کاریں تیار رہیں، اور ہم کار سے روانہ ہوجائیں۔ لیکن الحمدللہ احمد آباد ایکسپریس وقت پر آ گئی، اور وہ چھ بجے روانہ بھی ہوگئی۔ ریل کی کھڑکی سے لال قلعے کی دیواریں نظر آ رہی تھیں،

اور وہ منظر میری نگاہوں میں پھر گیا جب یکم مئی ۱۹۴۸ء کو میں پانچ سال کی عمر میں اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ دہلی اسٹیشن سے کراچی روانہ ہو رہا تھا۔ اُس وقت بھی لال قلعے کی دیواریں اسی طرح ریل سے نظر آ رہی تھیں، اور وہ منظر مجھے اسی طرح یاد ہے جیسے آج دیکھ رہا ہوں۔ اور آج یہی منظر میں اپنے بیٹے کو دکھا رہا تھا۔

کئی راتوں سے نیند بہت کم ہو رہی تھی فاروق صاحب نے ایئر کنڈیشنڈ سلیپر میں بکنگ اسی لئے کرائی تھی کہ کچھ سونے کا وقت مل جائے۔ دریائے جمنا پار کرنے کے بعد جب ریل نے رفتار پکڑی تو میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔ باسٹھ سال کے نشیب و فراز ذہن پر اُبھر آئے، اور تصورات کی دنیا نے کہیں سے کہیں پہنچا دیا، یہاں تک کہ نیند آ گئی، اور تقریباً ایک گھنٹہ نیند لینے کے بعد میری آنکھ کسی قدر شور سے کھلی۔ وجہ معلوم کی تو پتہ چلا کہ بہت سے حضرات نے میرے ساتھ دیوبند جانے کے لیے اسی گاڑی میں بکنگ کرائی تھی، اور وہ مختلف اسٹیشنوں پر ہمارے ڈبے میں آ کر ملاقات کی کوشش کر رہے تھے۔ ان سے فرداً فرداً ملاقات ہوئی، پھر کچھ دیر بعد دوسرے لوگوں کی قطار لگ گئی، شروع میں ٹی ٹی انہیں منع کرتا رہا، مگر پھر اُس نے مجھ سے آ کر کہا کہ یہ لوگ آپ سے محبت کرتے ہیں، اس لئے اب میں کسی کو منع نہیں کروں گا، اور آپ میرے سر پر بھی ہاتھ رکھ دیں۔ چنانچہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے یہ سلسلہ جاری رہا۔ ریل چلتی رہی، اور کاروانِ شوق اُس سے بھی زیادہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتا رہا، یہاں تک کہ صبح دس بجے سے کچھ پہلے گاڑی دیوبند کے اسٹیشن میں داخل ہو گئی۔

دیوبند میں

دیوبند کے پلیٹ فارم پر ایک جم غفیر نظر آیا، اور جب میں پلیٹ فارم پر اترا تو اسٹیشن نعرۂ تکبیر کی صداؤں سے گونج اٹھا۔ لوگوں کو نعرے لگانے سے روکنے کی کوشش کی گئی، لیکن ان کے جوش و خروش کے سامنے کسی کی پیش نہ گئی۔ میرے ساتھیوں نے اطمینان دلا دیا تھا کہ آپ سامان اور رفقاء کی طرف سے بے فکر رہیں۔ چنانچہ پلیٹ فارم پر اترنے کے بعد مجھے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ میں کس طرح آگے بڑھ رہا ہوں۔ میرے بہت سے رشتہ دار استقبال

کے لیے آئے ہوئے تھے، لیکن اُس وقت ہجوم کی شدت کی وجہ سے دو تین کے سوا کسی سے ملاقات نہ ہوسکی، میرے رشتہ داروں میں سے انس خواجہ صاحب جن کے گھر پر مجھے ٹھہرنا تھا، مولانا خورشید عالم صاحب کے صاحبزادے مولوی عارف صاحب، میرے ماموں زاد بھائی اشرف کریم صاحب اور قاری عاصم صاحب کسی نہ کسی طرح میرے گرد موجود تھے، وہی بمشکل مجھے پلیٹ فارم سے باہر لاکر گاڑی میں بٹھانے میں کامیاب ہوگئے۔ لیکن طلبہ نے گاڑی کو چاروں طرف سے اپنے حصار میں لے لیا، اور گاڑی کا معمول کی رفتار سے چلنا ممکن نہ رہا۔ اُن کی مرضی یہ تھی کہ وہ اُسے جلوس کی شکل میں لیکر جائیں، اور گاڑی رینگ رینگ کر چلے۔ مجھے اس طرح کے جلوسوں سے بالکل طبعی مناسبت نہیں ہے، اور وقت کی قلت کے پیش نظر بھی اس کا کوئی موقع نہیں تھا، اس لئے کچھ دیر بعد میں نے گاڑی سے اتر کر اُن سے درخواست کی کہ میں ان کی محبت کا تہ دل سے ممنون ہوں، لیکن اس وقت گاڑی کو جانے دیں، اور ان شاء اللہ شام کو مغرب کے بعد اور اگلے دن دار العلوم کے اجتماعات میں سب سے اجتماعی ملاقات ہوگی۔ اس پر طلبہ نے دورویہ قطاریں بنا کر گاڑی کو راستہ دیا۔

دل تو یہی چاہتا تھا کہ اُنہی جانے پہچانے راستوں اور گلیوں سے گذر کر جائیں جن سے نہ جانے کتنی یادیں وابستہ تھیں، لیکن ہجوم کی بنا پر بازار سے گذرتا ہوا سیدھا راستہ اختیار کرنا ممکن نہیں تھا۔ یوں بھی یہاں موٹر کار کے چلنے کا کوئی تصور نہیں تھا، شروع میں آمد و رفت پیدل یا تانگوں سے ہوا کرتی تھی، اور اب سائیکل رکشوں نے ان کی جگہ لے لی تھی، اور یہ پہلا موقع تھا کہ ہم کار میں سوار ہوکر اپنے محلے کی طرف جارہے تھے۔ ہمارے میزبان انس خواجہ صاحب نے گاڑی شہر سے باہر باہر جی ٹی روڈ کی طرف موڑ لی، اور ہم اسی روڈ کی طرف سے شہر میں داخل ہوئے۔ دیوبند کی گلیوں میں سے بیشتر نے اب پکی سڑکوں کی شکل اختیار کرلی ہے، اور مکانات اور دوکانوں نے بھی اب جدید تمدن کی ادائیں سیکھ لی ہیں۔ جن پُر پیچ گلیوں میں کبھی کار کے چلنے کا کوئی تصور نہیں تھا، اُن سے گذرتے ہوئے آخر کار گاڑی انس صاحب کے مکان پر جاکر رُک گئی، جہاں رشتہ داروں کا پُرمسرت

جمگھٹ منتظر تھا۔ انس صاحب نے یہ مکان ہماری آبائی آدینی مسجد کی جنوبی گلی میں نیا بنوایا ہے جو ماشاء اللہ بہت کشادہ اور جدید ترین سہولیات سے آراستہ ہے۔ اس لئے میرے اعزہ نے قیام کے لیے اسی کو منتخب کیا تھا، تاکہ آنے جانے والوں کو بھی سہولت رہے، اور میں فی الجملہ اپنے آبائی محلے کے قریب بھی رہوں۔

گھر میں داخل ہوئے تو سالوں سے بچھڑے ہوئے عزیزوں سے ملاقات کا منظر بڑا پُر کیف تھا۔ میں بائیس سال بعد دیوبند آیا تھا۔ اس دوران بچے جوان ہوکر صاحب اولاد ہوگئے تھے، جن کے بال سیاہ دیکھے تھے، وہ ادھیڑ یا بوڑھے نظر آرہے تھے، اور بہت سے نوجوان وہ تھے جنہیں پیدائش کے بعد پہلے پہل دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ اس طرح تعارف ہی تعارف میں بڑا وقت گذر گیا۔ وہیں حضرت مولانا اسلم قاسمی صاحب بھی تشریف لے آئے، اور بڑی محبت سے دار العلوم (وقف) میں حاضری کی دعوت دی۔

اس کے علاوہ جناب حسیب احمد صدیقی صاحب دیوبند کی مشہور شخصیت ہیں۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس سرہ کے منظورِ نظر رہے ہیں اور متعدد سماجی خدمات کی وجہ سے معروف ہیں۔ ہماری اُن سے رشتہ داری بھی ہے اور خاص طور پر میرے بڑے بھائیوں حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی اور جناب مولانا محمد ولی رازی صاحب مدظلہما کے بچپن کے دوست بھی ہیں، اور آج کل دیوبند کے ساتھ ضلع سہارنپور کے میونسپل بورڈ کے چیئرمین ہیں جس کی حیثیت شہر کے میئر کی ہے۔ وہ بھی تشریف لائے، اور بتایا کہ انہوں نے دار العلوم دیوبند کے ساتھ محمود ہال میں ایک استقبالیہ جلسے کا اہتمام کیا ہے جہاں مجھے مغرب کے بعد حاضر ہونا ہے۔

آدینی مسجد میں

ظہر کی نماز اپنی آبائی مسجد میں ادا کی جو آدینی مسجد کہلاتی ہے، اور میں نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سُنا ہے کہ یہ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں تعمیر ہوئی تھی، اور دیوبند کے مؤرخ جناب محبوب رضوی صاحب مرحوم نے لکھا ہے کہ یہ ساتویں صدی ہجری

کی تعمیر شدہ ہے۔ ہمارے دادا حضرت مولانا محمد یاسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کے متولی تھے۔ ان کے بعد میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ اس کے متولی رہے، اور آپ کے پاکستان تشریف لے جانے کے بعد ہمارے چچا حضرت مولانا ظہور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کے متولی رہے، اور اب اس کی تولیت کی خدمت اُن کے فاضل صاحبزادے حضرت مولانا خورشید عالم صاحب مدظلہم کے پاس ہے۔ اسی مسجد سے ملحق ایک حجرہ ہے جو ہمارے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے ہمارے دادا کے لیے بنوایا تھا، وہ ابھی تک اُسی طرح موجود ومحفوظ ہے۔

دوپہر کا کھانا میرے چچازاد بھائی حضرت مولانا خورشید عالم صاحب مدظلہم کے یہاں تھا جو دیوبند میں ہمارے اور ہمارے اعزہ کے درمیان ہمیشہ رابطے کا ذریعہ رہتے ہیں۔ ان کا مکان ہمارے آبائی محلے میں ہے جو بڑے بھائیوں کا محلّہ کہلاتا ہے، اور چونکہ یہاں سے ہجرت کرتے وقت میری عمر صرف پانچ سال تھی، اس لئے دیوبند کے دوسرے علاقوں کے نقوش تو ذہن میں دھندلا گئے تھے، لیکن یہ وہ محلّہ تھا جو ہمیشہ چشم تصور میں بسا رہا۔ اُس وقت اس محلے کی گلیاں بڑی سڑکیں نظر آتی تھیں، اور اسی میں مکانوں کے درمیان ایک چوڑی سی جگہ تھی جسے ہم چوک کہا کرتے تھے، اور وہ اُس وقت ہماری نگاہ میں ایک وسیع اسٹیڈیم سے کم نہ تھا، لیکن اب یہ گلیاں اور یہ چوک دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی بڑی تصویر کو اچانک چھوٹا (reduce) کردیا گیا ہو۔ دنیا میں انسان کو اپنی زندگی کے مختلف مراحل میں یہی صورت پیش آتی ہے کہ جب تک وہ اپنے ماحول سے باہر نہیں نکلتا، اُسے اپنا ماحول ہی سب کچھ اور سب سے بڑا معلوم ہوتا ہے، لیکن جب اُس ماحول سے نکل کر کسی وسیع تر جگہ پر پہنچتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ بہت چھوٹی چیز کو بہت بڑی سمجھے ہوئے تھا۔ آج بھی ہم اس دنیا کو بہت بڑا سمجھتے ہیں، اور اُس کی وسعتوں میں مگن رہتے ہیں، اور اُس سے زیادہ وسیع کسی عالم کا تصور کرنا ہمارے لئے مشکل ہوتا ہے، لیکن جب آخرت میں پہنچیں گے تو پتہ چلے گا کہ:

مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَّالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى.

(سورۃ النساء:۷۷)

دنیا کا ساز و سامان بہت تھوڑا ہے، اور متقی کے لیے آخرت کہیں زیادہ بہتر ہے۔

اُس گھر میں جو کبھی ہمارا تھا

بہر حال! اسی بڑے بھائیوں کے محلے میں ہمارا وہ گھر بھی واقع ہے جو اب ہمارا نہیں ہے۔ لیکن بچپن کی یاد تازہ کرنے کے لیے اُسے نہ صرف دیکھنے کو جی چاہتا تھا، بلکہ میرے بیٹے مولوی حسان اشرف سلمہ چونکہ ہوش کے عالم میں پہلی بار دیوبند آئے تھے، اس لئے اُنہیں بھی دکھانا پیش نظر تھا۔ چنانچہ پہلے ہم اپنے جدامجد حضرت مولانا محمد یاسین صاحب قدس سرہ کے مکان میں داخل ہوئے جو بفضلہٖ تعالیٰ اب بھی ہماری پھوپی زاد بہن کے تصرف میں ہے۔ یہ وہ گھر ہے جس میں ہمارے جدامجد نے اپنی پوری زندگی اور ہمارے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی دیوبند کی زندگی کا بیشتر حصہ گذارا تھا۔ ہمارے جدامجد رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے ہم عمر تھے، یعنی جس سال دارالعلوم قائم ہوا، اُسی سال اُن کی ولادت ہوئی، اور وہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے دارالعلوم دیوبند کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب اُس کے شیخ الحدیث سے لے کر چوکی دار تک ہر شخص صاحب نسبت ولی اللہ ہوتا تھا۔ وہ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہم سبق تھے، اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید۔ ساری زندگی دارالعلوم دیوبند میں درس وتدریس میں اس طرح گذاری کہ کئی کئی پشتوں کے استاذ رہے، اور ہر جمعرات کو دارالعلوم دیوبند میں تدریس سے فارغ ہو کر اکثر پیدل گنگوہ جاتے، اور جمعہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گزار کر واپس آتے تھے۔ مجھے اپنے دادا کی زیارت تو نصیب نہیں ہوئی، لیکن ہماری دادی صاحبہ بھی حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی مرید تھیں، اور ہم نے ان کا یہ حال سالہا سال دیکھا ہے کہ ان کی زبان کبھی ذکر اللہ سے خالی نہیں ہوتی تھی، اور ان کے ہر سانس کے ساتھ ''اللہ اللہ'' کی آواز ہم سُنا کرتے تھے۔ یہ انہی خدارسیدہ بزرگوں کا سادہ سا مسکن تھا، جو آج بھی اپنی اُسی

صورت پر موجود ہے۔ یہاں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سمیت تمام اکابر علماء دیوبند کی آمدورفت رہا کرتی تھی، اور آج بھی اُن کے انفاس قدسیہ کی مہک اُس کے در و دیوار میں بسی ہوئی ہے۔

اسی مکان سے متصل حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نیا مکان بنوایا تھا جس میں میری اور میرے کئی بھائیوں کی پیدائش ہوئی۔ دونوں مکانوں کے درمیان ایک سرنگ نما راستہ تھا جسے ہم نیم دری کہا کرتے تھے، اور اب وہ ختم ہوگئی ہے۔ اس لئے ہم جدی مکان کی چھت پر چڑھ کر اس مکان میں اُترے۔ ہمارے پاکستان جانے کے بعد یہ مکان کسٹوڈین نے قبضے میں لے کر اُسے شرنارتھیوں کو دیدیا تھا، پھر وہ مختلف ہاتھوں میں رہنے کے بعد تین حصوں میں تقسیم کردیا گیا۔ ہم مکان کے شمالی حصے میں تھے جہاں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میرے مرحوم بھائی جناب مولانا محمد زکی کیفی رحمۃ اللہ علیہ کی شادی کے وقت دو کمرے بنوائے تھے۔ ذرا آگے بڑھ کر مکان کا صدر دروازہ تھا جو مشرقی جانب سڑک پر کھلتا تھا، اور اُس کے دائیں جانب حضرت والد صاحب کی بیٹھک اور اور اُس سے متصل وہ حجرہ تھا جو اُن کی عبادت گاہ تھی۔ مکان کے یہ حصے دیکھ کر نہ جانے کتنے مناظر نگاہوں میں پھر گئے۔ مکان کا باقی حصہ مقفل تھا، اور فوری طور پر کھلوایا نہ جاسکا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جب یہ گھر تعمیر فرمایا تھا تو اُسی وقت اُس پر ایک کتبہ لگایا تھا جس پر یہ شعر لکھا ہوا تھا:

دنیا کا کچھ قیام نہ سمجھو، کرو خیال
اس گھر میں تم سے پہلے بھی کوئی مقیم تھا

اور میرے مرحوم بھائی جناب محمد رضی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے پاکستان جاتے وقت اوپر کی منزل میں ایک جگہ یہ شعر لکھ دیا تھا:

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے !

یہ شعر اس گھر کے نئے نئے مکینوں کو اپنے پیش رووں کی بھی یاد دلاتے رہے ہونگے، اور آنے والوں کا خیال بھی۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ گھر بڑے ذوق وشوق سے بنوایا تھا، لیکن فرماتے ہیں کہ جس دن میں نے اس سے قدم نکالا، وہ میرے دل سے نکل گیا۔ حضرتؒ نے اپنے دیوبند کے سفرنامہ میں دنیا کی بے ثباتی کے جو سبق ذکر فرمائے ہیں، وہ بڑے عظیم ہیں۔

اسی محلے میں ہمارے متعدد رشتہ داروں کے گھر ہیں۔ ان سب کے یہاں تھوڑی تھوڑی دیر حاضری دیکر ہم حضرت مولانا خورشید عالم صاحب مدظلہم کے مکان پر پہنچے جہاں انہوں نے میرے ددھیالی رشتہ داروں کا بڑا اجتماع کیا ہوا تھا۔ کھانے پر ان سب حضرات سے پُرلطف ملاقات رہی۔

کھانے کے بعد قیام گاہ پر پہنچ کر کچھ دیر آرام کا موقع ملا۔ اللہ تعالیٰ انس صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائیں کہ انہوں نے ہمیں ایک آرام دہ کمرے میں لیجا کر دروازہ بند کر دیا، اور آنے والوں کی دیکھ بھال خود کرتے رہے۔

اطراف کے علماء سے ملاقاتیں

چار بجے کے قریب میں نے کمرے سے نکل کر دیکھا تو ملاقات کا کمرہ ان حضرات علماء کرام سے بھرا ہوا تھا جن سے ملاقات کی خواہش تھی، اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مختصر وقت میں ملاقات کیسے ہو سکے گی۔ مظاہر العلوم سہارن پور سے حضرت مولانا محمد شاہد صاحب کا گرامی نامہ مجھے کراچی سے چلتے ہوئے ملا تھا، جس میں انہوں نے بڑی محبت سے مظاہر العلوم آنے کی دعوت دی تھی۔ میں نے ان سے فون پر بات کر کے عرض کیا تھا کہ اپنی شدید خواہش کے باوجود میں دیوبند کے علاوہ کہیں، یہاں تک کہ تھانہ بھون اور جلال آباد بھی نہیں جا سکوں گا۔ چنانچہ انہوں نے کرم فرمایا، اور خود دیوبند تشریف لے آئے، ویزا نہ ہونے کی بناء پر تھانہ بھون نہ جا سکنے کا افسوس تھا، لیکن وہاں کی خانقاہ کے موجودہ مہتمم مولانا نجم الحسن صاحب تھانوی زید مجدہم بھی وہاں سے سفر کر کے دیوبند تشریف لے آئے اور ان

سے ملاقات کی نعمت مل گئی۔ مولانا نورالحسن راشد صاحب کاندھلوی حفظہ اللہ تعالیٰ خاتم المثنوی حضرت مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے ہیں، اور ان کے پاس اکابر کے مخطوطات کا بڑا نادر اور قیمتی ذخیرہ ہے، جس کی بنیاد پر ان کے متعدد علمی اور تحقیقی کارنامے منظرعام پر آچکے ہیں، امید نہیں تھی کہ اس سفر میں اُن سے ملاقات ہو سکے گی، لیکن انہوں نے کرم فرمایا، اور کاندھلہ سے تشریف لے آئے۔ غرض الہ آباد، میرٹھ، مظفرنگر، سہارن پور، پھلت، اور نہ جانے کہاں کہاں سے حضرات علماء کرام کا ایک گلدستہ تھا جو یہاں نظرافروز تھا۔ دارالعلوم (وقف) اور قدیم دارالعلوم کے حضرات اساتذہ، حضرت مولانا اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے بھی تشریف فرما تھے۔ ان حضرات سے ملاقات اور ان کی زیارت میرے لئے نعمت غیر مترقبہ تھی جس سے دیدہ و دل شاداب ہوئے۔

اسی دوران برابر کی گلی میں شور سنائی دے رہا تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ بہت سے حضرات طلبہ اور عام مسلمانوں کا ایک جم غفیر ہے جو گلی میں جمع ہے، اور ملاقات کا خواہشمند۔ جو حضرات علماء کمرے میں جمع تھے، انہوں نے فرمایا کہ بہت سے لوگ دور دور سے آئے ہوئے ہیں، اس لئے آپ کم از کم اُن سے مصافحہ کرلیں۔ انس صاحب کے مکان میں ایک بالکنی ہے جو سامنے کی گلی میں کھلتی ہے، میں اُس بالکنی میں گیا تو ایک عجیب منظر سامنے تھا۔ پوری گلی، جسے ہم ''بکر قصابان کی گلی'' کہتے تھے، ایک سرے سے دوسرے سرے تک انسانوں سے بھری ہوئی تھی، اور اُس میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ میں یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ خدا جانے کیا سمجھ کر یہاں جمع ہوگئے تھے! ان کی محبت کا میں کیا صلہ دے سکتا تھا۔ میرے میزبانوں کے کہنے پر وہ ایک ایک قطار کر کے سامنے سے گذرتے رہے، اور فرداً فرداً ان سے سلام اور مصافحہ ہوتا رہا، لیکن ایسا لگتا تھا کہ یہ سلسلہ دراز ہی ہوتا جارہا ہے، اور اس کی کوئی انتہا نہیں ہے، یہاں تک کہ عصر کی اذان ہوگئی۔ آدینی مسجد دس بارہ فٹ کے فاصلے پر بالکل سامنے تھی، لیکن وہاں

تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ پوری گلی اب بھی بھری ہوئی تھی، اور مسجد کی ہر سیڑھی آدمیوں سے جام تھی۔ نتیجہ یہ کہ ہم مسجد تک نہیں پہنچ سکے، اور قیام گاہ پر موجود علماء کرام کے ساتھ یہیں پر جماعت کرنی پڑی۔ جماعت کے بعد میں نے دوبارہ بالکنی میں جاکر ہجوم سے مختصر خطاب کرکے اُن سے درخواست کی کہ کافی دیر سے یہ گلی ہجوم کی وجہ سے بند ہے، اور ضرورت مند لوگوں کو تکلیف ہو رہی ہے، اور اب یہ ممکن نہیں ہے کہ تمام حضرات سے مصافحہ ہو سکے، اس لئے اسی قدر پر اکتفا فرمائیں، اور بعد مغرب جو جلسہ ہونے والا ہے، اُس میں ان شاء اللہ تعالیٰ اجتماعی گفتگو ہو جائیگی۔ پھر ایک اجتماعی دعا کرکے مجمع چھٹنا شروع ہوا اور گلی میں آنے جانے کا راستہ پیدا ہو گیا۔

استقبالی جلسہ

نماز مغرب کے بارے میں یہ طے ہوا تھا کہ محمود ہال میں جماعت ہوگی، اور اُس کے بعد وہیں پر اہل دیوبند کی طرف سے وہ استقبالی جلسہ ہوگا جو جناب حسیب صاحب نے ترتیب دیا ہے۔ چنانچہ مغرب سے کچھ پہلے انس صاحب ہمیں گاڑی میں لے کر روانہ ہوئے۔ میری خواہش یہ تھی کہ میں پہلے قبرستان قاسمی میں اپنے بزرگوں کو سلام عرض کرنے کے لیے جاؤں، لیکن ساتھیوں نے باتفاق یہ کہا کہ وہاں اس قدر ہجوم ہوگا کہ سنبھالنا مشکل ہوگا۔ ہم شہر سے باہر باہر جی ٹی روڈ کی طرف سے نکلے۔ مجھے خیال آیا کہ اسی روڈ کے کنارے میرے پردادا حضرت خلیفہ تحسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی قبر ہے، کم از کم ان کی قبر پر سلام عرض کرنے کی توفیق ہو جائے۔ میرے بھتیجے مولوی عارف اور مولوی واصف صاحبان اُس کی جگہ سے واقف تھے۔ چنانچہ وہاں حاضری دی۔ اُس قبر کی علامت یہ تھی کہ وہاں ایک آم کا درخت ہوتا تھا جسے سُنار والا درخت کہتے تھے۔ میں نے بزرگوں سے سُنا ہے کہ اس کا پھل پورے خاندان میں تقسیم ہوا کرتا تھا۔ وہ درخت اب بھی موجود ہے، لیکن شاید اُس نے پھل دینا بند کر دیا ہے۔

آخر کار ہم کسی طرح محمود ہال پہنچ گئے۔ یہ ہال حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب

قدس سرہ کے نام پر بنایا گیا تھا، اور مختلف اجتماعات اور بالخصوص دارالعلوم آنے والے مہمانوں کے اجتماعات یہاں ہوتے رہے ہیں۔ بائیس سال پہلے میری دیوبند حاضری کے موقع پر بھی جناب حسیب احمد صدیقی صاحب نے یہیں پر ایک استقبالی اجتماع کیا تھا۔ لیکن آج تو یہاں کی حالت ہی کچھ اور تھی۔ چونکہ منتظمین کو اندازہ ہوگیا تھا کہ مجمع کے لیے ہال کافی نہیں ہوگا، اس لئے انہوں نے ہال کے باہر کھلے میدان میں اسٹیج بنایا تھا۔ اور یہ پورا میدان کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ نماز مغرب مجھے پڑھانے کے لیے فرمایا گیا تھا، لیکن مصلے تک پہنچنا مشکل ہوگیا، اور نماز کے دوران اندازہ ہوا کہ بہت سے لوگ جگہ نہ ملنے کی بنا پر جماعت میں شامل ہونے سے رہ گئے۔

نماز کے بعد ہم اسٹیج پر اس طرح پہنچے کہ: ''پا بہ دست دگرے، دست بدست دگرے''۔ اسٹیج بہت وسیع تھا، اور اُس پر اکابر علماء کرام موجود تھے، اور الحمدللہ، دارالعلوم کی تقسیم کے بعد شاید یہ پہلا موقع تھا کہ دونوں دارالعلوم کے اکابر علماء ایک اسٹیج پر جمع تھے۔ دیوبند کے مشہور ومقبول شاعر جناب نواز دیوبندی نے اسٹیج سیکریٹری کے فرائض انجام دیئے۔ میرے بھتیجے مولانا قاری محمد واصف نے تلاوت کی۔ اُس کے بعد دارالعلوم دیوبند کے معروف اُستاذ حدیث حضرت مولانا ریاست علی بجنوری صاحب دامت برکاتہم نے اپنے خطاب میں مجھ ناکارہ کے لیے خیر مقدمی کلمات ارشاد فرمائے، اور جلسے کی صدارت کے لیے حضرت مولانا خورشید عالم صاحب مدظلہم کا اسم گرامی تجویز کیا۔ پھر حضرت مولانا محمد عثمان صاحب صدر جمعیة علماء ہند اور سابق نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اپنے خطاب میں مجھ ناکارہ کے لیے ہمت افزائی کے کلمات فرمائے، اور حضرت مولانا خورشید عالم صاحب مدظلہم کی صدارت کی تائید کی۔ جناب حسیب احمد صدیقی صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ نے سپاسنامہ پیش کیا جس کا ایک ایک لفظ محبت اور شفقت سے بھرا ہوا تھا۔ پھر میرے بھتیجے مولانا محمد عارف قاسمی نے خاندان والوں کی طرف سے الگ سپاس نامہ پیش کیا۔ اُس کے بعد مجھے دعوت خطاب دی گئی۔ میں خطاب کے لیے کرسی پر بیٹھا تو بلا مبالغہ حد نظر تک سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ اسٹیج

کے چاروں طرف انسانوں کا سمندر تھا، اور قریب کی کئی منزلہ عمارتیں چھتوں اور گیلریوں سمیت لوگوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اخبار نویسوں کے اندازے کے مطابق مجمع پچیس تیس ہزار سے کم نہیں تھا۔

میں نے عرض کیا کہ اس وقت دل میں ملے جلے جذبات اور خیالات کا جو تلاطم برپا ہے، اُس کی وجہ سے مجھے کبھی کوئی خطاب اتنا مشکل معلوم نہیں ہوا جتنا آج کا یہ خطاب معلوم ہو رہا ہے۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ دیوبند ایک چھوٹی سی بستی ہے جس کا دنیا کے شہروں سے موازنہ کیا جائے تو تمدنی لحاظ سے اُس کا کوئی مقام نہیں ہے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُس کو دنیا بھر میں نہ صرف یہ کہ عظیم شہرت عطا فرمائی ہے، بلکہ دنیا بھر میں اُس کے فیوض کا نور پھیلا ہے، ہم اہلِ دیوبند کو اُس کی وجہ پر غور کرنا چاہئے۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں کہ یہاں علم وتحقیق کے دریا بہائے گئے ہیں، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ یہاں کے اکابر نے نہ صرف اپنی زبان وقلم سے بلکہ اپنے کردار وعمل سے بھی دین کا وہ تصور پیش کیا جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک الفاظ میں ''مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ'' کی مجسم تفسیر تھا۔ میں نے اکابر علماء دیوبند کے زہد وورع اور تواضع وسادگی اور اتباعِ سنت کے کچھ واقعات کے حوالے سے درخواست کی کہ ہم ان اکابر کے نام لیوا ہیں، اس لئے ہمیں ہر وقت یہ جائزہ لیتے رہنا چاہئے کہ ہماری زندگیوں میں ان حضرات کی سیرت وکردار کا کوئی عکس ہے یا نہیں۔

عشاء کی نماز تیار ہوئی تو یہ یادگار اجتماع برخاست ہوا۔ جلسے کے شروع میں مجمع کی کثرت کی وجہ سے دھکا پیل بھی دیکھنے میں آئی تھی، اس لئے میں نے اپنی تقریر میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ ہمارا دین ہمیں نظم وضبط کا درس دیتا ہے، اور ہمیں کوئی ایسا منظر پیش نہیں کرنا چاہئے جس سے ہم اپنی بدنظمی سے دین اور اکابر دیوبند کی غلط نمائندگی کریں، لہٰذا جلسے کے برخاست ہونے پر نظم وضبط کا مظاہرہ ہونا چاہئے۔ چنانچہ اسٹیج پر تو جگہ کی تنگی کی وجہ سے جو دقت طبعی طور پر ہونی چاہئے تھی، وہ ہوئی، لیکن جلسے کے سامعین نے بفضلہ تعالیٰ بڑی حد تک اس گذارش کی لاج رکھی، اور جلسہ گاہ سے لوگ بحیثیت مجموعی اطمینان سے رخصت ہوئے۔

عشاء کے بعد میرے ماموں زاد بھائی جناب قاری محمد عاصم صاحب نے اپنے گھر پر کھانے کا انتظام کیا ہوا تھا۔ اُن کے گھر جاتے ہوئے راستے میں میرے پھوپی زاد بھائی حضرت مولانا سید حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر حاضری دی جو دارالعلوم دیوبند کے قابل اور مقبول استاذ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مجاز صحبت اور بڑے درویش صفت بزرگ تھے۔ آج کل اس مکان میں اُن کے صاحب زادے مولانا خورشید حسن صاحب سلمہ مقیم ہیں جو دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء میں عرصے تک کام کرتے رہے ہیں، اور تالیف وتصنیف سے بھی شغف رکھتے ہیں، ان کی بعض کتابیں خاصی مقبول ہوئی ہیں۔ ان کے گھر میں تھوڑی دیر گزار کر ہم آگے بڑھے تو دیوبند کی جامع مسجد کے سامنے بازار سے گذرے۔ یہ ہمارا جانا پہچانا بازار تھا۔ یہاں کے دوکاندار جمع ہوگئے، اور ایک ایک سے ملاقات ہوئی، یہاں تک کہ عاصم صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ یہ ہمارے نانا کا گھر تھا، اور ہمارے تین ماموں وہاں مقیم رہے۔ اب تینوں رخصت ہوچکے ہیں، اور عاصم صاحب اُن کی یادگار ہیں۔ انہوں نے ہمارے تمام ننھیالی رشتہ داروں کو جمع کیا ہوا تھا۔ رات بارہ بجے تک اُن کے ساتھ بڑا پُر لطف اجتماع رہا۔

دارالعلوم (وقف) میں

اگلے دن ناشتہ میرے مرحوم چچازاد بھائی حضرت مولانا شکور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے مولانا سرور احمد صاحب کے یہاں تھا۔ اور اُس کے بعد پروگرام یہ طے ہوا تھا کہ صبح ساڑھے آٹھ بجے دارالعلوم (وقف) میں حاضری ہوگی، اور دس بجے قدیم دارالعلوم میں۔ چنانچہ ہم نے پہلے دارالعلوم (وقف) میں حاضری دی۔

دارالعلوم کی تقسیم کے بعد میں پہلی بار دیوبند آیا تھا، اس لئے اس سے پہلے دارالعلوم (وقف) میں حاضری کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب جا کر دیکھا تو ماشاء اللہ بڑی شاندار اور پُر شکوہ عمارت نظر آئی، اور طلبہ کی بھی بہت بڑی تعداد۔ مختصر مدت میں اس دارالعلوم نے بڑی ترقی کی ہے، اور مجھے جناب یوسف سیٹھی صاحب مرحوم کی بات یاد آئی۔ وہ فرمایا

کرتے تھے کہ جب مجھے کسی مدرسے کے ارباب حل وعقد میں اختلاف کی اطلاع ملتی ہے تو میں اس حیثیت سے خوش ہوتا ہوں کہ اب ایک مدرسہ اور قائم ہونے جارہا ہے۔ اس طرح اختلاف کے شر سے بھی اللہ تعالیٰ خیر پیدا فرمادیتے ہیں۔ ڈابھیل کا دارالعلوم سالہا سال سے اس کی زندہ مثال ہے، اور اب یہ دارالعلوم (وقف) بھی اسی کی نظیر ہے۔ اور اب بفضلہٖ تعالیٰ دونوں اداروں میں مصالحت کی فضا بھی پیدا ہوئی ہے جس کا نمونہ لوگوں نے گذشتہ شب دونوں اداروں کے اکابر کو ایک اسٹیج پر جلوہ افروز ہونے کی شکل میں دیکھ لیا۔

یہاں بھی طلبہ اور اساتذۂ کرام کی طرف سے انتہائی محبت اور میری بساط سے کہیں زیادہ اعزاز واکرام کا معاملہ فرمایا گیا۔ تلاوت کے بعد حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب مدظلہم مہتمم دارالعلوم کا یہ پیغام پڑھ کر سنایا گیا جو اس وقت ملک سے باہر سفر میں تھے:

“باسمہ تعالیٰ”

گرامی قدر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ جان کر قلبی مسرت ہوئی کہ آنجناب کی مادر وطن دیوبند میں تشریف آوری ہوئی ہے، اور اس ضمن میں دارالعلوم وقف دیوبند کے اساتذہ وطلبہ سے ملاقات اور ناصحانہ کلمات سے نوازنے کے لئے آنجناب نے اپنا قیمتی وقت عنایت فرمایا، جس کے لئے ہم آنجناب کے دل سے شکر گزار ہیں۔ دارالعلوم وقف دیوبند کے لئے آنجناب ناآشنا نہیں ہیں اور نہ ہی آنجناب دارالعلوم وقف دیوبند کے لیے اجنبی۔ آپ کی تشریف آوری پر اہلاً وسہلاً مرحبا تو آپ کی تشریف بری پر “سلامت روی وباز آئی” کے دعائیہ کلمات یہاں کے ہر فرد کی زبان پر ہیں۔

خدا تعالیٰ آپ کی تشریف آوری کو پورے ملک کے لیے عموماً

اور اہلِ دیوبند و دار العلوم وقف کے لئے خصوصاً باعثِ برکت بنائے اور صحت و سلامتی کے ساتھ آپ کی خدماتِ علمیہ جاری وساری رہیں۔

سفر کی وجہ سے آنجناب سے ملاقات نہ ہوسکنے کا افسوس ہے۔

والسلام

(مولانا) محمد سالم قاسمی (مدظلہ) مہتمم دار العلوم وقف دیوبند
(مولانا) محمد سفیان قاسمی (مدظلہ) نائب مہتمم دار العلوم وقف دیوبند

پیش کردہ:
عبداللہ ابن القمر الحسینی
ناظم شعبہ نشر واشاعت، دار العلوم وقف دیوبند
مورخہ ۱۱/ جولائی ۲۰۱۰ء

پھر الہ آباد سے آئے ہوئے جناب کامل چاٹلی نے، جو بڑے خوش گو شاعر ہیں، میری قدر افزائی کے لیے اپنی نظم سنائی، اور حضرت مولانا خورشید عالم صاحب مدظلہم نے حکم دیا کہ میں صحیح بخاری کے آخری باب کا درس دوں۔ یہ اگرچہ میری اہلیت سے بہت زیادہ تھا کہ دار العلوم میں یہ جرأت کروں، لیکن تعمیلِ حکم اور تحصیلِ سعادت کے لیے میں نے حدیث مسلسل بالاولیۃ طلبہ کو سنائی، اور اُس کے بعد صحیح بخاری کے آخری باب اور آخری حدیث کے بارے میں کچھ گذارشات پیش کیں، اور طلبہ کی فرمائش پر انہیں حدیث کی عام اجازت بھی دی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے خطاب کے بعد وہاں سے روانہ ہوئے۔ قبرستان قاسمی پر حاضری کا ابھی تک موقع نہیں مل سکا تھا، میں نے دوبارہ خواہش کی کہ اب وہاں ہوتے جائیں، لیکن ساتھیوں نے بتایا کہ ہجوم کی شدت کی وجہ سے وہاں مجمع کو سنبھالنا سخت مشکل ہوجائیگا۔ البتہ دار العلوم (وقف) دیوبند کے بالکل قریب، جو محلہ خانقاہ میں قائم ہوا ہے، امام العصر حضرت مولانا سید انورشاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا مزار واقع ہے، وہاں تک

دارالعلوم دیوبند کی مسجد رشید

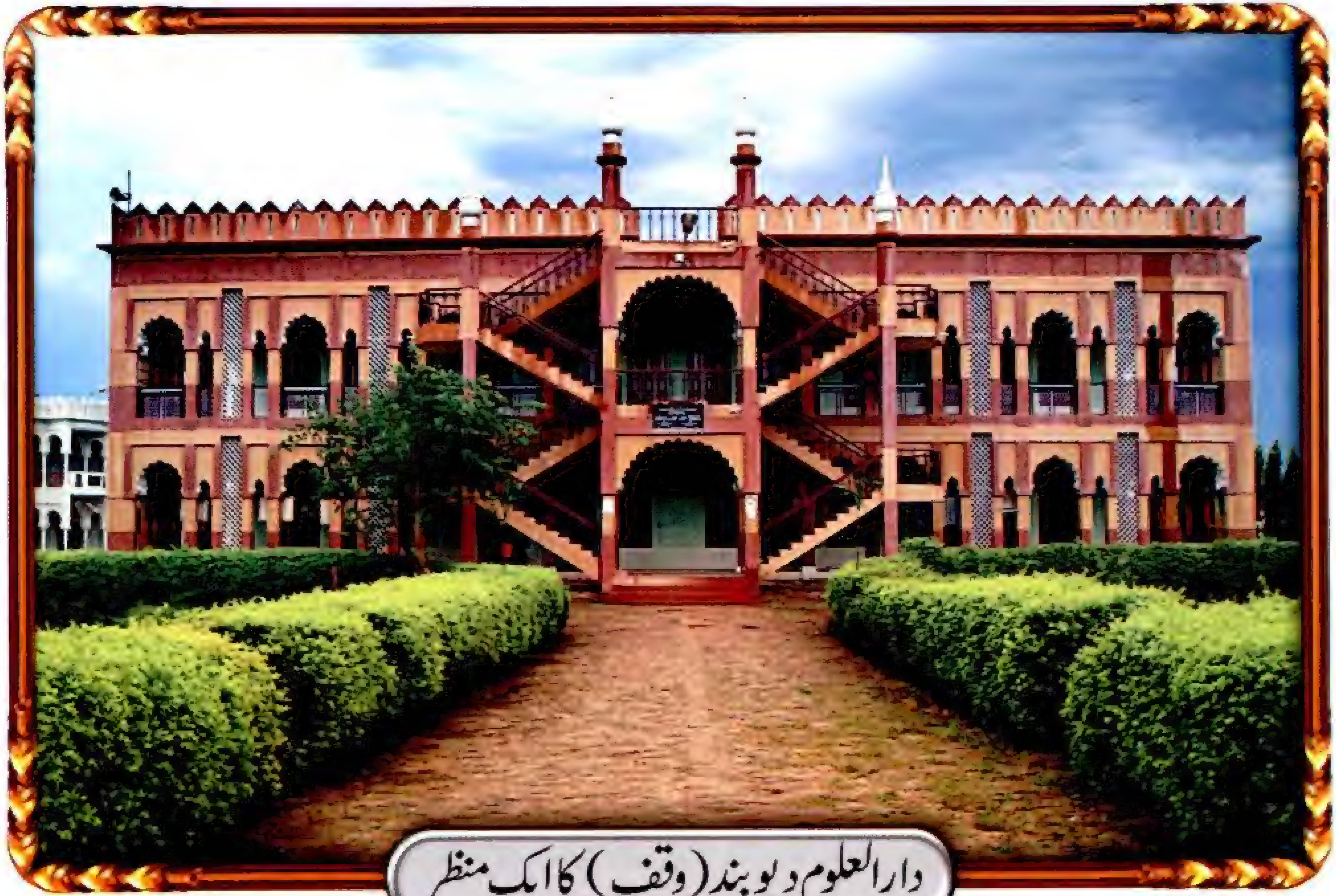

دارالعلوم دیوبند (وقف) کا ایک منظر

پہنچنا مشکل نہیں تھا، چنانچہ الحمدللہ اُس امام العصرؒ کے مزار مبارک پر حاضری اور سلام عرض کرنے کا موقع نصیب ہوا جن کے افادات سے تقریباً ہر روز کسی نہ کسی شکل میں استفادے کی نوبت آتی رہتی ہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔ اُنہی کے برابر میں تازہ ترین مزار اُن کے لائق وفائق صاحبزادے حضرت مولانا انظر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جو اس ناچیز پر بہت مہربان تھے، اور حال ہی میں اُن کی وفات ہوئی ہے۔ دارالعلوم (وقف) کی مسند حدیث سالہا سال اُن سے آباد رہی ہے، اور ان کی تحریر وتقریر کے فیوض ماشاء اللہ عالم اسلام کے مختلف خطوں میں پھیلے ہیں۔ اُن کی قبر پر بھی سلام عرض کیا، اور پھر دارالعلوم قدیم کی طرف روانہ ہوگئے۔

دارالعلوم دیوبند (قدیم) میں

ہجوم تو ہر جگہ ہی ہم رکاب تھا۔ دارالعلوم قدیم میں حاضری کے لیے بھی منتظمین کو خاصی منصوبہ بندی کرنی پڑی کہ گاڑی کہاں سے لائی جائے، اور کہاں روکی جائے۔ بالآخر پہلے مہمان خانے میں حاضری ہوئی جہاں دارالعلوم کے اساتذۂ کرام اور منتظمین جمع تھے، جن میں حضرت مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی مدظلہم نائب مہتمم دارالعلوم، حضرت مولانا محمد عثمان صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند، حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری مدظلہم بھی شامل تھے۔ اُن سب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور سب حضرات نے بڑی محبت وشفقت کا معاملہ فرمایا۔ حضرت مولانا ارشد مدنی صاحب مدظلہم ان دنوں سفر پر تھے، اس لئے ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہم کو شاید آج سفر پر جانا تھا، اس لئے وہ یہاں موجود نہیں تھے، لیکن آج ہی صبح نماز فجر کے بعد انہوں نے کرم فرمایا، اور میری قیام گاہ پر خود ہی تشریف لے آئے تھے، اس طرح بفضلہ تعالیٰ ان کی زیارت اور ملاقات پہلے ہو چکی تھی۔ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہم مہتمم دارالعلوم دیوبند آجکل صاحب فراش ہیں، اس لئے اُن کی خدمت میں حاضری ہوئی، آج کل علالت کی وجہ سے اُن کے لیے بولنا بھی مشکل ہوتا ہے، لیکن انہوں نے نہایت شفقت

فرمائی، اور بتایا کہ میں نے علم ہیئت کی کتاب ''التصریح'' آپ کے والد ماجد (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ) سے پڑھی ہے۔ چلتے وقت اپنے باغ کے انور رٹول آموں کی ایک پیٹی بھی عنایت فرمائی۔

اُس کے بعد منتظمین کی طرف سے دارالعلوم کی مسجد رشید میں اجتماع رکھا گیا تھا۔ مجھ سے پہلے ہی یہ فرمایا گیا تھا کہ طلبہ اجازت حدیث کے بھی خواہش مند ہیں۔ منتظمین کا خیال تھا کہ مجمع کی کثرت کی وجہ سے مسجد ہی میں درس حدیث بھی ہو جائے، اور پھر تقریر بھی، چنانچہ اسی پروگرام کے تحت ہم نے مسجد رشید کی طرف چلنا چاہا، لیکن طلبہ نے اصرار کیا کہ پہلے درس حدیث دارالحدیث میں ہو، پھر مسجد رشید میں بیان ہو۔ چنانچہ منتظمین ان کی خواہش کے مطابق مجھے دارالحدیث لے گئے۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے اُس دارالحدیث کی مسند تدریس پر بیٹھنا بہت بڑی جسارت معلوم ہو رہی تھی جہاں حضرت شیخ الہند، امام العصر حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری، حضرت علامہ عثمانی اور حضرت مدنی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے اساطینِ علم وفضل نے درس دیا ہے، لیکن اصرار اس قدر شدید تھا کہ اس کی مخالفت کرنا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے لئے اسے فال نیک سمجھ کر تعمیل کی۔ طلبہ کو حدیث مسلسل بالاولیۃ سنائی، اور پھر طلبہ نے صحیح بخاری کی ایک حدیث بھی پڑھی، اور اجازت عامہ بھی حاصل کی، اور پھر مختصر خطاب بھی ہوا۔

اس کے بعد ہم دارالعلوم کی عالیشان مسجد رشید پہنچے جہاں ایک جم غفیر منتظر تھا۔ مجلس کی صدارت حضرت مولانا ریاست علی بجنوری مدظلہم نے فرمائی، اور اپنے ابتدائی خطاب میں اپنے حسن ظن کی بنیاد پر ایک ایسی بات ارشاد فرمائی جسے میں اپنی نااہلی کے باوجود اپنے لئے فال نیک سمجھتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا کہ دارالعلوم دیوبند میں جب کوئی مہمان آتا ہے تو ہم اُس کے سامنے دارالعلوم کا تعارف پیش کرتے ہیں، لیکن آج ہم ایک ایسے مہمان کا استقبال کر رہے ہیں جو دارالعلوم ہی کے ہیں، اور انہیں دارالعلوم کا تعارف کرانے کے بجائے ہمیں اُن سے پوچھنا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کیا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم انہیں

ساری دنیا میں دارالعلوم دیوبند کا ترجمان سمجھتے ہیں۔ یہ الفاظ میرے لئے بہت بڑا اعزاز تھے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ مجھے اُن کا اہل بننے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

میں نے اپنے خطاب میں عرض کیا کہ آج میری زندگی کا یادگار دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اُس دارالعلوم کی عمارت میں حاضری کی توفیق عطا فرمائی جو بچپن سے میرے خوابوں کا محور رہا ہے، جہاں کے تذکرے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے صبح وشام سنے ہیں، جہاں کے اکابر کی محبت وعظمت سے دل ہمیشہ لبریز رہا ہے، جس کے مسلک ومشرب کو دین کی مثالی تعبیر سمجھا ہے، اور دنیا بھر میں اُس کی تشریح کو اپنے لئے سعادت سمجھ کر اختیار کیا ہے، اور تقریر وتحریر کے ذریعے اُس کے دفاع کی مقدور بھر کوشش کی توفیق ملی ہے۔ اس کے بعد میں نے اکابر دارالعلوم کے کچھ ان واقعات کا تکرار کیا جو میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنے ہوئے تھے، اور جن سے علماء دیوبند کا مسلک ومشرب اور علمی اور عملی مزاج ومذاق واضح ہوتا ہے۔ حضرت مولانا ریاست علی بجنوری صاحب مدظلہم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم دنیا بھر میں پھرتے رہتے ہو، آج کے بیان میں کچھ یہ بھی بتاؤ کہ عالم اسلام کا مستقبل تمہیں کیسا لگتا ہے؟ چنانچہ اس کے جواب میں میں نے عرض کیا کہ اس وقت دنیا میں دو لہریں ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ ایک بے دینی اور خدا بیزاری کی لہر ہے جو ظاہری اسباب ووسائل سے آراستہ ہے، اور دلوں سے ایمان اور فکر آخرت کو کھرچنے کی کوشش کر رہی ہے، اور دوسری طرف ایک لہر عام مسلمانوں، اور نوجوانوں میں بالخصوص یہ پیدا ہو رہی ہے کہ وہ اپنی عملی زندگی میں اسلام کی طرف لوٹیں، اور اپنا رشتہ قرونِ اولیٰ کے ساتھ جوڑیں۔ عالم اسلام کی حکومتیں عام طور سے، الا ماشاء اللہ، پہلی لہر کے زیر اثر ہیں، اور ان کے ساتھ میڈیا کی طاقت بھی ہے، اور دوسری لہر بے وسیلہ ہے، لیکن چونکہ وہ دل کی گہرائیوں سے اُٹھی ہے، اور اُسے حکومت یا میڈیا کی کسی مصنوعی طاقت نے نہیں اُٹھایا، اس لئے ظاہر یہ ہے کہ آخر کار ان شاء اللہ غلبہ اُس کو حاصل ہوگا، بشرطیکہ وہ ایمان اور حکمت کا دامن تھامے رکھے، اور ایسے جذباتی نعروں سے پرہیز کرے جنہوں نے بہت سے مقامات پر ساری بساط اُلٹ

کر رکھدی ہے۔ آج کل یہ پتہ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے کہ کس جذباتی نعرے کی ڈور کس کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے خاص طور پر نوجوانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے اُن اکابر کے سائے میں رہیں جن کے علم وبصیرت، اخلاص اور تجربے کا وہ مشاہدہ کر چکے ہیں۔

تقریباً ایک گھنٹے کے خطاب کے بعد میری خواہش تو یہ تھی کہ قدیم دارالعلوم کی ایک ایک عمارت میں جا کر اپنے بزرگوں کی یادیں تازہ کروں، لیکن ہجوم کی شدت میں اس کا بالکل موقع نہیں تھا۔ صرف مہمان خانے، دارالحدیث اور مسجد رشید کے درمیان چند عمارتوں پر نظر پڑسکی جن میں ایک وہ کمرہ بھی تھا جس میں میرے والد ماجد قدس سرہ نے دارالعلوم کے صدر مفتی کے طور پر سالہا سال فتویٰ کی خدمت انجام دی ہے۔

اس کے بعد میرے میزبانوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ مجھے کسی طرح گاڑی میں بٹھا کر جی ٹی روڈ کی طرف نکل جائیں، اور اس طرح میں ظہر سے کچھ پہلے ہی دوبارہ اپنے محلے میں پہنچ گیا، اور محلے کے جن گھروں میں کل نہیں جا سکا تھا، آج اُن میں جانے کا موقع مل گیا۔ ان میں سے ایک گھر جس میں جانے کی مجھے شدید خواہش تھی، وہ گھر تھا جس میں، میں نے تتلائی ہوئی زبان میں قاعدہ بغدادی پڑھنا شروع کیا تھا۔ یہ ایک بزرگ خاتون محترمہ امۃ الحنان صاحبہ (رحمہا اللہ تعالیٰ) کا گھر تھا جو نہ صرف محلے کے بلکہ محلے سے باہر کے بھی بچوں اور بچیوں کو قرآن کریم پڑھایا کرتی تھیں، اور اُن کا یہ گھر بچوں کی تلاوت سے گونجتا رہتا تھا۔ وہ یہ رضا کارانہ خدمت ساری زندگی انجام دیتی رہیں، یہاں تک کہ دیوبند کے بہت سے خاندانوں کی کئی کئی پشتوں نے اُنہی سے قرآن کریم پڑھا تھا۔ اور بات صرف قرآن کریم پڑھانے کی نہیں تھی، اُن کا یہ گھر اسلامی آداب واخلاق سکھانے کے لیے بھی ایک تربیت گاہ کی حیثیت رکھتا تھا، اور پڑھنے والی بچیاں یہیں سے خانہ داری کے آداب بھی سیکھتی تھیں۔ اس کے علاوہ نہ صرف ان بچوں اور بچیوں پر بلکہ اُن کے والدین اور دوسرے گھر والوں پر بھی ان کا بڑا اثر ونفوذ تھا، اور وہ اپنے ذاتی مسائل، یہاں تک کہ شادی بیاہ کے معاملات میں بھی ان کی رائے کو بڑا وزن دیتے تھے۔ یہ محترمہ اپنے شاگردوں کے حالات سے پوری طرح باخبر رہتی تھیں، یہاں تک کہ ان کے جو شاگرد پاکستان چلے گئے

تھے، ان کی بھی خیر خبر رکھتی تھیں۔ میرے تمام بہن بھائیوں نے اُن سے پڑھا تھا، اور میں نے بھی قاعدہ بغدادی کا غیر رسمی آغاز انہی کے گھر میں کیا تھا۔ وہ کئی مرتبہ پاکستان تشریف لائیں، اور اُن سے میری آخری ملاقات لاہور میں ہوئی، اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ میری مصروفیات سے پوری طرح باخبر تھیں، یہاں تک کہ اُنہیں یہ بھی معلوم تھا کہ مجھے جدہ کی مجمع الفقہ الاسلامی کا نائب الرئیس منتخب کیا گیا ہے جس پر انہوں نے مجھے شاباش دی اور مسرت کا اظہار فرمایا۔

میں سوچتا ہوں کہ ان بزرگ خاتون کے ہاتھوں کتنے بچے تربیت پاکر علم وفضل کے بلند مقام تک پہنچے، اور ان میں سے بہت سوں نے شہرت کے بام عروج کو چھوا۔ آج دنیا ان کو تو خوب جانتی ہے، لیکن جس گمنام خاتون نے ایک گوشے میں بیٹھ کر اُن کے دل میں ایمان اور علم کا بیج بویا تھا، اُس کے نام اور کام سے کوئی واقف نہیں۔ اُس کی خدمات میں نام ونمود اور شہرت وجاہ کا کوئی شائبہ نہیں تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں کہ وہ کس اجر عظیم کی مستحق ہوں گی! نہ جانے ان کی جیسی کتنی خواتین ہیں جنہوں نے گمنامی کے عالم میں بڑی بڑی شخصیتوں کو تیار کیا ہے، لیکن اُن سے کوئی واقف بھی نہیں۔ رحمهن الله تعالى جميعا رحمة واسعة.

دوپہر کا کھانا میرے خالہ زاد بھائی مولوی فوزان صاحب سلمہ کے گھر میں تھا۔ یہ وہی گھر تھا جس میں میری خالہ نے درویش صفت عالم حضرت مولانا عبدالشکور صاحب مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی بہو کی حیثیت میں زندگی گذاری۔ یہاں ایک بار پھر میرے ننھیالی رشتہ داروں کا پُر لطف اجتماع تھا، اور یہ اُن سے الوداعی ملاقات بھی تھی۔ قیام گاہ پر واپس آکر کچھ دیر آرام کیا، پھر رخصت کا وقت قریب آچکا تھا۔ ہمیں پانچ بجے ریلوے اسٹیشن پہنچنا تھا۔ ایک بار پھر قیام گاہ پر رخصت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہا، اور جب ہم ریلوے اسٹیشن پہنچے تو وہاں دارالعلوم کے طلبہ کا پھر ہجوم تھا۔ میرے بہت سے عزیز بھی رخصت کرنے آئے ہوئے تھے، اور میں نے چلتی ہوئی ریل کے دروازے میں کھڑے دیکھا تو ان میں سے کئی

کی آنکھوں میں محبت کے آنسو تھے، دیکھتے ہی دیکھتے وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے، اور دیوبند کا یہ تیس گھنٹے کا قیام ایک خواب ہو کر رہ گیا۔

دیوبند سے دہلی تک

واپسی میں ایک رات دہلی میں ٹھہر کر صبح دوبارہ مدراس جانا تھا۔ یہاں بھی راستے بھر لوگ ہمارے ڈبے میں آ آ کر ملتے رہے۔ میرٹھ میں حضرت مولانا مفتی فاروق میرٹھی صاحب مسلمانوں کے مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ مرتب فرمائے ہیں جو شاید بیس جلدوں میں شائع ہوئے ہیں، اور ان کا ایک سیٹ مجھے دیوبند میں مل چکا تھا، لیکن ہنگامے میں دیکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ریل ہی میں میرٹھ کا اسٹیشن آنے سے پہلے موبائل فون پر ان کا پیغام ملا کہ وہ میرٹھ اسٹیشن پر ملاقات کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اسٹیشن پر علماء کی ایک جمعیت کے ساتھ تشریف لائے، الحمدللہ ان سے ملاقات اور ان کی دعائیں لینے کا شرف حاصل ہوا۔ وہیں پر سب نے مل کر دعا بھی کی، اور چند منٹ کے بعد ریل دوبارہ روانہ ہوگئی۔

مولانا ابراہیم صاحب رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند اور جناب حسن بھائی جو اس پورے سفر میں میرے ساتھ تھے، انہوں نے بتایا کہ بہت سے لوگوں نے دیوبند سے واپسی کے لیے اسی ریل میں سیٹیں بک کرائی ہوئی ہیں، اور اندیشہ ہے کہ دہلی کے اسٹیشن پر بھی ہجوم ہو جائیگا، اور کچھ بعید نہیں ہے کہ دیوبند کی طرح یہاں بھی لوگ نعرے وغیرہ لگائیں، جو یہاں کے حالات کے پیش نظر مناسب نہیں ہوگا، اور بفضلہ تعالیٰ ان ساتھ سفر کرنے والوں کی بڑی تعداد سے ملاقات ہو ہی چکی ہے، اس لئے اُنہوں نے تجویز پیش کی کہ دہلی کے اسٹیشن سے پہلے ہم شاہدرہ کے اسٹیشن پر ہی اتر جائیں۔ چنانچہ انہوں نے شاہدرہ اسٹیشن پر گاڑیاں منگوالیں، اور ہم دہلی اسٹیشن آنے سے پہلے ہی اتر گئے۔ وہ رات ہمیں ابراہیم صاحب کے والد جناب حاجی محمد ہاشم صاحب کے مکان پر گذارنی تھی جو نئی دہلی کے محلہ نظام الدین میں واقع ہے، اور جدید سہولیات سے آراستہ ہے۔

یہاں پہنچے تو حضرت مولانا مفتی احمد خان پوری صاحب مدظلہم پہلے سے منتظر تھے۔ بمبئی میں اُن سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ یہاں انہیں مجمع الفقہ الاسلامی کے ایک اجلاس میں شرکت کے لیے آنا تھا، اور بمبئی سے ۵ جولائی کو واپس جانے کے بعد انہوں نے یہی پروگرام بنایا تھا کہ دہلی میں ملاقات ہوگی۔ وہ ہمیشہ سے بندے پر بہت مہربان رہے ہیں۔ اُن کی زیارت وملاقات بڑی فرحت کا باعث ہوئی۔

تھوڑی دیر میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب (حفظہ اللہ تعالیٰ) بھی وہیں تشریف لے آئے جو حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد مجمع الفقہ الاسلامی ہند کے روح رواں ہیں۔ انہوں نے مجمع کی طرف سے شائع ہونے والی قیمتی کتابوں اور مقالات کا سیٹ بھی عنایت فرمایا، دیر تک ان حضرات سے استفادہ کا موقع ملا۔ اگرچہ رات کو ہم دیر سے پہنچے تھے، اور صبح بہت سویرے ہوائی اڈے جانا تھا، لیکن میری خواہش تھی کہ مرکز نظام الدین کے اکابر سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہو، لیکن معلوم ہوا کہ حضرت مولانا زبیر صاحب اور حضرت مولانا احمد لاٹ صاحب مدظلہما سفر پر ہیں، اتنی دیر میں حضرت مولانا ابراہیم بودلہ صاحب مدظلہم بہ نفس نفیس تشریف لے آئے۔ آپ ایک معمر بزرگ ہیں، اور بمبئی کے حضرت مولانا شوکت صاحب مدظلہم کے ہم سبق رہے ہیں، اور نظام الدین کے مرکز کے بڑے ذمہ داروں میں سے ہیں، اور اس طرح یہ سعادت بھی حاصل ہوگئی۔ اس کے علاوہ بھی دہلی کے بہت سے علماء کرام اور اعزہ بھی تشریف لائے ہوئے تھے، اُن سب سے ملاقاتیں رات گئے تک جاری رہیں۔ اور اگلے دن صبح سویرے ہم دوبارہ مدراس کے لئے روانہ ہوگئے، اور دہلی اور مدراس کے درمیان ڈھائی گھنٹے کے سفر میں پچھلے دو دن کے واقعات ایک نہ ٹوٹنے والے خواب کی طرح ذہن پر چھائے رہے۔

تامل ناڈو میں

تامل ناڈو کے صوبے میں مدراس کے آس پاس کئی شہر اور قصبے ہیں جن میں مسلمانوں کی بڑی تعداد آباد ہے۔ دیو بند سے واپسی پر ان میں سے کئی مقامات پر جانے کا پروگرام تھا۔

سب سے پہلے ہم میل وشارم گئے جو ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر ہے۔ حاجی ہاشم صاحب جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے، اور جنہیں اپنے اثر ونفوذ کی وجہ سے ہمارے میزبان جناب فاروق صاحب امیر المؤمنین کہتے تھے، اُن کا گھر بھی یہیں ہے، اور انہوں نے یہاں ایک مدرسہ مفتاح العلوم کے نام سے قائم کیا ہوا ہے جس کے مہتمم مولانا ریاض احمد قاسمی صاحب ہیں، اور جو علاقے میں گرانقدر تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے۔ وہاں مغرب کے بعد ایک بڑے اجتماع سے خطاب ہوا، اور وہیں کھانے پر دوسرے علماء کے علاوہ جناب مولانا کلیم صدیقی صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جو بندہ سے ملاقات کے لیے اپنے رفقاء کے ساتھ تشریف لائے۔

مولانا کلیم صدیقی صاحب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب قدس سرہ کے خلیفۂ مجاز ہیں، اور ہندوستان میں ہندوؤں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے بڑی گرانقدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ پر ماشاء اللہ سینکڑوں ہندو مسلمان ہو چکے ہیں، ان میں سے بہت سوں کے اسلام قبول کرنے کے واقعات انہی کے انٹرویو کی شکل میں ایک کتاب میں شائع ہوئے ہیں، جس کا نام ہے "نسیمِ ہدایت کے جھونکے" یہ کتاب تین جلدوں میں ہے اور اس میں قبولِ اسلام اور اس کے نتائج کے بارے میں انتہائی ایمان افروز واقعات سامنے آتے ہیں۔ مولانا کلیم صدیقی صاحب نے اپنے ساتھی کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ یہ وہ صاحب ہیں جو بڑے پر تشدد ہندو تھے، اور بابری مسجد پر سب سے پہلی کدال انہوں نے چلائی تھی، اور آج ماشاء اللہ یہ اسلام کے بہت بڑے داعی بنے ہوئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا کلیم صدیقی صاحب نے دعوت اسلام میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ قابلِ رشک بھی ہیں اور قابلِ تقلید بھی۔ **جزاھم اللہ تعالیٰ خیرا.**

اس کے بعد ہم حاجی فاروق صاحب کے شہر امبور گئے جہاں تین دن قیام رہا۔ یہ شہر چمڑے کے مسلمان تاجروں کا بڑا مستقر ہے جہاں ان کی بہت سی فیکٹریاں ہیں جو چمڑے کی مصنوعات تیار کرتی ہیں، اور ان کو یورپ کے کئی ممالک کی کمپنیوں سے یہ مصنوعات تیار

کرنے کے آرڈر ملتے ہیں۔ یہاں معلوم ہوا کہ اٹلی کے جوتوں کے بہت سے برانڈ جو دنیا بھر میں مشہور ہیں، یہیں پر تیار ہوتے ہیں۔ ان تاجروں میں ماشاء اللہ دین کی فکر بھی ہے، اور وہ بہت سے رفاہی منصوبے چلا رہے ہیں۔ ان کو اپنی تجارت میں بہت سے مسائل درپیش رہتے ہیں جس کے لیے منگل ۱۳؍ جولائی کی صبح انہوں نے ایک بڑے ہال میں تاجروں کا ایک اجتماع رکھا تھا، جس میں خطاب تو مختصر سا ہی ہوا، لیکن اُس کے بعد تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک ان کے مسائل پر سوال وجواب کا سلسلہ رہا۔ یہاں کی تاجروں کی فیڈریشن کے صدر مکہ رفیق احمد صاحب نے یہ اجتماع بڑے منظم طور پر ترتیب دیا تھا، اور اس میں مقامی علماء کرام اور اہل فتویٰ بھی موجود تھے جن میں مفتی صلاح الدین صاحب، مولوی سعادت اللہ قاسمی صاحب اور مولانا اقبال قاسمی صاحب کے نام اس وقت یاد ہیں۔

میں نے یہ بھی واضح کیا کہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مجمع عام میں فقہی مسائل بیان کرنے کو اس لئے پسند نہیں فرمایا کہ بعض اوقات لوگ آدھی، تہائی بات سمجھ کر نہ صرف یہ کہ اُس پر غلط طور سے عمل کرتے ہیں، بلکہ اُسے آگے بھی غلط نقل کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے میں نے اس شرط پر یہ سلسلہ قبول کیا ہے کہ اُسے پوری طرح ریکارڈ کیا جائے، اور عمل کرتے وقت مقامی اہل فتویٰ علماء سے رجوع کیا جائے، اور اگر میری کسی بات سے اُنہیں اختلاف ہو تو اُنہی کی بات پر عمل کیا جائے۔

امبور جس ضلع میں واقع ہے، اُس کا صدر مقام ویلور شہر ہے۔ اُسی شام کو عصر سے پہلے ہم اس شہر میں گئے۔ یہاں ایک قدیم قلعہ بھی اب تک موجود ہے۔ نواب حیدر علی اور سلطان ٹیپو رحمہم اللہ کے زمانے میں جو جنگیں لڑی گئیں، اُن میں یہ ایک اہم دفاعی مرکز رہا تھا۔ سلطان ٹیپو شہید رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کے بعد ان کے اہل خانہ کو اسی قلعے میں رکھا گیا تھا۔ یہاں ہندوستان کا قدیم ترین مدرسہ ''الباقیات الصالحات'' واقع ہے جس کے ناظم مولانا عثمان محی الدین صاحب ہیں۔ وہ کئی مرتبہ امبور آکر وہاں آنے کی دعوت دے چکے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ مدرسہ عملاً تو دار العلوم دیوبند سے بھی کچھ پہلے قائم ہو گیا تھا، لیکن

اس کا باقاعدہ آغاز دارالعلوم دیوبند کے قیام کے چند سال بعد ہوا تھا۔ ہمیں اس قدیم مدرسے میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی، اور عصر کی نماز سے پہلے مہتمم صاحب کی فرمائش پر صحیح بخاری کی ایک حدیث کا درس بھی ہوا۔ یہاں کے بہت سے مدارس میں صحیح بخاری پوری پڑھانے کے بجائے اُس کے منتخب حصے پڑھائے جاتے ہیں۔ اس مدرسے میں بھی ایسا ہی دستور ہے۔ درس کے بعد نماز عصر بھی اُسی کی مسجد میں پڑھی جس کے احاطے میں مدرسے کے بانی کا مزار بھی ہے جس پر سلام عرض کرنے اور ایصال ثواب کی توفیق ہوئی، اور اُس کے بعد نماز مغرب واپس امبور کی مسجد میں آ کر پڑھی۔

ہمارے میزبان حاجی فاروق صاحب حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خاص مداحوں میں سے ہیں۔ اور حضرت مولاناؒ اپنے آخری سفر میں نہ صرف اُن کے مہمان رہے تھے، بلکہ اُن کی وفات کے آخری وقت تک حاجی فاروق صاحب اُن کی خدمت میں مصروف رہے، اور بالآخر اُن ہی کے ہاتھوں میں حضرتؒ نے اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کی۔ حاجی فاروق صاحب نے ماشاء اللہ ایک قابل تعریف کام یہ کیا ہے کہ حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریروں کو مرتب کروا کر ''خطبات احتشام الحق'' کے نام سے شائع کیا ہے، اور اُس کی ترتیب میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے لائق صاحبزادے مولانا تنویر الحق صاحب سلمہ نے بڑی محنت کی ہے۔ اب اُس کی پانچویں جلد شائع ہوئی ہے۔ اُسی روز مغرب کے بعد امبور کی مسجد ہاشم میں اُس کے اجراء کی تقریب تھی جس میں اُنہوں نے اُس کے تقریباً پانچ سو نسخے علماء کرام اور مدارس میں تقسیم کیے، اور اس موقع پر میرا خطاب بھی ہوا۔

اگلے دن ہمیں پرنام بٹ جانا تھا، جو امبور سے تقریباً پینتالیس منٹ کی مسافت پر واقع ہے۔ لیکن پرنام بٹ جاتے ہوئے راستے میں ایک جگہ عمرآباد کہلاتی ہے جہاں مولانا خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب نے جامعہ دارالسلام قائم کیا ہوا ہے۔ مولانا بڑے معتدل مزاج کے اہل حدیث عالم ہیں، ان کا زبردست اصرار تھا کہ اُن کے مدرسے میں حاضری ہو۔ چنانچہ

تعمیل حکم کے لیے وہاں حاضری دی۔ وہاں بھی علماء کا ایک بڑا اجتماع منتظر تھا۔ مولانا نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں جامعہ دارالسلام کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ اس مدرسے کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں قدیم وجدید علوم کو جمع کیا گیا ہے، اور یہ مختلف مسلکوں کے مسلمانوں کے درمیان اتحاد کا داعی ہے، چنانچہ یہاں مختلف مسالک کے طلبہ شیر وشکر ہو کر پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس مدرسے میں غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے کا بھی خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔

میں نے اپنے تقریباً پینتالیس منٹ کے خطاب میں ان قابل تعریف مقاصد کی تائید وتعریف کے ساتھ یہ عرض کیا کہ خاص طور سے پہلے دو مقاصد جتنے اہم ہیں، اُتنے ہی نازک بھی ہیں۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے کن اصولوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے؟ میں نے اختصار کے ساتھ اُن کی وضاحت کی جسے ان حضرات نے کھلے دل کے ساتھ قبول فرمایا، بلکہ بتایا کہ وہ انہی خطوط پر کام کر رہے ہیں۔

اس کے بعد ہم پرنام بٹ روانہ ہوگئے۔ شروع میں اس شہر کو پیارم پیٹ کہتے تھے، اور بعد میں اُس کا نام ''پرنام بٹ'' پڑ گیا۔ ان ناموں سے میں بچپن سے واقف تھا، اس لئے کہ یہاں ایک بڑے عالم اور بزرگ حضرت مولانا محمود حسن صاحب رہا کرتے تھے جنہوں نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اصلاحی تعلق قائم کیا ہوا تھا۔ اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جواب طلب ڈاک میں اُن کا لفافہ اکثر ہم دیکھا کرتے تھے جس پر پیارم پیٹ یا پرنام بٹ کا پتہ لکھا ہوا ہوتا تھا۔ بلکہ میں نے سب سے پہلا مفصل فتویٰ اُنہی کے ایک سوال کے جواب میں لکھا تھا۔ رمضان المبارک میں جماعت تہجد کے جواز یا عدمِ جواز کے سلسلے میں انہوں نے ایک سوال حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھیجا تھا۔ میں اُس سال مشکوۃ شریف پڑھکر چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے اس موضوع پر کتابوں سے حوالے جمع کرنے کا حکم دیا۔ میں نے حوالے جمع کرنے کے ساتھ جواب لکھنے کی بھی کوشش کی، اور بغرض اصلاح حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے معمولی تبدیلیوں کے بعد اُس کو فتوے کے طور پر روانہ فرمایا۔

۱۹۴۶ء میں حضرت والد صاحب قدس سرہ اُنہی کی دعوت پر مدراس تشریف لے گئے تھے، اور پرنام بٹ میں کئی روز قیام فرمایا تھا۔ اب مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے جناب مولانا مفتی سعید احمد صاحب مدظلہم اس علاقے میں مرجع خلائق ہیں، اور لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ اپنی صورت و سیرت دونوں میں اپنے والد ماجد کا نمونہ ہیں۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کہیں جاتے نہیں ہیں، لیکن وہ بندہ سے ملنے کے لیے امبور بھی تشریف لائے تھے، اور خود مجھے بھی وہاں جانے کا شوق تھا۔ سب سے پہلے ہم حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قائم کیے ہوئے مدرسے ’’وصیۃ العلوم‘‘ گئے جہاں طلبہ اور اساتذہ سے خطاب ہوا، اور اُس کے بعد یہاں کے ایک مشہور تاجر سید عبدالوہاب صاحب نے اپنے مکان پر دوپہر کے کھانے اور آرام کا انتظام کیا ہوا تھا۔ مجھے حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وہ گھر دیکھنے کا بھی شوق تھا جس میں میرے والد ماجد قدس سرہ نے قیام فرمایا تھا۔ آج کل اُس میں مفتی سعید احمد صاحب مقیم ہیں۔ انہوں نے مکان کی اوپر کی منزل میں وہ سادہ سا کمرہ بھی دکھایا جس میں حضرت والد صاحبؒ کا قیام رہا تھا۔ مجھے بچپن کی یہ بات یاد ہے کہ جب حضرت والد صاحبؒ مدراس سے واپس تشریف لا رہے تھے تو ہمارے بھائی دیوبند کے اسٹیشن پر اُن کا استقبال کرنے جا رہے تھے، اور مجھے بھی جانے کا شوق تھا، لیکن عین وقت پر کسی وجہ سے میرا ہاتھ جل گیا تھا جس کی وجہ سے میں نہ جا سکا تھا اور اس وجہ سے میرا صدمہ دوگنا ہو گیا تھا۔ پھر جب حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ گھر میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے اُنہوں نے مجھے گود میں اُٹھا کر پیار کیا تھا۔ میری عمر اُس وقت تین سال سے کچھ ہی زیادہ ہوگی، لیکن مجھے وہ منظر آج بھی اس طرح یاد ہے جیسے وہ کل کی بات ہو۔

یہیں ’’پرنام بٹ‘‘ میں جن حضرات سے ملاقات ہوئی، اُن میں جناب حکیم رضی الدین صاحب بھی تھے جنہوں نے بتایا کہ وہ طب یونانی کا ایک ہسپتال چلا رہے ہیں، اور

ہندوستان میں ایسے چالیس ہسپتال ملک کے مختلف حصوں میں قائم ہیں، اور اُن کے ساتھ ملحق طبیہ کالج بھی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان میں طب یونانی کے فروغ کے لیے اچھا کام ہو رہا ہے، اور اُس کے ذریعے باشندوں کا سادہ علاج زرمبادلہ خرچ کیے بغیر آسان دیسی دواؤں کے ذریعے ہو جاتا ہے۔

مغرب کے بعد یہاں کی چوک مسجد میں ایک بڑا عوامی اجتماع تھا جہاں عمومی انداز کا خطاب ہوا، اور عشاء اور عشائیہ کے بعد وہاں سے امبور میں اپنی قیام گاہ پر واپسی ہوئی۔

جمعرات ۱۵ر جولائی کو صبح دس بجے سے علاقے کے سب سے بڑے مدرسے رفیق العلوم میں حاضری ہوئی۔ یہ مدرسہ ایک وسیع جگہ پر رہائشی سہولیات کے ساتھ قائم ہے، اور اُس کے مہتمم حضرت مولانا مفتی سبیل صاحب مدظلہم ہیں۔ انہوں نے آج یہاں علماء کرام کا ایک بڑا اجتماع رکھا تھا اور اس میں شرکت کے لیے علماء کی ایک بڑی تعداد دور دور سے آئی ہوئی تھی۔ یہاں علماء اور مدارس کی ذمہ داریوں پر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے خطاب ہوا۔

امبور سے تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت پر ایک شہر وانم باڑی کہلاتا ہے۔ حیدر علیؒ اور سلطان ٹیپو کے انگریزوں اور مرہٹوں سے جو معرکے ہوئے ہیں، اُن میں اس شہر کو جنگی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس شہر میں اب بھی مسلمانوں کی اکثریت ہے، اور یہ علاقہ شروع سے پاکستان کی حمایت کے لیے مشہور ہے۔ چنانچہ یہاں ایک روڈ کا نام اب بھی محمد علی جناح روڈ، ایک کا علامہ اقبال روڈ اور ایک کا محمد علی جوہر روڈ ہے۔ جمعرات ہی کی شام کو مغرب سے پہلے ہم یہاں کے قدیم مدرسے معدن العلوم گئے، اور مغرب کے بعد دوسرے بڑے مدرسے احیاء العلوم میں خطاب ہوا۔ یہاں کے علماء نے بتایا تھا کہ اس شہر میں بعض ایسے حلقے ہیں جو قرآن کریم کو محض ترجمے کی بنیاد پر مفسرین سے بالکل بے نیاز ہو کر پڑھنے اور سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں، اور اُس کے نتیجے میں اسلاف کی تفسیروں کو بے فائدہ قرار دیکر خود اپنی سوچ سے شریعت کے احکام میں تحریف کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس لئے یہاں قرآن فہمی کے اصولوں کے موضوع پر بحمد اللہ مفصل خطاب ہوا۔

کرناٹک میں

اگلے دن جمعہ تھا، اور حاجی فاروق صاحب نے اصل پروگرام میں یہ طے کیا ہوا تھا کہ جمعہ امبور کی مسجد میں پڑھا جائے، اور پھر شام کو بنگلور روانہ ہو کر دو دن بنگلور میں قیام رہے۔ لیکن میری خواہش تھی کہ بنگلور کے پروگرام میں ایک دن کا اضافہ کر کے سلطان ٹیپو شہید رحمۃ اللہ علیہ کے شہر سرنگا پٹم میں بھی حاضری ہو جائے۔ اس لئے پروگرام میں تبدیلی کر کے ہم وانم باڑی سے عشاء کے بعد بذریعہ کار بنگلور کے لیے روانہ ہو گئے، اور دو گھنٹے کے سفر کے بعد بارہ بجے رات بنگلور شہر میں داخل ہوئے۔ ہمارے میزبان جناب حاجی فاروق صاحب کا یہاں بھی ایک خوبصورت مکان ہے جس میں ہمارا قیام ہوا۔

جمعہ ۱۶؍ جولائی کا دن ہم نے بنگلور میں اس لئے بڑھایا تھا کہ اس میں سلطان ٹیپو شہید رحمۃ اللہ علیہ کے شہر سری رنگا پٹنم میں حاضری دیں۔ چونکہ اس پروگرام کا چند احباب کے سوا کسی کو علم نہیں تھا، اس لئے خیال یہ تھا کہ یہ ایک دن کا دورہ خاموشی سے کر کے واپس آجائیں۔ البتہ چونکہ فاصلہ کافی زیادہ تھا، اور جمعہ وہیں ہونا تھا، اور مجھے دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ آرام کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے بنگلور کے مولانا شبیر صاحب نے بتایا کہ وہاں ایک ادارہ دار الامور کے نام سے قائم ہے، اُسی میں دوپہر کے کھانے اور آرام کا انتظام کر دیا گیا ہے، اور انہیں تاکید کر دی گئی ہے کہ اس دورے کو شہرت نہ دیں، تاکہ ہجوم نہ ہو۔ چنانچہ ہم صبح ساڑھے نو بجے کے قریب روانہ ہوئے، اور تقریباً دو ڈھائی گھنٹے کا سفر کار سے طے کیا۔ یہ پورا راستہ سرسبز و شاداب اور دلفریب وادیوں سے گذرتا تھا جو قلب و نظر کو تازگی بخشتی رہیں، اور ساتھ ہی ان وادیوں میں حیدر علیؒ اور سلطان ٹیپوؒ کی تگ و تاز کا تصور بندھا رہا۔

سلطان ٹیپو کے شہر میں

سلطان ٹیپو کے شہر کا نام سرنگا پٹم ہے۔ یہی نام ہم نے تاریخوں میں پڑھا تھا۔ لیکن

یہاں اُس کو سری رنگا پٹنم کہا جاتا ہے، اور بعض جدید تاریخوں میں بھی نام اسی طرح درج ہے۔ ہم یہاں پہنچے تو جمعہ کا وقت قریب تھا۔ دارالامور پہنچ کر نماز کی تیاری کا خیال تھا، اور اگرچہ اس سفر کی شہرت نہ کرنے کی تاکید کر دی گئی تھی، لیکن جب دارالامور پہنچے تو اچھا خاصا ہجوم جمع تھا، اور معلوم ہوا کہ یہ حضرات کسی طرح خبر پا کر شہر میسور سے یہاں پہنچ گئے ہیں۔ وضو کر کے ہم اُس مسجد میں پہنچے جو مسجد اقصیٰ کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں کے امام صاحب نے فرمائش کی کہ جمعہ سے پہلے میں خطاب کروں، اور جمعہ بھی میں ہی پڑھاؤں، چنانچہ جمعہ سے پہلے کچھ دیر وہاں خطاب ہوا جس میں میں نے عرض کیا کہ سلطان ٹیپو رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی سے ہمیں یہ سبق لینا چاہئے کہ جو کام اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اخلاص سے انجام دیا جائے، اُسے کبھی ناکام نہیں کہا جا سکتا۔ سلطان ٹیپو رحمۃ اللہ علیہ نے اخلاص کے ساتھ دین کی سربلندی اور سلطنت خداداد کے دفاع کے لیے اپنی جان کی بازی لگائی، اور اگر غداروں کی غداری نہ ہوتی تو وہ ہندوستان سے انگریزوں کو مار بھگانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ غداری کے نتیجے میں وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے، لیکن اُن کی زندگی اللہ تعالیٰ کے یہاں کامیاب ہے۔ دوسری طرف جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اُس کے نیک بندوں سے غداری کر کے اُس کے دشمنوں سے پیمان وفا باندھتے ہیں، ان کا برا انجام بسا اوقات دنیا ہی میں دکھا دیا جاتا ہے، اور میر صادق کی غداری کا انجام اُس کی عبرتناک مثال ہے کہ جس سلطان ٹیپوؒ کے خلاف اُس نے سازشوں کا جال بُنا تھا، وہ تو بعد میں شہادت کے مقام تک پہنچے، میر صادق اُن سے پہلے ہی قتل ہو کر کیفر کردار کو اس طرح پہنچے کہ اُن کی لاش بھی اُٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ تقریر کے بعد خطبہ اور جمعہ کی نماز بھی اسی مسجد میں پڑھانے کی سعادت ملی۔

نماز کے بعد سلطان حیدر علی اور سلطان ٹیپو رحمہما اللہ تعالیٰ کے مزارات پر حاضری کے وقت جذبات کی عجیب کیفیت تھی۔ اللہ تعالیٰ اُن کے درجات میں پیہم ترقی عطا فرمائیں کہ انہوں نے اس آخری دور میں عادل مسلمان سلاطین کا ایک نمونہ دکھایا، اور ٹیپو رحمہ اللہ تعالیٰ

نے ایک مثالی اسلامی حکومت کا نقشہ پیش کیا۔ اُنہوں نے ایسے وقت اقتدار سنبھالا تھا جب انگریز کی سامراجی طاقت ایک ایک کر کے ہندوستان کے مختلف خطوں پر قبضہ کرتی جا رہی تھی، ٹیپو نے اپنے لڑکپن سے انگریزوں اور مرہٹوں کے ساتھ جنگ کی فضا میں سانس لئے تھے، اور اپنے والد کی وفات کے بعد جنگ ہی کی حالت میں سلطنت سنبھالی تھی۔ اس کے باوجود اُس نے میسور کی سلطنت خداداد کو ایک جدید اور ترقی یافتہ ریاست بنانے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ ملک میں تعلیم و تربیت کا اعلیٰ نظام نافذ کیا، بہت سی کتابیں لکھوائیں، طرح طرح کی صنعتیں قائم کیں، مضبوط بحری بیڑہ تیار کیا، ٹائپ کا پریس قائم کیا، اردو کا اخبار جاری کیا، آب پاشی کا بہترین نظام بنایا، مجرموں کو سزا دینے کے ایسے طریقے ایجاد کئے جن سے ملک کی ترقی میں مدد ملے، ملک میں مطلق العنان بادشاہت کے بجائے اسلامی شورائیت کی بنیاد ڈالی، اور مجلس شوریٰ قائم کی، ملک میں پھیلی ہوئی بے راہ روی اور جاہلانہ رسموں کو مٹایا، اسلامی شریعت کے احکام نافذ کئے، لوگوں میں انگریزوں کی جارحیت کے خلاف جہاد کا جذبہ پیدا کیا، اور اس کے لئے نت نئے ہتھیار بنائے، اور مشہور یہ ہے کہ راکٹ بھی اُسی نے ایجاد کئے، پھر انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے بین الاقوامی رابطے بڑھائے، اور اس غرض کے لیے سفارتیں بھیجیں، غرض ہر جہت سے اُس نے اس آخری زمانے میں ایک صحیح اسلامی ریاست کا نمونہ دکھا دیا۔

چونکہ متعدد معرکوں میں اُس نے انگریز کے دانت کھٹے کئے تھے، اس لئے انگریز جانتا تھا کہ وہ براہ راست مقابلوں میں ٹیپو کو زیر نہیں کر سکتا، اس لئے آخر کار اُس نے آس پاس کے نوابوں اور اندرونی غداروں کی شکل میں ایسے لوگ تلاش کئے جو پشت سے اُس کے عزائم میں خنجر گھونپ سکیں، یہاں تک کہ اس غداری کے نتیجے میں جب انگریزوں کی فوجیں اُس کے شہر میں داخل ہو گئیں تو کچھ لوگوں نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ اگر ہتھیار پھینک دے تو انگریز اُسے باعزت طریقے پر زندہ رہنے کا موقع دیں گے۔ اس پر اُس نے وہ تاریخی جملہ کہا تھا کہ: ”شیر کی زندگی کا ایک دن گیدڑ کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہے“۔ بالآخر اُس نے حق کی

خاطر اپنی جان کی وہ قربانی پیش کی جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گی:

اقبال مرحوم نے اُنہی کے بارے میں کہا تھا:

آں شہیدانِ محبت را امام   آبروئے ہند وچین وروم وشام
نامش از خورشید ومہ تابندہ تر   خاک قبرش از من وتو زندہ تر
عشق رازے بود بر صحرا نہاد   تو نہ دانی جاں چہ مشتاقانہ داد
از نگاہ خواجۂ بدرو حنین   فقر سلطاں وارثِ جذب حسین
رفت سلطاں زیں سرائے ہفت روز   نوبت او دردکن باقی ہنوز

مزار ہی کے قریب ایک میوزیم بنایا گیا ہے جس میں سلطان شہید رحمۃ اللہ علیہ کی بہت سی یادگاریں محفوظ رکھی گئی ہیں۔ ان میں وہ قبا بھی ہے جو آخری وقت میں سلطانؒ نے زیب تن فرمائی ہوئی تھی، اور اُس پر خون کے دھبے ابھی تک موجود ہیں:

بنا کردند خوش رسمے بہ خون وخاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

یہاں سے ہم دوبارہ دارالامور کی طرف گئے۔ دارالامور درحقیقت سلطان ٹیپو رحمہ اللہ تعالیٰ ہی کا ایک تصور تھا۔ اُن کے ذہن میں ایک ایسی یونیورسٹی کی تجویز تھی جس میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کے علوم کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہو۔ اور بعض تاریخوں میں مذکور ہے کہ انہوں نے جامع الامور کے نام سے یہ یونیورسٹی قائم بھی کردی تھی۔ اب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تجویز اور ایماء پر یہ ادارہ اُسی نام سے قائم کیا گیا ہے جس میں درجن بھر طلبہ جو دورۂ حدیث سے فارغ التحصیل ہیں، عصری علوم کی تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ جناب عبدالرحمٰن قمرالدین صاحب اُس کے ناظم ہیں، اور انہوں نے بڑی محبت سے ہمارا استقبال کیا تھا۔ جب ہم جمعہ کے بعد یہاں پہنچے تو اُس وقت تک دارالامور کی عمارت علماء، طلبہ اور عام مسلمانوں سے بھر چکی تھی۔ یہ حضرات میسور شہر سے ہماری آمد کی خبر سُن کر یہاں جمع ہوگئے تھے۔ یہاں سری رنگا پٹنم اور میسور کے متعدد معززین سے بھی ملاقات

ہوئی۔ ان میں جناب پروفیسر بی علی شیخ صاحب بطور خاص قابل ذکر ہیں جو مینگلور یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں، بہت سی مشہور اردو اور انگریزی کتابوں کے مصنف ہیں، انہوں نے سلطان ٹیپوؒ کی تاریخ پر خصوصی طور سے تحقیقی کام کیا ہے، اور آج کل یہاں سے نکلنے والے اردو اخبار ''سالار'' کے ایڈیٹر ہیں۔ انہوں نے اپنی کتابوں کا ایک سیٹ بھی مجھے عطا فرمایا، اور اپنے اخبار ''سالار'' میں ہمارے سری رنگا پٹنم کے دورے کی تفصیلات شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کیں۔

عصر کے بعد ہم سلطان ٹیپو رحمۃ اللہ علیہ کی تعمیر کی ہوئی تاریخی مسجد ''مسجد اعلیٰ'' دیکھنے کے لیے گئے۔ یہ بڑی پُرشکوہ اور نہایت مضبوط بنی ہوئی مسجد ہے جس کے مینار دور سے نظر آتے ہیں۔ عمارت کے دو حصے ہیں۔ نیچے والے حصے میں وضو خانہ وغیرہ ہے، اور اوپر کے حصے میں مسجد ہے جس تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں ہیں۔ مسجد کی محراب میں کتبہ ہے جس میں تعمیر کی تاریخ ۱۲۰۲ھ فارسی اشعار میں لکھی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک دیوار پر ایک کتبہ ہے جس میں سورۂ احزاب کی وہ آیت لکھی ہوئی ہے جو بنو قریظہ کے محاصرے کے بارے میں نازل ہوئی تھی:

''وَاَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِنْ اَهْلِ الْکِتَابِ مِنْ صَیَاصِیْهِمْ وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِیْقًا، وَاَوْرَثَکُمْ اَرْضَهُمْ وَدِیَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا وَکَانَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا.''

اور شمالی دیوار پر ایک کتبہ ہے جس میں وہ حدیث مبارک لکھی ہوئی ہے جو قریش کی فضیلت کے بارے میں ارشاد فرمائی گئی تھی:

''الناس تبع لقریش فی هذاالشان. مسلمهم تبع

لمسلمهم و كافرهم تبع لكافرهم. متفق عليه"

یعنی "اس (حکومت) کے معاملے میں لوگ قریش کے تابع ہیں۔ اُن میں سے جو مسلمان ہیں، وہ قریش کے مسلمانوں کے تابع ہیں، اور ان میں سے جو کافر ہیں، وہ قریش کے کافروں کے تابع ہیں۔"

بعض تواریخ میں مذکور ہے کہ جب یہ مسجد تیار ہوئی تو یہ طے کیا گیا تھا کہ اس میں پہلی نماز کی امامت کوئی ایسا شخص کرے گا جو صاحب ترتیب ہو، یعنی اُس کے ذمے کوئی نماز قضا نہ ہو۔ مسجد کے افتتاح کے وقت بہت سے علماء اور صلحاء موجود تھے، لیکن کوئی اپنے بارے میں یقین سے یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کہ وہ صاحب ترتیب ہے۔ آخر کار خود سلطان ٹیپوؒ نے بتایا کہ وہ صاحب ترتیب ہیں، اور پھر انہوں نے ہی نماز پڑھائی۔ اس کے بعد سلطان مرحوم پانچوں وقت کی نمازیں اسی مسجد میں پڑھا کرتے تھے، اور شہادت کے دن بھی فجر کی نماز انہوں نے یہیں ادا کی تھی۔ محل سے مسجد میں آنے کے لئے وہ عام راستے سے آنا اس لئے پسند نہیں کرتے تھے کہ اُن کے آنے سے صفوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی عبادت میں خلل اندازی نہ ہو، چنانچہ وہ دیوار قبلہ کے قریب شمالی دیوار کے ایک دروازے سے داخل ہوتے تھے جو اَب بند کر دیا گیا ہے۔

مسجد کے صحن میں ایک دھوپ گھڑی بھی نصب ہے جس سے نمازوں کے اوقات کا تعین کیا جاتا تھا۔ صحن میں کھڑے ہو کر سری رنگا پٹنم کے قلعے کی کچھ دیواریں بھی نظر آتی ہیں۔ مسجد کے مشرق میں ایک چھوٹی سی سڑک ہے جس پر تقریباً ایک ڈیڑھ کلومیٹر چلیں تو دائیں جانب ایک احاطہ سا بنا ہوا ہے جس میں ایک کتبہ لگا ہے، اور اُس پر انگریزی میں لکھا ہے کہ سلطان ٹیپوؒ کی لاش یہاں پائی گئی تھی، گویا یہ جگہ ان کا مقامِ شہادت ہے۔ **رحمه الله تعالىٰ رحمة واسعة.**

بنگلور میں

سری رنگا پٹنم سے ہم عصر کے بعد روانہ ہوئے، اور راستے میں شہر کی ایک خوبصورت مسجد میں موسلا دھار بارش کے درمیان نماز مغرب پڑھی، اور پھر رات نو بجے کے قریب بنگلور میں اپنی قیام گاہ پر پہنچے۔ بنگلور کسی زمانے میں نواب حیدر علی اور سلطان ٹیپو کی سلطنت خداداد میسور کا حصہ تھا، اور اب ریاست کرناٹک کا صدر مقام ہے، اور نہایت سرسبز و شاداب ہونے کی وجہ سے ''شہر گلستان'' کہلاتا ہے۔ قدرے بلندی پر ہونے کی بنا پر یہاں کا موسم بھی عام طور سے بڑا خوشگوار اور خنک ہوتا ہے، اور اپنے تین روزہ قیام میں جب ہم فجر کے بعد کسی جھیل کے کنارے یا کسی پارک میں چہل قدمی کا معمول پورا کرتے تو انتہائی نشاط انگیز ہوا کے لطیف جھونکوں سے جسم نہال ہو جاتا۔ تمدنی اعتبار سے بھی یہ ہندوستان کے چند اُن بڑے شہروں میں سے ہے جو تیز رفتاری سے ترقی کر رہے ہیں۔ خاص طور پر انفارمیشن ٹیکنالوجی میں یہ شہر بہت مشہور ہے، اور تامل ناڈو سے بنگلور آتے ہوئے ہمیں سب سے پہلے الیکٹرونک سٹی کی نظر فریب عمارتیں ہی نظر آئی تھیں۔ پھر ہم بارہ کیلومیٹر لمبے فلائی اوور کو طے کر کے شہر کے وسطی حصے میں داخل ہوئے تھے۔ شہر کی آبادی ایک کروڑ کے لگ بھگ ہے، اور ان میں مسلمانوں کی تعداد پچیس لاکھ کے قریب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ضلع بنگلور میں تقریبا نو سو مسجدیں ہیں جن میں سے اکثر بڑی خوش ذوقی سے بنائی گئی ہیں۔ یہاں تجارت کے علاوہ سرکاری ملازمتوں میں بھی مسلمانوں کا حصہ قابل لحاظ ہے، اور کئی مسلمان اعلیٰ افسران سے یہاں ملاقات ہوئی جن میں ڈاکٹر نثار احمد صاحب ایڈیشنل کمشنر پولیس اور ثناء اللہ صاحب انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس بطور خاص قابل ذکر ہیں جنہوں نے ہمارے قیام کے دوران ہر طرح کی راحت کا انتظام کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائیں۔ آمین۔

بنگلور آ کر دیکھا تو یہاں کے اردو اخبارات ہمارے دورے کی تفصیلات سے بھرے ہوئے تھے۔ بعض اخبارات نے پہلے صفحے پر خیر مقدمی جملوں پر مشتمل پٹیاں لگائی تھیں۔ بعض نے تعارفی کالم لکھے تھے، اور آئندہ دو دن کا پروگرام تو سبھی اخبارات نے شائع کیا

تھا۔

ہفتہ ۱۷ر جولائی کو صبح دس بجے یہاں کے ایک دینی مدرسے دار العلوم شاہ ولی اللہ میں علماء کا ایک خصوصی اجتماع تھا۔ یہاں نہ صرف صوبہ کرناٹک، بلکہ آندھرا پردیش، مہاراشٹر اور بعض دوسرے صوبوں کے بھی علماء تشریف لائے ہوئے تھے، اور پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مدرسے کے مہتمم مولانا زین العابدین صاحب نے بڑی محبت سے استقبال کیا، اور اپنی تعارفی تقریر میں سپاس نامہ پیش کرتے ہوئے فرطِ جذبات سے آبدیدہ ہوگئے۔ الکلیۃ السعودیۃ کے مہتمم مولانا محمد عتیق الرحمٰن صاحب ایک خوشگو شاعر بھی ہیں، انہوں نے ٹھیٹھ ہندوستانی زبان میں ’’مفتی تقی جی‘‘ کے عنوان سے ایک نظم پڑھکر بہت داد وصول کی۔ اگر وہ میری مبالغہ آمیز تعریف پر مشتمل نہ ہوتی تو اپنی زبان کی گھلاوٹ اور تلمیحات کی لطافت کی وجہ سے میں اُسے یہاں نقل کرتا۔

اس کے بعد میں نے تقریباً ایک گھنٹہ کچھ گذارشات پیش کیں، اور اپنے اس تأثر کا اظہار کیا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہندوستان کے جن علاقوں میں میرا جانا ہوا، وہاں مسلمانوں کو اپنے دین کے تحفظ میں سرگرم پایا، اور اس میں یہاں کے علماء کرام کا جو قابل قدر کردار نظر آیا، وہ ہر لحاظ سے حوصلہ افزا ہے۔ اُسی کے ساتھ جن پہلوؤں پر ہمیں زیادہ اہمیت کے ساتھ توجہ دینے کی ضرورت ہے، اُن میں اسلام کی معاشرتی اور اخلاقی تعلیمات خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ میں نے یہ بھی عرض کیا کہ مغربی تہذیب نے آزادیٔ نسواں کے نام سے جو فریب دیا ہے، اُس کی تردید تو بفضلہٖ تعالیٰ ہماری طرف سے کافی حد تک ہوئی ہے، لیکن اس موضوع کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اسلام نے خواتین کو جو حقوق عطا فرمائے ہیں، ان میں سے بہت سے ہمارے معاشرے میں پامال ہوتے ہیں، مثلاً شریعت کے مطابق اُنہیں میراث دینے کا رواج بہت کم ہے، نیز شادی بیاہ میں سماجی رواجات کو شریعت کے احکام پر فوقیت دی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کے حقوق پامال ہوتے ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے اسی ضرورت کے پیش نظر نکاح بیوگان کی تحریک چلائی جبکہ کسی بیوہ کے نکاح

کرنے کو معاشرے میں بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح جو غلط رواجات معاشرے میں پھیلے ہوئے ہیں، ان کے آگے ہتھیار ڈالنے کے بجائے اہل علم کو اُن کی اصلاح پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

بنگلور کا سب سے بڑا اور قدیم مدرسہ دار العلوم سبیل الرشاد ہے جس کے مہتمم حضرت مولانا مفتی اشرف علی صاحب مدظلہم ہیں۔ وہ مدراس میں بھی تشریف لاکر ملے تھے، اور اپنے مدرسے میں آنے کی دعوت دی تھی۔ مدرسہ شاہ ولی اللہ میں دوپہر کے کھانے کے بعد ہم دار العلوم سبیل الرشاد گئے جس کا طول وعرض، اس کی خوبصورت عمارتیں، عمدہ کتب خانہ اور حسن انتظام دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ یہاں بھی طلبہ اور اساتذہ سے مختصر خطاب ہوا۔

مولانا شبیر صاحب دار العلوم ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل ہیں، اور ہر وقت سائے کی طرح ساتھ تھے۔ انہوں نے ایک اقامتی مدرسہ اصلاح البنات کے نام سے قائم کیا ہوا ہے جس میں خواتین کو ایک دو سالہ تعلیمی اور تربیتی کورس سے گذارا جاتا ہے، اور معلوم ہوا ہے کہ بڑا مفید ثابت ہو رہا ہے۔ عصر کے بعد اس مدرسے میں بھی حاضری ہوئی، اور خواتین سے خطاب ہوا۔ مغرب کی نماز وہیں ادا کی گئی۔

مغرب کے بعد بنگلور کے ایک آڈیٹوریم امیٹھگر بھون میں جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے ایک خصوصی اجتماع رکھا گیا تھا جس میں وکلاء، ماہرین معاشیات، سرکاری افسران اور یونیورسٹی کے پروفیسر صاحبان کو مدعو کیا گیا تھا۔ مغرب سے عشاء تک یہاں اردو میں خطاب ہوا جس میں میں نے اس آیت کریمہ کی تشریح پیش کی جس میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الْکِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَا اَرَاکَ اللّٰہُ وَلَا تَکُنْ لِلْخَائِنِیْنَ خَصِیْمًا.

(سورۃ النساء: ۱۰۵)

میں نے عرض کیا کہ اس آیت کریمہ میں لیجسلیچر، عدلیہ اور وکلاء تینوں کے لئے بڑی

جامع ہدایات موجود ہیں۔ پھر میں نے اس سوال کا جواب بھی دیا کہ بدلتی ہوئی زندگی میں چودہ سو سال پُرانی ہدایات وتعلیمات کس طرح کارآمد ہوسکتی ہیں؟

اگلے دن اتوار ۱۸؍ جولائی کو مدرسہ مسیح العلوم میں دستار بندی کا جلسہ تھا۔ یہ مدرسہ شہر سے باہر واقع ہے، اور اُس کے مہتمم حضرت مولانا مفتی شعیب اللہ صاحب مدظلہم میرے شیخ حضرت مولانا مسیح اللہ صاحب جلال آبادی قدس سرہ سے بیعت ہیں، اور حضرتؒ ہی کے نام پر مدرسے کا نام مسیح العلوم رکھا گیا ہے۔ یہاں پہنچ کر دیکھا تو ایک زبردست مجمع بڑے جوش وخروش کے ساتھ منتظر تھا۔ تلاوت کے بعد یہاں کے ایک طالب علم نے میری دعائیہ نظم ”دربار میں حاضر ہے اک بندۂ آوارہ“ بڑے پُرسوز ترنم کے ساتھ سُنائی، اور مولانا شبیر صاحب نے بتایا کہ یہ نظم یہاں کے مدارس میں بچے بچے کی زبان پر ہے۔ پھر ابتدائی کارروائیوں کے بعد تقریباً سوا گھنٹے میرا خطاب ہوا۔

۱۸؍ جولائی بنگلور میں ہمارا آخری دن تھا۔ اور اُس دن مغرب کے بعد یہاں کی سب سے بڑی مسجد قادریہ میں عام اصلاحی خطاب طے کیا گیا تھا۔ یہ مسجد بڑی عالیشان اور وسیع وعریض مسجد ہے جس کا خوبصورت ہال بھی بہت بڑا ہے، اس کے علاوہ اُس کے تین طرف کشادہ میدان بھی ہیں۔ ہم مغرب کے وقت وہاں پہنچے تو مسجد کی بیرونی سڑک پر ٹریفک جام تھا۔ کسی طرح بغلی راستے سے مسجد میں پہنچے تو مسجد کے اندر اور باہر ایسا لگتا تھا جیسے انسانوں کا سمندر اُمڈ پڑا ہے۔ نماز مغرب پڑھانے کے لیے مجھ سے فرمائش کی گئی، اور کافی دیر تک منتظمین مجمع کو قابو کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ جتنے انسان مسجد میں تھے، اُس سے بھی زیادہ باہر کے میدانوں میں کھڑے تھے، اور اچھی خاصی بارش کے باوجود وہیں جمے رہے۔ اسی حالت میں میری اس دورے کی آخری تقریر ہوئی۔ اور عشاء کی نماز کے بعد وہاں سے اس طرح واپسی ہوئی کہ ہمارے رفقاء تتر بتر ہو چکے تھے، چونکہ میرے جوتے انہی میں سے کسی کے پاس تھے، اس لئے مجھے ننگے پاؤں گاڑی میں بیٹھنا پڑا۔

یہ سب تو رسمی اجتماعات تھے۔ لیکن ان اجتماعات کے علاوہ بنگلور کے قیام میں ایسا لگتا تھا

کہ ہر لمحے ہندوستان کے دور دراز حصوں سے علماء کرام کے قافلے بنگلور پہنچ رہے ہیں۔ سب سے زیادہ علماء گجرات اور حیدر آباد دکن سے گاڑیاں بھر بھر کر تشریف لائے تھے، ان میں سے بعض نے کئی کئی دن کے سفر کی مشقت اُٹھائی تھی۔ اس کے علاوہ اُڑیسہ اور بہار سے، اور کچھ حضرات کشمیر سے بھی ریل یا ہوائی جہاز کے ذریعے پہنچے۔ لہٰذا رسمی اجتماعات کے آگے پیچھے اور قیام گاہ پر ان حضرات سے ملاقاتوں اور تعارف کا سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا، اور اُس رات بھی ایک بجے کے بعد سونے کی نوبت آئی۔

پیر ۱۹؍ جولائی کی صبح اول وقت نماز فجر پڑھکر پانچ بجے ہم ہوائی اڈے کے لیے روانہ ہوگئے، سات بجے جہاز تھا جو تقریباً نو بجے بمبئی پہنچا۔ یہاں حضرت مولانا سجاد صاحب اپنے رفقاء کے ساتھ موجود تھے۔ آصف صاحب جن کے گھر پر آتے ہوئے قیام ہوا تھا، دیوبند پہنچ گئے تھے، اور دیوبند سے لیکر بنگلور اور اب بمبئی تک مسلسل سفر میں ساتھ رہے۔ ہمیں ڈیڑھ بجے دوپہر بمبئی سے کراچی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ انہوں نے تجویز کیا کہ مقامی اور بین الاقوامی ائیر پورٹ کے درمیان ایک جگہ پر جناب منصور مہتہ صاحب کا ہوٹل ہے جو بڑے علم دوست مسلمان ہیں، یہ وقت اُن کے ہوٹل میں گذار لیا جائے تو ان کو بھی خوشی ہوگی، اور روانگی سے پہلے کچھ آرام بھی مل جائیگا۔ چنانچہ یہی طے کیا گیا۔

غلام رسول صاحب جنہوں نے بمبئی آمد کے وقت تمام قانونی کارروائیاں کروائی تھیں، اس بار بھی ائیر پورٹ پر منتظر تھے، انہوں نے ہم سے پاسپورٹ اور ویزا کے کاغذات لے لئے، مختصر وقت میں ان کاغذات پر کارروائی کے لیے انہیں بہت دور جانا تھا، اور ٹریفک کے ہجوم کا وقت تھا، اس لئے انہوں نے کار کے بجائے موٹر سائیکل پر جانے کو ترجیح دی، اور پولیس آفس روانہ ہوگئے، اور ہم ہوٹل پہنچ گئے۔ یہ سوبا ہوٹل تھا جو پانچ ستارے والے ہوٹل کی سہولیات کا حامل تھا، لیکن چونکہ اس کے مالک نے اس میں شراب کی فراہمی اور دوسرے ناجائز امور سے پرہیز کیا ہوا ہے، اس لئے اُس کو رسمی طور پر پانچ ستاروں کا مرتبہ نہیں ملا۔ اُس کے مالک مہتہ صاحب ماشاء اللہ بڑے نیک اور خوش اخلاق نوجوان ہیں جو

بڑی محبت سے ملے، اور ہمارے لئے دو کمرے خالی کرا دیئے، اس طرح ہم نے بارہ بجے تک یہاں آرام بھی کیا، اور کچھ ملاقاتیں بھی۔ اتنے میں غلام رسول صاحب اپنی مہم پوری کرکے آ چکے تھے۔ بارہ بجے ہم ائیر پورٹ کے لیے روانہ ہوگئے۔ یہاں بھی ڈابھیل اور گجرات کے مختلف مقامات سے آئے ہوئے کچھ حضرات جمع تھے۔ ان سے فرداً فرداً ملاقات بھی ہوئی، اور بفضلہٖ تعالیٰ اجتماعی دعا پر ان سب کو الوداع کہا۔ پی آئی اے کا طیارہ تھا جو براہ راست کراچی جا رہا تھا، اس لئے جو سفر ہم نے آتے ہوئے دس گھنٹے میں طے کیا تھا، بحمد اللہ وہ پونے دو گھنٹے میں طے ہوگیا، اور ہم عصر سے پہلے اپنے گھر پہنچ چکے تھے۔ وللّٰہ الحمد اولا و آخرا۔

تأثرات

مجھے اگرچہ سفر بہت پیش آتے ہیں، لیکن میں عموماً حرمین شریفین کے علاوہ کسی ایک ملک میں ایک ہفتے سے زیادہ نہیں رہتا۔ ہندوستان کے لیے میں نے دو ہفتے مشکل سے نکالے تھے، لیکن یہ دو ہفتے ایسا معلوم ہوا کہ پلک جھپکتے گذر گئے، اور انہوں نے دل و دماغ پر ایسے گہرے نقوش چھوڑے ہیں کہ انہیں بھلانا مشکل ہے۔ یوں تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور بزرگوں کی دعاؤں سے جہاں کہیں جانا ہوتا ہے، ہر جگہ محبت اور عزت ملتی ہے، لیکن اس سفر کے دوران اپنے مسلمان بھائیوں سے عموماً اور علماء کرام سے خصوصاً جو محبت ملی، وہ غیر معمولی تھی، اس بات کا اندازہ تو سالہا سال سے ہندوستان سے مسلسل آنے والے خطوط اور پیغامات سے مجھے پہلے بھی تھا کہ وہاں ہمارے محبت کرنے والے بیشمار ہیں، اور شاید دوسری ہر جگہ سے زیادہ ہیں، لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان کے تعلق خاطر کے لیے محبت کا لفظ بھی ناکافی ہوگا۔ وہ محبت نہیں، ایک والہانہ وارفتگی تھی جس کا مشاہدہ قدم قدم پر ہوا۔ میں یقیناً اس والہانہ محبت کا مستحق نہیں تھا، لیکن یہ ان کا حسن ظن تھا جسے میں اپنے لئے فال نیک ضرور سمجھتا ہوں، اور یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھ میں ان پُرخلوص حضرات کی برکت سے اس کی اہلیت بھی پیدا فرمادیں۔ آمین۔

ہندوستان کے بیشتر اردو اخبارات نے ہمارے دیوبند اور بنگلور کے دوروں اور وہاں کے جلسوں کی خبریں شہ سُرخیوں کے ساتھ شائع کی تھیں، اور متعدد حضرات نے اُس پر کالم لکھے تھے، کئی اخبارات میں مختلف لوگوں نے تعارفی مضامین شائع کئے تھے، جن میں اس ناچیز بندے کے ساتھ غیر معمولی محبت اور مبالغہ آمیز تعریفوں کا اظہار فرمایا گیا تھا۔ اور بعض حضرات نے یہ فرمایا تھا کہ ہمیں دیوبند میں کسی ایک شخص کا ایسا استقبال اور اُس کی آمد پر ایسا جشن جیسا سماں اس سے پہلے یاد نہیں ہے۔ اس کا سبب بظاہر یہی ہے کہ ان حضرات کو مجھ سے جو تعارف ہوا، وہ میری کتابوں اور تحریروں کے ذریعے ہوا، اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ وہاں نہ صرف علماء میں، بلکہ پڑھے لکھے عام مسلمانوں میں بھی کتابوں کے مطالعے کا ذوق بہت زیادہ ہے۔ میری کتابوں میں سے اکثر وہاں کئی کئی اداروں نے شائع کر رکھی ہیں اور وسیع پیمانے پر پڑھی گئی ہیں، خاص طور پر درس ترمذی، تقریر ترمذی، تکملہ فتح الملہم، علوم القرآن، فقہی مقالات، انعام الباری، حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق، اور اسلام اور جدید معیشت وتجارت کو علماء کرام میں بہت پذیرائی ملی ہے، اور ذکر وفکر، حجیت حدیث، آسان نیکیاں اور تقلید کی شرعی حیثیت کو عام مسلمانوں میں۔ اصلاحی خطبات دونوں قسم کے حضرات میں رائج رہے ہیں، اور بہت سے علماء کرام نے بتایا کہ وہ بکثرت جمعہ کے خطاب کی تیاری اُن کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ خواتین میں بھی اُن کے پڑھنے کا بہت رجحان ہے۔ اور شاید اصلاحی خطبات کے بعد سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتابیں میرے سفرنامے ہیں جو ”جہانِ دیدہ“ اور ”دنیا مرے آگے“ کے نام سے شائع ہوئے ہیں، بلکہ حیدرآباد دکن کے ایک صاحب مجاہد علی ایم اے نے میرے سفرناموں پر تبصرہ کر کے حیدرآباد یونیورسٹی سے ایم فل کی ڈگری حاصل کی ہے۔ وہ حیدرآباد سے یہ مقالہ بنگلور لیکر آئے تھے، اور وہ مجھے بھی عنایت فرمایا، اور یہ بھی بتایا کہ کوئی صاحب میری فقہی تالیفات پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اب توضیح القرآن بھی دیوبند، ڈابھیل، دہلی اور کئی مقامات سے شائع ہوگئی ہے۔ حضرت مفتی احمد خان پوری صاحب مدظلہم نے اُس کا ایک سیٹ مجھے تحفۃً بھیجا، اور

معلوم ہوا کہ وہ بھی علماء کرام اور عام مسلمانوں دونوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جارہا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں میں میری انگریزی کتابیں پڑھی گئی ہیں، اور میں نے اس سال کے شروع میں ورلڈ اکنامک فورم ڈیووس کے لیے جو مقالہ لکھا تھا، ان حضرات میں اُس کا بھی خاصا چرچا نظر آیا۔

غرض ان حضرات نے مجھے انہی تحریروں کے ذریعے پہچانا جو درحقیقت زیادہ تر اپنے بزرگوں کی باتوں کا تکرار تھیں، البتہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے انہیں ایک خاص ترتیب سے نسبۃً آسان انداز میں پیش کردیا گیا ہے، ان میں میرے ذاتی کمال کا کوئی دخل نہیں تھا۔ لیکن ان کی وجہ سے وہ میرے بارے میں بے انتہا خوش گمانی میں مبتلا ہوگئے۔ دور کے ڈھول ہمیشہ سہانے ہوتے ہیں، وہ اگر مجھے قریب سے دیکھتے تو شاید اُن پر میرے تمام عیوب نہ سہی، ان میں سے کچھ نہ کچھ ضرور ظاہر ہوجاتے، لیکن انہوں نے دور دور سے کتابیں پڑھکر ایک مبالغہ آمیز رائے قائم فرمالی، اور اس کی بنیاد پر اس والہیت کا مظاہرہ فرمایا۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ''شعب الایمان'' میں امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بڑا کارآمد قول نقل فرمایا ہے جو مجھے اس سفر میں پیش کئے جانے والے سپاس نامے سنتے وقت یاد آتا رہا، اور کئی جگہ میں نے وہ اپنی تقریروں میں بیان بھی کیا۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

> ''إِذَا أَثْنٰى رَجُلٌ عَلٰى رَجُلٍ فِيْ وَجْهِهٖ فَلْيَقُلْ: اَللّٰهُمَّ أَنْتَ أَعْلَمُ بِيْ مِنْ نَفْسِيْ، وَأَنَا أَعْلَمُ بِنَفْسِيْ مِنَ النَّاسِ، اَللّٰهُمَّ لَاتُؤَاخِذْنِيْ بِمَا يَقُوْلُوْنَ، وَاغْفِرْلِيْ مَا لَايَعْلَمُوْنَ.''
>
> یعنی: ''جب کوئی شخص کسی دوسرے کی تعریف اُس کے منہ پر کرے تو اُسے یہ کہنا چاہئے کہ: یا اللہ! آپ کو میری مجھ سے زیادہ خبر ہے، اور مجھے اپنے بارے میں ان لوگوں سے زیادہ معلوم ہے۔ لہٰذا یا

اللہ! جو باتیں یہ کہہ رہے ہیں، اُن پر میری گرفت نہ فرمایئے، اور جن باتوں (یعنی میرے عیوب) کا ان کو پتہ نہیں ہے، ان پر میری مغفرت فرما دیجیے۔"

(شعب الایمان للبیہقی، باب فی حفظ اللسان ص۲۲۷ ج۴)

تحریر و تقریر کے ذریعے خدمت کرنے والوں کے لیے لوگوں کی تعریفیں ایک فتنے سے کم نہیں۔ اسی لئے منہ پر تعریفوں کے پُل باندھنے سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ اس سے انسان میں خود پسندی کی بیماری پیدا ہوتی ہے۔ حضرت امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بیماری کے علاج کے لیے یہ بہترین دعا تلقین فرمائی ہے۔ میرے شیخ حضرت عارفی قدس سرہ بھی اس سے ملتی جلتی بات فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی تمہاری تعریف کرے تو دل میں یہ کہا کرو کہ: "یا اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے اس شخص کے سامنے میری اچھائی ظاہر فرمائی، ورنہ اگر میرے عیوب اس پر ظاہر ہوتے تو شاید یہ مجھ سے نفرت کرتا۔" نیز وہ فرمایا کرتے تھے کہ حب جاہ یا تعریف پسندی ایک ایسی خواہش ہے جس کی تسکین اول تو اپنے اختیار میں نہیں ہے، کیونکہ یہ دوسروں کے عمل پر موقوف ہے، اور اگر وہ پوری بھی ہو جائے تو تعریف ایسی ناپائیدار چیز ہے جو منہ سے نکل کر ہوا میں اُڑ جاتی ہے۔ آدمی کو یہ سوچنا چاہئے کہ اس سے فائدہ کیا حاصل ہوا؟

سرد ہو جاتی ہے حبِّ جاہ دنیا جس کے بعد
اک ذرا سی بات ہے اے دل! کہ پھر کیا اس کے بعد؟

باقی رہنے اور فائدہ پہنچانے والی چیز تو نیک اعمال ہیں جو کسی کی تعریف اور مذمت سے بے نیاز ہو کر خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کئے جائیں:

وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا۔ (سورۃ مریم:۷۶)

اور جو نیک عمل باقی رہنے والے ہیں، ان کا بدلہ بھی اللہ کے یہاں بہتر ہے، اور ان

کا انجام بھی بہتر۔

اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات کی فکر عطا فرمائیں کہ ان سدا باقی رہنے والے اعمال کی توفیق عطا ہو۔ آمین۔

ہندوستان کے اس سفر میں دوسرا تاثر یہ ملا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے مسلمانوں کے معاشی حالات پہلے سے کافی بہتر ہوئے ہیں۔ انہوں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ انہیں اسی ملک میں اپنا وجود ثابت کر کے رہنا ہے، چنانچہ وہ اس کے لیے جہد مسلسل میں لگے ہوئے ہیں۔ ہندوستان نے پچھلے عشرے میں معاشی اور تمدنی اعتبار سے بڑی تیز رفتار ترقی کی ہے۔ بڑے پیمانے کی صنعتوں، خاص طور پر انفارمیشن ٹیکنالوجی اور طب کے میدان میں اُس نے بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں، مواصلات کا نظام بہت بہتر ہوا ہے، شاندار سڑکوں اور پلوں نے شہروں کے درمیان رابطے آسان بنا دیئے ہیں۔ اور ان ترقیات میں مسلمانوں کا بھی اہم کردار ہے، اور وہ بھی فی الجملہ اُس میں حصہ دار بنے ہیں۔ نیز جنوبی ہند کے جن مقامات پر میرا جانا ہوا، وہاں مسلمانوں کے دینی حالات بھی بہت بہتر نظر آئے۔ ایک طرف دینی درسگاہوں میں نہ صرف معیاری دینی تعلیم ہو رہی ہے، بلکہ اُس میں حالات کے مطابق تنوع بھی پیدا ہوا ہے۔ یہ ادارے پوری خوداعتمادی کے ساتھ مثبت کام بھی کر رہے ہیں، اور نت نئے فتنوں کا ڈٹ کر مقابلہ بھی کر رہے ہیں۔ اور دوسری طرف عام مسلمانوں کا ان اداروں کے ساتھ ربط اور تعاون بھی قابل تعریف ہے۔ البتہ بعض علماء کرام نے بتایا کہ شمالی ہند کے حالات جنوبی ہند سے مختلف ہیں، اور وہاں غیر مسلموں کے ساتھ اختلاط کے نتیجے میں عام مسلمانوں میں بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہو رہی ہیں، جن کے انسداد کے لیے بڑی محنت کی ضرورت ہے، اور علماء کرام اور دینی حلقے اپنی استطاعت کی حد تک اُس کے سدباب کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

یہ بات بھی واضح طور پر نظر آئی کہ علماء کرام میں، یہاں تک کہ نوجوان علماء میں بھی علمی اور تحقیقی ذوق پروان چڑھ رہا ہے۔ نئی نئی کتابیں منظر عام پر آ رہی ہیں، علماء میں تصنیف

وتالیف کی طرف رغبت بڑھ رہی ہے، اور اس سفر کے دوران بہت سے علماء اور اہل قلم نے اپنی جو کتابیں مجھے ہدیۃً عنایت فرمائیں، انہیں اگر جمع کیا جائے تو یقیناً کئی الماریاں بھر سکتی ہیں۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ میں ان میں سے اپنی ضرورت کی کتابیں منتخب کر کے انہیں کارگو کے ذریعے کراچی بھجواؤں، اور باقی کتابوں سے سرسری استفادہ کر کے انہیں وہیں پر تقسیم کردوں۔ غرض یہاں مسلمانوں کی مجموعی حالت مجھے پہلے سے بہت بہتر نظر آئی جو بہت امیدافزا بات ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں نظر بد سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ **وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین.**

اُردن کا سفر

شوال ۱۴۳۱ھ

ستمبر 2010ء

اُردن کا سفر

شوال ۱۴۳۱ھ / ستمبر 2010ء

بسم اللہ لرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین، والصلوٰۃ السلام علی رسولہ الکریم،

وعلی آلہ وأصحابہ أجمعین

میں اردن کے دو سفروں کی روداد اپنے سفرنامے ''اُحد سے قاسیون تک'' میں لکھ چکا ہوں، جو ''جہانِ دیدہ'' میں شائع ہوا ہے۔ اس کے بعد بھی بار بار وہاں جانا ہوتا رہا ہے۔ لیکن شوال ۱۴۳۱ھ میں میرا اردن کا جو سفر ہوا اس میں دو معلومات نئی حاصل ہوئیں۔ وہ اس مضمون کے ذریعے مختصراً قارئین کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔

حکومت اردن کی سرپرستی میں ایک ادارہ ''مؤسسة آل البيت للفكر الإسلامي'' کے نام سے قائم ہے، جس کے سربراہ شہزادہ غازی بن محمد (ملک عبداللہ شاہ اردن کے عم زاد اور مشیر خاص) بڑے علمی ذوق کے حامل ہیں۔ اور میری عربی اور انگریزی تالیفات کے واسطے سے مجھ سے غائبانہ متعارف ہی نہیں ہیں، بلکہ بڑی محبت بھی رکھتے ہیں اور ان سے خط و کتابت کا رشتہ بھی قائم ہے۔ وہ کئی سال سے مجھے اس ادارے کے مختلف اجتماعات میں دعوت دیتے رہے ہیں۔ لیکن میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے ان اجتماعات میں شرکت سے قاصر رہا۔ اس مرتبہ انہوں نے شوال میں اس ادارے کے زیر اہتمام ''ماحولیات اور اسلام'' کے موضوع پر ایک عالمی کانفرنس طے کی تھی۔ اتفاق سے یہ دن ایسے تھے کہ میرے لئے جانا آسان بھی تھا، میں ماحولیات کے مسائل کے بارے میں فنی معلومات بھی حاصل کرنا چاہتا

تھا اور مجھے اپنی بعض عربی تالیفات کی طباعت کے سلسلے میں کچھ ضروری کام بھی تھے، اس لئے میں نے شرکت کا ارادہ کرلیا اور ہفتہ ۱۵ شوال کی دوپہر کو عمان پہنچ گیا۔

وہ درخت

شام پانچ بجے شہزادہ غازی مجھ سے ملاقات کیلئے ہوٹل آئے اور مختلف موضوعات پر گفتگو کے دوران انہوں نے بتایا کہ اردن میں وہ جگہ دریافت ہوئی ہے جہاں حضور نبی کریم ﷺ اپنی نوعمری کے زمانے میں چچا ابوطالب کے ساتھ تشریف لائے تھے، اور وہاں بحیرا راہب سے آپ ﷺ کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہاں وہ درخت ابھی تک موجود ہے جس کے سائے میں آپ ﷺ نے قیام فرمایا تھا، اور اگر آپ میرے ساتھ وہاں جانا چاہیں تو میں آپ کو وہاں لے جاؤں۔ میرے لئے یہ بڑی سعادت کی بات تھی۔ میں نے بڑے اشتیاق کے ساتھ یہ دعوت قبول کرلی۔ چنانچہ کانفرنس ختم ہوتے ہی شہزادہ غازی ہمیں ایک فوجی ایئرپورٹ لے گئے۔ وہاں ایک بڑا ہیلی کاپٹر تیار تھا جس میں تقریباً دس آدمیوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ شہزادے کے ساتھ ان کے گھر کے کچھ بچے بھی تھے اور میرے علاوہ شیخ الأزہر احمد الطیب، مصر کے مفتی علی جمعہ اور شہزادے کے ذاتی محافظین بھی ہیلی کاپٹر میں سوار ہوئے۔ ہیلی کاپٹر عمان سے شمال مشرق کی طرف سفر کرتا ہوا تقریباً پچاس منٹ میں منزل مقصود تک پہنچا۔ یہ پورا راستہ لق و دق صحرا پر مشتمل تھا، جس میں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے خشک ٹیلے اور زمین سے چپکی ہوئی چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں ضرور دکھائی دے جاتی تھیں، اور وہ بھی گرمی سے جھلسی ہوئی! پچاس منٹ کے سفر کے بعد ہیلی کاپٹر اِسی صحرا میں اُترا تو اُفق سے اُفق تک پھیلے ہوئے ریگستان کے عین درمیان ایک ہرا بھرا درخت نظر آیا جو اس لق و دق صحرا میں بالکل نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔ یہی وہ درخت تھا جس کے بارے میں یہ اندازہ کیا جارہا ہے کہ اسی کے سائے میں آنحضرت ﷺ تشریف فرما ہوئے تھے۔

پہلے اس واقعے کا خلاصہ عرض کردینا مناسب ہے، جو حدیث اور سیرت کی مختلف کتابوں میں مختلف طریقے سے بیان ہوا ہے۔ جامع ترمذی میں مضبوط سند کے ساتھ

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور سرورِ دو عالم ﷺ کی نبوت سے پہلے آپ ﷺ کے چچا ابو طالب قریش کے کچھ اور بزرگوں کے ساتھ شام کے سفر پر روانہ ہوئے، اور حضور سرور دو عالم ﷺ بھی آپ کے ساتھ تھے (محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے خود ہی ان کے ساتھ جانے کی خواہش ظاہر فرمائی تھی اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے السیر ۃ النبوۃ ج:۱،ص ۱۴۰ میں اس وقت آپ کی عمر بارہ سال بتائی ہے)۔ جب شام کے علاقے میں پہنچے تو وہاں ایک عیسائی راہب (کی خانقاہ) کے پاس انہوں نے پڑاؤ ڈالا۔ (محمد بن اسحاق وغیرہ کی روایت میں اس راہب کا نام بحیرا بیان کیا گیا ہے)۔

اس بات پر تمام روایات متفق ہیں کہ قریش کے لوگ اپنے شام کے سفروں میں پہلے بھی اس راہب کے پاس سے گذرا کرتے تھے، لیکن وہ پہلے کبھی نہ تو اپنی خانقاہ سے نکلتا تھا اور نہ کبھی ان کی طرف کوئی توجہ دیتا تھا۔ لیکن اس مرتبہ جب انہوں نے پڑاؤ ڈالا تو یہ راہب آ کر ان کے درمیان گھس گیا، اور حضور نبی کریم ﷺ کا دست مبارک پکڑ کر کہنے لگا کہ ”یہ سارے جہانوں کے سردار ہیں، یہ رب العالمین کے پیغمبر ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے گا۔“ قریش کے لوگوں نے پوچھا کہ تمہیں کیا پتہ؟ راہب نے کہا کہ جب تم لوگ سامنے کی گھاٹی کے سامنے آئے تو ہر درخت اور ہر پتھر نے ان کو سجدہ کیا، اور درخت اور پتھر نبی کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے اور میں انہیں مہرِ نبوت کے ذریعے پہچان رہا ہوں، جو اِن کے مونڈھے کی ہڈی سے نیچے سیب کی طرح موجود ہے۔ پھر اس نے قافلے والوں کیلئے کھانا تیار کیا۔ ترمذی کی روایت میں ہے کہ وہ کھانا وہیں درخت کے پاس لے کر آیا، اس وقت حضور سرور دو عالم ﷺ اونٹوں کو چرانے گئے ہوئے تھے۔ جب واپس تشریف لائے تو قافلے کے دوسرے لوگ درخت کے سائے میں بیٹھ چکے تھے، اور اب سائے میں بیٹھنے کی کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی، لیکن جب حضور سرور دو عالم ﷺ تشریف لائے تو درختوں کی شاخوں نے جھک کر آپ پر سایہ کر دیا۔ اس پر راہب نے لوگوں کو متوجہ کر کے کہا کہ دیکھو

درخت ان پر جھک کر سایہ کر رہا ہے۔ اس کے بعد اس نے پوچھا کہ ان کے سرپرست کون ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ ابوطالب ہیں۔ راہب نے ابوطالب سے پرزور مطالبہ کیا کہ آپ انہیں آگے لے کر نہ لے جائیں۔ کیونکہ روم کے لوگ انہیں پہچان لیں گے تو انہیں قتل کر دیں گے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کو حضرت بلالؓ کے ساتھ واپس بھیج دیا۔

(جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب بدء نبوۃ النبی ﷺ۔ حدیث ۳۶۲۰)

ترمذی کی اس روایت کے بارے میں محدثین کا کہنا یہ ہے کہ اس کے رجال ثقہ ہیں۔ البتہ اس روایت کے آخر میں جو یہ مذکور ہے کہ جب راہب نے حضور سرورِ دو عالم ﷺ کو واپس بھیجنے کا مشورہ دیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی اس قافلے میں موجود تھے، انہوں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ انہیں واپس روانہ کر دیا۔ محدثین نے فرمایا کہ یہ بات یقینی طور پر غلط ہے، اس لئے کہ جس وقت کا یہ واقعہ ہے، اس وقت حضرت بلال یا تو پیدا ہی نہ ہوئے ہوں گے یا اتنے چھوٹے ہوں گے کہ ان کے ساتھ آپ ﷺ کو بھیجنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسلام کے بعد خریدا تھا، اور یہ واقعہ حضور اقدس ﷺ کی نبوت سے بہت پہلے کا واقعہ ہے۔ اس بناء پر بعض حضرات نے تو اس روایت کو صحیح ماننے سے ہی انکار کیا ہے۔ لیکن بعض محدثین مثلاً حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ اس کی وجہ سے پوری روایت کو غلط کہنا درست نہیں، کیونکہ اس کی سند مضبوط ہے، البتہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخری حصے میں کسی راوی سے وہم ہو گیا ہے۔ (تحفۃ الأحوذی۔ ج:۱۰۔ ص:۹۳)

صحیح روایتوں میں اس قسم کی جزوی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں جن کا روایت کے مرکزی مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لئے پوری روایت کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ یہی روایت مسند بزار میں آئی ہے جس میں واقعہ اسی طرح بیان کیا گیا ہے جیسے ترمذی میں مذکور ہے، لیکن اس میں یہ جملہ موجود نہیں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ

عنہ کے ساتھ حضورِ اقدس ﷺ کو واپس روانہ کردیا۔

(مسند بزار، مسند ابی موسیٰ الأشعری۔ ج:۱۔ص ۴۶۷۔ حدیث:۳۰۹۶)

محمد بن اسحاق کی متعدد روایتوں میں واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ جب یہ قافلہ بحیرا راہب کی خانقاہ کے قریب پہنچا تو بحیرا نے دیکھا کہ اس میں حضور اقدس ﷺ پر ایک بادل سایہ کئے ہوئے ہے اور درخت کی شاخیں بھی آپ ﷺ پر جھک گئی ہیں۔ یہ دیکھ کر بحیرا کو جستجو پیدا ہوئی، اور اس نے قافلے والوں کو دعوت دی کہ میں نے آپ کے لئے کھانا تیار کیا ہے، اس لئے آپ سب میرے پاس کھانے کیلئے تشریف لائیں۔ سب آگئے، لیکن حضورِ اقدس ﷺ تشریف نہ لائے۔ بحیرا نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا آپ کے تمام ساتھی آگئے ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ سب آگئے ہیں، بس ایک کمسن لڑکا ہے جو اپنے کجاوے میں رہ گیا ہے۔ بحیرا نے اصرار کر کے آپ ﷺ کو بلوایا اور آپ ﷺ سے بہت سوالات کئے، اور آپ ﷺ کے مبارک کندھے پر مہرِ نبوت دیکھی، پھر ابو طالب سے پوچھا کہ اس لڑکے سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟ ابو طالب نے کہا یہ میرے بیٹے ہیں۔ بحیرا راہب نے کہا کہ یہ آپ کے بیٹے نہیں، اور ان کے والد زندہ نہیں ہو سکتے۔ تب ابو طالب نے بتایا کہ یہ میرے بھتیجے ہیں، اور ان کے والدین فوت ہو چکے ہیں۔ اس پر بحیرا نے انہیں مشورہ دیا کہ آپ انہیں واپس لے جائیں اور ان یہودیوں سے ان کی حفاظت کریں۔ چنانچہ ابو طالب خود آپ ﷺ کو واپس لے آئے۔ (سیرۃ ابن ہشام۔ ج:۱۔ص:۱۸۲،۱۸۳)

حافظ ابن عساکر رحمتہ اللہ علیہ نے تاریخِ دمشق میں بھی یہ واقعہ بہت ساری سندوں سے روایت کیا ہے جن میں سے کچھ ترمذیؒ کی روایت کے مطابق ہیں۔ اور کچھ ابن اسحاقؒ کی روایت کے مطابق۔ (تاریخ ابن عساکر۔ ج:۳ص:۴ تا ۱۲)

بہرحال! واقعے کی جزوی تفصیلات میں تو روایتیں مختلف ہیں۔ لیکن اتنی بات پر تمام روایتوں کا اتفاق ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے اس سفر میں بحیرا راہب کی خانقاہ کے قریب ایک درخت کے نیچے قیام فرمایا تھا، اور درخت کی شاخیں آپ ﷺ پر جھک گئی تھیں اور اس

کے علاوہ بھی بحیرا نے آپ ﷺ میں نبوت کی کئی علامتیں دیکھی تھیں جس کی بناء پر اس نے قافلے والوں کو دعوت دی اور حضور اقدس ﷺ کو خاتم الانبیاء کے طور پر پہچان کر ابو طالب کو مشورہ دیا تھا کہ انہیں واپس بھیج دیں۔ واقعہ یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے آخری پیغمبر کے طور پر تشریف لانے کی خبریں تورات اور انجیل میں واضح طور پر دی گئی تھیں، جن میں سے بعض آج بھی متعدد تحریفات کے باوجود بائبل میں موجود ہیں، جن کا مصداق حضور اقدس ﷺ کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکا۔ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''اظہار الحق'' میں ان کا مفصل ذکر فرمایا ہے جس کا اردو میں ترجمہ راقم کی شرح وتحقیق کے ساتھ ''بائبل سے قرآن تک'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ نیز ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پیشین گوئیوں کے علاوہ حضور اقدس ﷺ کی کچھ علامتیں مختلف پیغمبروں نے زبانی بھی بتا رکھی ہوں گی، جو سینہ بہ سینہ روایتوں کی شکل میں بھی اہل کتاب کے پاس موجود تھیں۔ یہ بات بھی ثابت ہے کہ حضور اقدس ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے اہل کتاب نبی آخر الزماں کی آمد کے انتظار میں تھے، چنانچہ وہ بُت پرستوں سے مقابلے کے وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے کہ انہیں جلدی بھیج دیجئے۔ جیسا کہ قرآن کریم نے سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۹ میں بیان فرمایا ہے۔ ان حالات میں بحیرا نے حضور اقدس ﷺ میں وہ علامات محسوس کر کے یہ یقین کر لیا کہ آپ ہی نبی آخر الزماں ﷺ ہیں، اس لئے یہ مشورہ دیا۔

اب یہ جگہ کونسی تھی جہاں یہ درخت واقع تھا؟ اس کے بارے میں شہزادہ غازی کا کہنا یہ ہے کہ انہیں بادشاہ کی طرف سے یہ کام سونپا گیا تھا کہ وہ اردن میں پائے جانے والی ان تاریخی یادگاروں کی تحقیق کریں جن کا تعلق حضور اقدس ﷺ یا آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ سے ہو۔ چنانچہ انہوں نے اس سلسلے میں ان وثائق کی چھان بین شروع کی جو حکومت کے پاس محفوظ تھے۔ ان وثائق میں جو غالباً خلافت عثمانیہ کے دور سے محفوظ چلے آئے تھے، انہیں اس درخت کا ذکر ملا جس کے نیچے حضور اقدس ﷺ نے قیام فرمایا تھا، اور یہ کہ وہ درخت ابھی تک زندہ ہے۔ وثائق کی رہنمائی سے انہوں نے اس کی تلاش شروع کی تو پتہ لگا کہ کچھ

عرصہ پہلے تیل کی پائپ لائن کا سروے کرتے ہوئے وہ شاہراہ دریافت ہوئی ہے جو کسی بازنطینی بادشاہ نے اس غرض سے بنائی تھی کہ حجاز کے تاجر اس کے ذریعے اطمینان سے شام کا سفر کرسکیں۔ اس دریافت سے انہیں مزید مدد ملی اور انہوں نے اِسی شاہراہ کو بنیاد بنا کر علاقے کا سروے کیا تو انہیں یہ عجیب وغریب درخت دریافت ہوا، جو سینکڑوں مربع کلومیٹر میں پھیلے ہوئے صحراء کے درمیان تنہا درخت تھا جو زندہ اور توانا کھڑا ہوا تھا، اسی درخت سے کچھ فاصلے پر انہیں ایک عمارت کے کھنڈر بھی نظر آئے جس کے بارے میں یہ امکان تھا کہ شاید بحیرا راہب کی خانقاہ ہوگی۔ انہوں نے آس پاس رہنے والے بدوؤں سے تحقیق کی تو انہوں نے بتایا کہ ہمارے خاندانوں میں یہ بات تواتر کی حد تک مشہور ہے کہ اس درخت کے نیچے حضور اقدس ﷺ نے قیام فرمایا تھا۔ ان تمام شواہد کی روشنی میں حکومت اردن نے اس جگہ کی حفاظت کیلئے اس کے گرد احاطہ بنادیا ہے۔ جب یہ درخت پہلی بار شہزادہ غازی کو دریافت ہوا، اس وقت وہ زندہ ضرور تھا، اور اس کی ایک زندہ درخت کی پوری ہیئت بھی برقرار تھی، لیکن شاخیں کچھ سوکھی ہوئی تھی، اس کے بعد اسے پانی دینے کا اہتمام کیا گیا، جس کے بعد وہ بالکل تروتازہ اور سرسبز ہوگیا۔

یہ بات تو وہاں جا کر بالکل واضح طور پر نظر آتی ہے کہ یہ کوئی غیر معمولی درخت ہے۔ اس لئے کہ سینکڑوں مربع کلومیٹر دور تک نہ کسی درخت کا نام ونشان ہے، اور نہ وہاں تک پانی پہنچے کا کوئی راستہ نظر آتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ بات کوئی بعید یا تعجب خیز نہیں ہے کہ اس درخت سے چونکہ حضور اقدس ﷺ کا ایک معجزہ ظاہر ہوا تھا اور اس کی بنا پر بحیرا راہب کو آپ ﷺ میں خاتم الانبیاء کی علامتیں نظر آئیں تھیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے معجزاتی طور پر باقی رکھا ہو، بالخصوص جبکہ اس درخت سے تقریباً سو میٹر کے فاصلے پر ایک عمارت کے کھنڈر بھی موجود ہیں جن کا رخ اسی درخت کی طرف ہے۔

جہاں تک اس کے محل وقوع کا تعلق ہے، سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ بحیرا سے ملاقات کا واقعہ شام کے شہر بصریٰ میں پیش آیا تھا اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے ابن

عساکر سے نقل کیا ہے کہ بحیرا راہب ایک بستی میں رہتا تھا جس کا نام ''کفر'' تھا اور وہ بستی بصریٰ شہر سے چھ میل دور تھی۔ (السیرۃ النبویۃ لابن کثیر۔ ج:۱، ص:۱۴۰)۔ یہاں یہ واضح رہنا بھی مناسب ہے کہ اس زمانے میں ہر بستی کو ''کفر'' (کاف اور فاء دونوں پر زَبر ہے) کہا جاتا تھا اور اس کے امتیاز کیلئے ''کفر'' کے ساتھ کوئی لفظ لگا دیتے تھے، جیسے ''کفر ناعوم''۔ آج بھی شام اور اردن میں بہت سی بستیاں ''کفر'' کے نام سے موسوم ہیں۔

اگر یہ بات درست مانی جائے کہ بحیرا کی بستی بصریٰ سے چھ میل دور تھی تو بظاہر اس کا محل وقوع وہ نہیں ہونا چاہیئے جو اس درخت کا ہے، کیونکہ بصریٰ شہر یہاں سے کافی فاصلے پر شام کی سرحد کے اندر واقع ہے۔ علاقے کے نقشے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ سے قریب ترین بستی ''ازرق'' ہے اور اس کے بعد شام (سیریا) کی سرحد آتی ہے۔ جس کے بعد پہلا شہر بصریٰ ہے۔ بصریٰ یہاں سے کتنا دور ہے؟ اس کی مجھے تحقیق نہیں ہو سکی، لیکن اتنی بات واضح ہے کہ یہ فاصلہ چھ میل سے زیادہ ہے۔ البتہ بصریٰ چونکہ اس وقت بہت بڑا شہر تھا، اس لئے یہ امکان موجود ہے کہ ''بصریٰ'' کا لفظ صرف اس شہر کیلئے نہیں بلکہ اس کے مضافات میں ایک بڑے علاقے کیلئے بولا جاتا ہو، جس میں ازرق اور یہ جگہ بھی شامل ہو۔

تاہم مندرجہ ذیل علامتیں اس دریافت کے حق میں جاتی ہیں۔

(۱) یہ جگہ اُسی شاہراہ کے قریب واقع ہے جو اس زمانے میں تجارتی قافلے حجاز سے شام کیلئے استعمال کرتے تھے۔

(۲) یہ شمال مشرق کی اُسی سمت میں واقع ہے، جو بصریٰ کی سمت ہے۔

(۳) اس کے اور بصریٰ کے درمیان کوئی بڑا شہر حائل نہیں ہے، ازرق ایک چھوٹی بستی ہے۔

(۴) علاقے کے لوگوں میں یہ بات شہرت یا تواتر کی حد تک معروف ہے کہ یہ درخت وہی ہے جس کے نیچے حضور اقدس ﷺ تشریف فرما ہوئے تھے اور ان معاملات میں تسامع بھی مضبوط دلیل سمجھی جاتی ہے۔

(۵) اس بے آب و گیاہ صحراء میں اس درخت کا زندہ رہنا یقیناً ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔

(۶) اسی درخت کے قریب ایک پرانی خانقاہ کے کھنڈر اب تک موجود ہیں۔

(۷) شہزاد غازی کو قدیم وثائق میں اس جگہ کی جو نشاندہی ہوئی، وہ اس دریافت سے مطابقت رکھتی ہے۔

(۸) درخت کی دور تک پھیلی ہوئی جڑیں اس کی قدامت کی واضح علامت ہیں۔

ان وجوہ سے مکمل یقین تو نہیں ہوسکتا، لیکن یہ قوی احتمال ضرور قائم ہوتا ہے کہ یہ وہی درخت ہوگا اور یہ قوی احتمال بھی ایک محبت کرنے والے کی آنکھیں ٹھنڈی کرنے کیلئے کافی ہے۔ چنانچہ ہم نے اس درخت کی زیارت کی سعادت حاصل کی۔ یہ ایک پستے کا درخت ہے، اور شہزادہ غازی نے بتایا کہ اس پر اب بھی پستہ آتا ہے اور میں نے کھایا بھی ہے۔ درخت کی چھاؤں یوں بھی بڑی خوشگوار ہے، لیکن چشم تصور نے یہاں جس محبوب دل نواز (ﷺ) کو جلوہ افروز دیکھا، اس نے اس چھاؤں میں وہ مٹھاس پیدا کر دی تھی جو کسی اور سائے میں حاصل نہیں ہوسکتی۔ **اللّٰھم صلّ علی سیّدنا و مولانا محمد و علی آلہٖ و أصحابہ أجمعین.**

اس درخت اور اس کے ماحول میں کچھ دیر گزاری تو عصر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا، چنانچہ اسی چھاؤں میں بفضلہٖ تعالیٰ نمازِ عصر ادا کرنے کی توفیق ہوئی۔ نماز اور دعا کے بعد ہم دوبارہ ہیلی کاپٹر میں سوار ہو کر عمان واپس آئے۔

دوسری دریافت...... ہرقل کے نام مکتوبِ نبوی ﷺ

شام کی اسلامی فتوحات کے موضوع پر اب تک جو کتابیں میری نظر سے گذری ہیں، ان میں سب سے زیادہ تحقیقی کتاب وہ ہے جو زمانہ حال کے ایک محقق احمد عادل کمال نے "الطریق إلی دمشق" کے نام سے لکھی ہے اور سن ۱۴۰۰ھ میں دار النفائس بیروت سے

پہلی بار شائع ہوئی ہے۔ اس کے مصنف فنونِ حرب کے ماہر ہیں اور اس کے ساتھ انہوں نے تاریخی روایات کی چھان پھٹک میں بھی بہت محنت اُٹھائی ہے، اور ہر جنگ بالخصوص جنگِ یرموک کی جنگی حکمت عملی پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، اور نقشوں کی مدد سے پوری صورتحال کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردن کے اسی سفر میں مجھے غزوۂ یرموک کے میدان میں حاضر ہونے کا موقع ملا جو اربد شہر کے قریب اور جولان کی پہاڑیوں کے سامنے واقع ہے۔ اور اس مرتبہ چونکہ میں وہ کتاب پڑھے ہوئے تھا اس لئے میدانِ جنگ کا نقشہ سمجھنے میں اُس سے بہت مدد ملی۔

اِسی کتاب کے مطالعے کے دوران میں نے (اس کے صفحہ ۱۳۸ پر) دیکھا تھا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ہرقل شاہ روم کو جو خط لکھا تھا وہ اصل خط دریافت ہوگیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک عرب خاتون نے جو کسی شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور لندن میں مقیم تھیں، یہ دعویٰ کیا تھا کہ ہرقل کے نام آنحضرت ﷺ کا مکتوبِ گرامی ان کے پاس محفوظ ہے اور ان کے خاندان میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے اور انہیں اس شرط کے ساتھ وراثت میں ملا ہے کہ کسی مسلمان حاکم کے سوا کوئی اور شخص اس میں کسی قسم کا تصرف نہ کرے۔ ان کا یہ دعویٰ سن کر متحدہ عرب امارات کے مشیر ثقافتی ڈاکٹر عزالدین ابراہیم جو اصلاً مصری ہیں، اس خاتون کے پاس سفر کر کے گئے اور اس خط کی اصلیت کی تحقیق کیلئے متعدد علمی طریقے اختیار کئے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ خط اصلی ہے۔ اس کیلئے انہوں نے مندرجہ ذیل دلائل پیش کئے۔

(۱) خط کی عبارت من وعن وہی ہے جو حدیث اور تاریخ کی معتبر کتابوں میں مذکور ہے۔

(۲) مختلف قسم کے ٹیسٹ کرانے سے معلوم ہوا کہ مکتوب جس چمڑے پر لکھا گیا ہے، اس کی دباغت اس قدیم طریقے پر ہوئی ہے جو پہلی صدی ہجری میں رائج تھا۔ دباغت کا زیادہ مستحکم طریقہ دوسری صدی ہجری میں رائج ہوا تھا، جیسا کہ برطانوی عجائب گھر میں محفوظ

بہت سے وثائق سے ثابت ہوتا ہے۔ اس چمڑے کی دباغت اُس طریقے پر نہیں ہوئی جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلی صدی ہجری کا چمڑا ہے۔

(۳) بنفسجی شعاعیں ڈال کر خط کو دیکھا گیا تو اس کی روشنائی بہت قدیم ثابت ہوئی، نیز یہ ثابت ہوا کہ اس چمڑے پر اس مکتوب کی عبارت کے سوا کوئی اور تحریر نہیں لکھی گئی۔

(۴) روشنائی کا کیمیائی تجزیہ کرنے سے یہ بات ثابت ہوئی کہ وہ بہت گہری روشنائی ہے جو ابھی تک واضح طور پر پڑھی جاسکتی ہے، اور یہ اسی قسم کی روشنائی ہے جو اُس زمانے کی دوسری تحریروں میں استعمال کی جاتی تھی جسکے بہت سے شواہد ابھی تک موجود ہیں۔

یہ تحقیقات ڈاکٹر زید نے کی ہیں جو چمڑے کی تحقیق اور تجزیہ کے مشہور اختصاصی ماہر ہیں۔ اور انہوں نے کہا ہے کہ اس چمڑے کی عمر کم سے کم ایک ہزار سال ضرور ہے (یعنی ایک ہزار سال سے زیادہ ہوسکتی ہے، کم نہیں)۔

اس کتاب میں یہ بات پڑھنے کے بعد مجھے معلوم نہیں تھا کہ اب یہ خط کہاں اور کس کے پاس ہے؟ لیکن اردن کے حالیہ سفر میں کانفرنس کے شرکاء کو اردن کے تاریخی مآثر کے تعارف پر مشتمل ایک کتابچہ دیا گیا جس میں یہ درج تھا کہ حضورِ اقدس ﷺ کا یہ مکتوبِ گرامی اب حکومت اُردن کے پاس ہے اور وہ اُس نے ایک متحف (میوزیم) میں رکھ دیا ہے۔ مجھے اس کی زیارت کا اشتیاق ہوا تو میں نے شہزادہ غازی سے یہ خواہش ظاہر کی، لیکن انہوں نے بتایا کہ وہ مکتوب ہم ابھی تک عام زیارت کیلئے کھول نہیں سکے (کیونکہ اس کی مزید حفاظت کیلئے اس پر کچھ کام ہو رہا ہے) اس لئے اس سفر میں اس کی زیارت نہیں ہوسکی، البتہ یہ محققین کیلئے ایک میدانِ عمل ہے کہ جب وہ سامنے آئے تو اس کے بارے میں اپنی تحقیق کے نتائج سے اُمت کو آگاہ کریں۔

و آخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین